مختلف مضامین

قرآنی سیریز - ۴

علّامہ نصیرالدّین نصیر ہونزائی

کے ٹرانسکرائب لیکچرز

تمہید

استادِ بزرگوار علامہ صاحب قبلہ نے اپنی صد سالہ عمرِ گرانمایہ میں اپنی زبانِ فیض بار اور قلمِ جواہر نگار سے کتابوں کے علاوہ آڈیو لیکچرز کی صورت میں ایک بیش بہا خزانہ عالمِ انسانیت کے لئے عطا کیا ہے۔ اِن لیکچرز کی اہمیت کے حوالے سے آنجناب خود فرماتے ہیں:

''ہمارے کیسٹوں میں جو تقاریر ہیں وہ بنیادی اور اساسی مواد کا کام دیں گے، یعنی اُن سے اسماعیلی مذہب پر ریسرچ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک ہر کیسٹ کا مواد ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بڑی اہم باتیں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ کیسٹوں کے قیمتی مواد کو محفوظ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ہماری پیاری جمعیت کی دولت ہے، یہ ہمارے علمی سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان علمی کاموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، ہماری تحریروں کے ایک ایک پُرزے پر ریسرچ ہوگی، کیونکہ ہماری نگارشات میں امامِ عالیمقامؑ کی نورانیت و روحانیت براہِ راست کارفرما ہے''۔ (غیر مطبوعہ)

استادِ گرامی قبلہ کی اِس روشن ہدایت کے پیشِ نظر اِن گرانمایہ دُرّ و مرجان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا انتہائی اہم اور دقیق کام استاد بحر العلوم صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اِس سلسلے میں خانۂ حکمت کے تمام سینٹرز میں جا کر اس کام کی اہمیت کے حوالے سے آگاہی اور رہنمائی فرمائی ہے اور ناچیز کو اِن لیکچرز کو تحریر میں لانے اور منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے اس سلسلے میں کئی احباب انتہائی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان خزائن کو جماعت اور دنیائے انسانیت تک پہنچانے کے لئے محترم مصطفیٰ مومن صاحب نے اسے (ebook) کی صورت میں پیش کرنے میں ہماری مدد فرمائی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

قرآنی سیریز ۔ ۴

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	لیکچر نمبر	صفحہ نمبر
۱	صراطِ مستقیم (سورۂ فاتحہ)	ق- ۳۱	۱
۲	سورۂ مرسلات کی حکمتیں	ق- ۳۲	۱۶
۳	سورۂ یوسف کی تاویلات	ق- ۳۳	۳۰
۴	سورۂ لقمان سے اہم سوالات (کتاب سوغاتِ دانش ص۱۴۸)	ق- ۳۴ الف	۴۳
۵	سورۂ لقمان سے اہم سوالات (کتاب سوغاتِ دانش ص۱۴۸)	ق- ۳۴ ب	۴۹
۶	خدا کی تین کتابیں قرآن، کائنات اور انفس	ق- ۳۵ الف	۵۷
۷	خدا کی تین کتابیں: قرآن، کائنات اور انفس	ق- ۳۵ ب	۶۶
۸	سورۂ دھر	ق- ۳۶ الف	۷۶
۹	سورۂ دھر	ق- ۳۶ ب	۸۸
۱۰	قرآن میں ولایتِ امامؑ کا ذکر	ق- ۳۷	۹۷
۱۱	قرآن فہمی کی آسانیاں	ق- ۳۸ الف	۱۱۱
۱۲	قرآن فہمی کی آسانیاں	ق- ۳۸ ب	۱۲۰
۱۳	مقالہ: حکمتِ شکر [کتاب: سوغاتِ دانش، ص۱۶۰] قرآن کے مختلف موضوعات کا طریقۂ مطالعہ	ق- ۳۹	۱۲۹
۱۴	سورۂ فرقان	ق- ۴۰	۱۴۰

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: صراطِ مستقیم (سورۂ فاتحہ)

کیسٹ نمبر: Q-31   تاریخ: ۱؍جون؍۱۹۸۴، کراچی

عزیزانِ من! یا علی مدد!

دل کی اِس صفائی کے بعد، ہم آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ہمارا سب سے بڑا مقصد علمی ہے اور علم کی باتوں کے بغیر ہمارا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اِس کے لئے آج میری خواہش ہے، کہ ہم قرآنی مثالوں کے سلسلے میں کچھ باتیں بتائیں، ویسے تو قرآنی مثالیں بہت عظیم بھی ہیں اور بہت وسیع بھی ہیں، اُن کے لئے بہت کچھ وقت درکار ہے، تاہم نمونے کے طور پر کچھ باتیں بتا دینا مقصود ہے، تو آیئے سب سے پہلے قرآن کے آغاز میں جو سورۃ الفاتحہ ہے اُس میں سے ایک عظیم مثال کو لے کر اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں، تو اِس سلسلے میں سب سے پہلے گزارش یہ ہے، کہ مثالیں دو طرح سے ہیں، بعض مثالیں مثالوں کے عنوان سے ہیں یعنی اُن کا ٹائٹل مثال ہے، بعض مثالیں ایسی ہیں کہ وہ مثال کے لفظ سے یاد نہیں کی گئی ہیں، مگر اُن میں معنی کے لحاظ سے مثال پائی جاتی ہے۔

چنانچہ سورۃ الحمد میں جو مثال ہے اور جس سے ہم بحث کرنا چاہتے ہیں وہ اِس دوسری قسم میں شامل ہے یعنی اُس کا ٹائٹل مثال نہیں ہے مگر معنی میں وہ مثال ہے اور وہ یہ ہے جو ارشاد ہوا ہے ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' (۱:۵) خداوندا! ہمیں راہِ راست پر چلایئے، یعنی ہمیں صراطِ مستقیم پر جو دینِ اسلام ہے قدم بہ قدم اور منزل بمنزل آگے سے آگے بڑھا دیجئے حتیٰ کہ ہم منزلِ مقصود کو پہنچیں، اِس آیت کا مفہوم یہ ہے۔ یہاں پر میں آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اِس کے ترجمے میں بڑا فرق پایا جاتا ہے، حضراتِ مترجمین نے اِس کا جیسا ترجمہ کرنا چاہیئے نہیں کیا ہے، تاہم بعض حضرات نے اِس آیۂ کریمہ کا ترجمہ کرتے ہوئے چلایئے کا لفظ استعمال کیا ہے جو صحیح ہے، کیونکہ دکھایئے اور چلایئے میں بڑا فرق یہ پایا جاتا ہے کہ دکھانے سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ کوئی شخص راہِ مستقیم کو دیکھ پائے اور اسی پر ٹھہرا رہے، برعکس اِس کے کہ چلانے کا مقصد راہِ مستقیم پر چلتے چلتے منزلِ مقصود کو پہنچنا ہوتا ہے، یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ اصل بات یوں ہے، کہ یہ آیت مثال کا درجہ کس طرح رکھتی ہے اور کن معنوں میں یہ مثال ہے، تو جواب عرض ہے کہ اِس آیت میں سچے مذہب کی تشبیہہ ایک سیدھی راہ سے دی گئی ہے یعنی مذہب کو ایک دنیوی راستے سے تشبیہہ دے کر سمجھایا گیا ہے، لہٰذا یہ مثال ہے اور مثال اِس لئے

ہے کہ یہ واقعاً کوئی راستہ نہیں ہے، دنیوی طور پر اور مادّی اعتبار سے۔ یہ دین ہے یعنی صراطِ مستقیم مثال ہے اور سچّا مذہب ممثول ہے، اور یہ مثال اتنی وسیع ہے، کہ اِس کے معنی کی لہر پورے قرآن میں دوڑتی ہے اور تمام آیتوں کو متاثر کرتی ہے، جس طرح آپ نے کبھی دیکھا ہوگا کہ کوئی وسیع تالاب ہے، اُس میں آپ ایک پتھر کو پھینکتے ہیں، وہاں سے ایک لہر اُٹھتی ہے اور وہ لہر دوڑتی دوڑتی اور وسیع سے وسیع تر ہوتی ہوئی کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ اِس طرح صراطِ مستقیم کا موضوع یا کہ صراطِ مستقیم کی مثال معنوی اعتبار سے، اِس قدر وسیع ہے کہ قرآن کے سارے موضوعات اِس میں مدغم ہو جاتے ہیں، اِس میں مل جاتے ہیں، کیوں اور کس لئے؟ یہ دو طرح سے ہے، ایک مثبت انداز سے اور دوسرا منفی انداز سے، مثبت کا کیا مطلب؟ یہ کہ راہِ مستقیم اور ہدایت سے متعلق بہت سارے موضوعات آتے ہیں جیسے ہدایت ایک موضوع ہے، ہادی ایک موضوع ہے، نور ایک موضوع ہے، ثابت قدمی ایک موضوع ہے، علیٰ ہذا القیاس، تو یہ سارے موضوعات اسی میں مل جاتے ہیں، یہ ہوا مثبت انداز، اور دوسری طرف سے منفی انداز، گمراہی کا جو قرآن میں تذکرہ ہے وہ بھی اسی کے تحت آتا ہے، غوایت ہے اور باطل ہے، غلط راستے پر چلنا ہے، اور کفر ہے، تاریکی ہے، اِس قسم کے سارے موضوعات منفی انداز سے صراطِ مستقیم کے موضوع کے تحت آجاتے ہیں۔

کیونکہ امّ الکتاب یعنی سورۂ فاتحہ میں جو بھی الفاظ آئے ہیں وہ انتہائی جامع قسم کے ہیں، یعنی اُن میں انتہائی جامعیت پائی جاتی ہے، چنانچہ صراطِ مستقیم بھی انہی الفاظ میں سے ہے۔ اِس مثال کی جامعیت کی دوسری وجہ، جو سب سے بڑی وجہ ہے، یہ ہے کہ صراطِ مستقیم چونکہ مثال ہے اور اِس کا ممثول امام ہے، اور جو موضوع امام سے متعلق ہو اُس کا بڑا جامع ہونا لازمی بات ہے۔ اب میں آپ کو اِس کی دلیل پیش کروں گا کہ صراطِ مستقیم کس معنیٰ میں امام ہے، تو آپ جب کسی مستند عربی کی لغات کو اُٹھا کے دیکھیں گے یا قرآن سے متعلق جو بڑی بڑی لغات ہیں اُن میں سے کسی کو اُٹھا کے دیکھیں گے تو آپ کو لفظِ امام کے کئی معنیٰ ملیں گے۔ اُن میں سے ایک معنیٰ رستے کے ہوں گے یعنی امام کے جتنے معنیٰ ہیں اُن میں سے ایک معنیٰ رستے کے ہیں، امام کے معنیٰ راستہ، اور یہ لفظ اِس معنیٰ میں قرآن ہی کے اندر مستعمل ہے۔ ہم نے اپنی تحریروں میں اِس کا ذکر کیا ہے، ''وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ'' (۷۹:۱۵) اِس مقام پر لفظِ امام راستے کے لئے آیا ہے، تو ہمیں خوشی سے اِس معنیٰ کو قبول کرنا ہوگا کہ امام کے مختلف معنوں میں سے ایک معنیٰ راستے کے لئے ہے، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے، کونسا راستہ؟ کیا دنیا کا کوئی راستہ؟ نہیں! پھر کونسا راستہ؟ دین کا راستہ، صراطِ مستقیم اور امام ہی صراطِ مستقیم ہیں، تو اِس مثال کا ممثول امام ہے، لیکن اسماعیلی حکمت میں یہ کوئی نئی بات ہے نہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہئے، یہ کوئی نئی بات ہے نہیں۔ آپ بزرگانِ دین کی کتابوں کو اُٹھا کے دیکھیں جو عربی میں ہیں، فارسی میں ہیں، انہوں نے بڑے روشن دلائل سے اِس حقیقت کا ثبوت پیش کیا ہے کہ صراطِ مستقیم سے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ مراد ہیں اور پھر آپ کے بعد آپؐ کے برحق

جانشین مولانا علی صلوات اللہ علیہ ہیں، اسی طرح یکے بعد دیگرے تمام ائمہ حضرات صراطِ مستقیم ہیں۔

یہ ایک ہی بات ہے کہ بعض دفعہ خدا نے سلسلۂ ہدایت کو یعنی سلسلۂ امامت کو صراطِ مستقیم کہا اور پھر اسی حقیقت کو خدا کی رسّی کا نام دیا، سیدھی راہ ہو یا کہ خدا کی رسّی دونوں کا ایک ہی مقصد ہے، سیدھی راہ یعنی صراطِ مستقیم لوگوں کو خدا تک پہنچانے کے لئے ہے اور خدا کی رسّی بھی اسی مقصد کے لئے ہے کہ جو لوگ خدا کی رسّی میں ہاتھ لگائیں، پکڑیں تو خدا کی رسّی کا یہ کام ہے کہ اُن مومنین کو خدا تک پہنچائے، لہٰذا اسی حقیقت کی تشبیہ کبھی تو سیدھی راہ سے دی گئی ہے اور کبھی خدا کی رسّی سے دی گئی ہے، تو ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' میں لوگ لاشعوری طور پر یہ دعا مانگ رہے ہیں کہ بارِ الٰہی تو از راہِ عنایت ہم کو راہِ راست پر چلا یعنی امامؑ کی معرفت ہمیں عطا فرما، کہ ہم امام سے وابستہ ہو کر تجھ تک پہنچیں کہ منزلِ مقصود تُو ہے۔ یہ تمام لوگوں کی لاشعوری دعا ہے لیکن آپ جانتے ہیں، کہ کوئی شخص لاشعوری طور پر کچھ کہتا ہے اُس کی اہمیت اتنی نہیں ہے جتنی کہ شعوری طور پر کچھ کہتا ہے، اگر لاشعوری طور پر دعا مانگنے کی بڑی اہمیت ہوتی تو اُس صورت میں معرفت باطل قرار پاتی، پھر معرفت نہیں ہوتی، شناخت کی ضرورت نہیں ہوتی، پہچان نہیں ہوتی۔ اسلام میں سب سے بڑی چیز معرفت ہے، شناخت ہے کیونکہ آپ قرآن میں دیکھتے ہیں کہ آسمان، زمین کی ہر چیز سجدہ کرتی ہے، اور اگر لاشعوری طور پر سجدہ کرنے میں نجات ہوتی، تو سب کو نجات ملنی چاہیئے۔ آپ جب اِس موضوع کو دیکھیں گے یعنی قرآن میں اِس بات کی تحقیق کریں گے کہ سجدہ کون کون سی چیز کرتی ہے، تو قرآن آپ کو بتائے گا کہ ہر چیز خدا کے لئے سجدہ کرتی ہے، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے مخلوقات میں سے، ہر چیز یعنی ہر مخلوق، خواہ جمادات ہیں، نباتات ہیں، حیوانات ہیں، انسان ہیں، کافر ہیں، مومن ہیں سب سجدہ کرتے ہیں، کیونکہ قرآن ہی نے یہ بھی بتا دیا، یہ بھی اعلان کیا کہ کچھ کو نجات ملے گی اور کچھ اِس کے برعکس گرفتار ہو جائیں گے، اِس کا کیا جواب ہونا چاہیئے؟ اِس کا جواب ہے معرفت۔

دیکھیں! ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ پتھر جو تسبیح کرتا ہے یا پتھر جن معنوں میں سجدہ کرتا ہے وہ ایسا سجدہ نہیں ہے جو ایک انسان کرتا ہے، درخت جس معنیٰ میں سجدہ کرتا ہے، وہ ایسا نہیں ہے جس طرح پتھر سجدہ کرتا ہے یا ایک جانور سجدہ کرتا ہے یا ایک انسان سجدہ کرتا ہے، اِس سجدے کے اور اِس تسبیح کے اور اِس نماز کے جس میں کائنات کی ہر چیز شریک ہے، مختلف درجات ہیں، تو آیئے لوگوں کے سجدے کی بات کیجئے۔ قرآن نے کہا کہ ایک طرح سے کافر بھی سجدہ کرتا ہے، لیکن اِس سجدے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کافر شرعی نماز کے طور پر سجدہ کرتا ہے، وہ اطاعت کے معنیٰ میں ہے، کہ وہ ایک پہلو سے خدا کے کام میں لگا ہوا ہے، ایک پہلو سے، ہر پہلو سے نہیں! ہر اعتبار سے نہیں! ایک اعتبار سے، ایک لحاظ سے، کسی بھی معنیٰ میں وہ خدا کی بادشاہی کا کوئی نہ کوئی کام انجام دے رہا ہے لیکن اِس میں خدا کی خوشنودی نہیں ہے، خدا کی خوشنودی سب سے بڑی چیز ہے وہ الگ ہے، خدا کی خوشنودی اسلام میں ہے، دین حق میں ہے، اُس کی فرمانبرداری

میں ہے، اُس کی شناخت میں ہے، تو اسی طرح معلوم ہوا کہ سجدہ اور سجدہ میں بڑا فرق پایا جاتا ہے، جو معرفت کا سجدہ ہے وہ بے معرفت کے سجدے سے الگ ہے، اِس طرح تسبیح ہے اور اسی طرح نماز ہر چیز۔

چنانچہ لاشعوری طور پر یہ تو کہا جاتا ہے کہ "اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ" اور خدا اِس سے پاک ہے کہ ایک ایسی چیز کے کر دینے میں تاخیر کرے جو لوگوں کی ضرورت کی ہے، تو لوگوں کی دعا سے پیشتر ہی خدا نے صراطِ مستقیم لوگوں کے سامنے رکھا ہے۔ صراطِ مستقیم اور اُس پر ہدایت کرنے والا یعنی رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین دنیا میں حیّ وحاضر ہیں، تو لوگ صراطِ مستقیم کو جو زندہ ہے دیکھتے ہیں لیکن قبول نہیں کرتے ہیں، اور ہر دعا پر بارگاہِ عزّت سے یہ جواب آتا رہتا ہے کہ تم جس چیز کی دعا کرتے ہو وہ چیز تمہارے سامنے ہے اِس کو قبول کرو، لوگ اِس کو قبول نہیں کرتے ہیں، پھر دعا کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ یہ ہوتا رہتا ہے۔ دوسری بات اِس سلسلے میں جو کہنی چاہیے یہ ہے کہ دنیا میں کوئی راستہ ہوتا ہے وہ الگ ہوتا ہے، راستے کے لئے روشنی درکار ہوتی ہے وہ الگ ہوتی ہے، راستے پر کوئی چلانے والا ہوتا ہے وہ الگ ہوتا ہے اور راستے پر چلنے سے متعلق جتنے ذرائع ہیں وہ جدا جدا ہوتے ہیں، اِس کے برعکس عالم رُوحانیت میں جو وحدت کا عالم ہے، (unity) کا عالم ہے اُس میں بہت ساری چیزیں یکجا ہو جاتی ہیں، بہت ساری چیزیں ایک ہوتی ہیں یعنی ہادی بھی، ہدایت بھی اور صراطِ مستقیم بھی اور روشنی بھی ایک ہی چیز ہوتی ہے جو امام ہے، وہی ہادی ہے، وہی زندہ ہدایت ہے، وہی راہِ مستقیم ہے، وہی نور ہے، وہی منزل ہے، وہی ابتداء ہے اور وہی انتہا، یہ رُوحانیت کا اصول ہے۔ اِس مادّی دنیا کے برعکس کہ اِس کے ذرائع اور سامان منتشر ہوتے ہیں، جدا جدا ہوتے ہیں لہٰذا "اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ" میں ہدایت کے لئے دعا ہے اور راہِ راست کے لئے دعا ہے، ہادی کی شناخت کے لئے دعا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دعا ہے۔

اِس سلسلے کی ایک اہم بات بتانا چاہتا ہوں یہ کہ دنیا میں بہت سے علماء گزرے ہیں اور اب بہت سے علماء موجود ہیں لیکن انہوں نے نہ تو ہدایت کے مطلب کو سمجھا، نہ اِس کے مفہوم کو، نہ اِس کے مقصد کو، نہ اِس کے ترجمے کو، کیونکہ ہدایت ہادی کا فعل ہے، یہ فعل کبھی خدا سے منسوب ہوتا ہے، کبھی رسول سے منسوب ہوتا ہے اور کبھی امام سے۔ کیونکہ قرآن میں آپ دیکھیں گے، تو ہدایت کے موضوع میں بعض دفعہ ہدایت خدا سے منسوب ہوتی ہے، جیسے "یَهۡدِی اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ" (۳۵:۲۴) خدا اپنے نور تک جس کو چاہے پہنچا دیتا ہے، اِس میں خدا کی ہدایت کا ذکر ہے۔ پھر اسی طرح سراجِ منیر کے لفظ میں رسولؐ کی ہدایت کا ذکر ہے، اور اسی طرح "اِنَّمَآ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّ لِکُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ" (۱۳:۷) اِس میں امام کی ہدایت کا ذکر ہے، تو ہم کیسے سمجھیں کہ یہ ہدایت خدا کی ہے یا پیغمبر کی ہے یا امام کی، تو اِس میں دو باتیں ہیں۔ جب ہم اِن درجات کو مانتے ہیں بحکم آیۂ اطاعت "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ" (۴:۵۹) اِس بنیادی اُصول کے مطابق ہم خدا کے مرتبے کو مانتے ہیں، رسول کے درجے کو

مانتے ہیں اور امام کے درجے کو جب مانتے ہیں، تو اُس صورت میں ہمیں ہدایت کے بارے میں یہ عرض کرنا ہوگا کہ خدا کی سب سے بڑی ہدایت، تفصیلی ہدایت یہ ہے کہ اُس نے رسول بھیجا اور کتاب بھیجی۔ رسولؐ کی ہدایت یہ ہے، کہ آپؐ نے اپنے وقت میں لوگوں کی رہنمائی کی اور مستقبل کے لئے آپ نے آسمانی کتاب کو اور امام کو اپنا وارث قرار دیا، یہ رسولؐ کی ہدایت ہے، اور امام کی ہدایت یہ ہے کہ وہ تفصیلی ہدایت کرتے ہیں، ہر زمانے میں لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے جو لوگ اُس کے مقدّس دامن کو پکڑتے ہیں ان کی براہِ راست ہدایت کرتے ہیں اور دوسرے جہاں والوں کی بھی ایک طرح سے ہدایت کرتے ہیں مختلف درجات میں، کیونکہ قانونِ قرآن کے مطابق خدا پر اُن لوگوں کی ہدایت کی ذمّہ داری آتی ہے جو اُس کے رسول کو مانتے ہیں اور صاحبِ امر کو مانتے ہیں تو وہاں پر اِس شرط کے ساتھ خدا کی ہدایت پوری ہو جاتی ہے اور جو لوگ رسول کو نہیں مانتے ہیں اور رسول کے جانشین کو نہیں مانتے ہیں، تو اُن کی جو ضروری ہدایت ہے یا جو سب سے اعلیٰ ہدایت ہے اُس کی ذمّہ داری اللہ پر عائد نہیں ہوتی ہے۔

ہدایت کی دوسری تشریح یوں ہے کہ امام جو کچھ ہدایت کرتے ہیں وہ رسول کو پہنچتی ہے کیونکہ رسول کی طرف سے ہدایت کر رہے ہیں اور رسول جو کچھ ہدایت کرتے ہیں وہ خدا کو پہنچتی ہے، اِس معنیٰ میں قرآنِ مقدّس میں جہاں کہیں اللہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ہدایت کرتا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ رسول کے توسّط سے اور امام کے توسّط سے مکمل ہدایت کرتا ہے، کیونکہ خدا بادشاہ ہے، جب کوئی بادشاہ کسی کام سے متعلق اعلان فرماتا ہے کہ میں فلان کام کرتا ہوں، اُس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ کام ذاتی طور پر کرتا ہے بلکہ وہ کام اُس کے نظام کے تحت ہوتا رہتا ہے اور اُس کو حق پہنچتا ہے کہ اُس کی بادشاہی میں جتنے بھی اچھے اچھے کام ہوتے ہیں اُن کو اپنی ذات سے منسوب کرے کیونکہ وہ بادشاہ ہے۔ لہٰذا خدا کی خدائی میں جتنے کام فرشتوں سے انجام پاتے ہیں اور جو انبیاءؑ سے کام انجام پاتے ہیں، اور جو کام ائمہ حضرات انجام دیتے ہیں اِن سب کو خدا کا فعل قرار دیا جاتا ہے، یہی قانون ہے۔ پھر اِس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی خدا کے کسی فعل کا ذکر آتا ہے تو اُس میں یہ دیکھنا ہوگا کہ اُس فعل کی وضاحت کیا ہے، تشریح کیا ہے، مثلاً جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل جو کچھ کام کرتے ہیں وہ اللہ سے منسوب ہو جاتا ہے، وہ اللہ کا فعل قرار پاتا ہے، حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ وحی لانے والا فرشتہ جبرائیل ہے لیکن آپ قرآن میں دیکھیں گے کہ خدا کہتا ہے کہ میں نازل کرتا ہوں، اِس میں جبرائیل کے فعل کو خدا اپناتا ہے اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ نفوس کو عزرائیل قبض کرتا ہے، جان کو عزرائیل قبض کرتا ہے لیکن خدا کہتا ہے کہ میں ہی زندہ کر دینے والا ہوں اور میں ہی مار دینے والا ہوں، اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا ذاتی طور پر یہ کام انجام دیتا ہے بلکہ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حشم ہیں، اُس کے خدم ہیں یعنی اُس کے نیچے، اُس کے حکم کے تحت کام کرنے والے ہیں اور یہ فلسفہ جاننا بہت ضروری ہے۔

چنانچہ ہدایت، تفصیلی ہدایت امام ہی کرتے ہیں، امام کرتے ہیں تو رسول کرتے ہیں، رسول کرتے ہیں تو خدا کرتا ہے اور اسی لئے آیۂ اطاعت میں جو تین قسم کی اطاعتیں ایک ہو جاتی ہیں، اُس میں کوئی فرق نہیں ہے، "یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" کیا خدا ورسول اور امام ایک دوسرے کے برعکس اور ایک دوسرے کے خلاف حکم صادر فرماتے ہیں؟ یا کہ ایک ہی حکم ہے جو مختلف درجات میں ہے۔ ایک ہی حکم ہے اس لئے امام کی اطاعت رسول کی اطاعت قرار پاتی ہے، اور رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت قرار پاتی ہے، ہمیں اِس طرح سے بات کرنی ہے، قرآن کو اِس طرح سے پیش کرنا ہے اور دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہے، تو ہدایت کا آخری درجہ امام ہیں اور خدا نے ہدایت یہ کی کہ اُس نے انبیاءؑ بھیجے، انبیاءؑ نے یہ ہدایت کی کہ انہوں نے اپنے جانشین مقرّر کیے اور ان میں سے خاتم الانبیاءؑ نے جس پر نبوّت ختم ہوئی تھی، تو آپ کی ذات پر نبوّت ختم ہوئی تھی لہٰذا ہمیشہ کے لئے اماموں کو اپنا جانشین قرار دیا اور امام ہی ہدایت کرتے ہیں، امام ہی صراطِ مستقیم ہیں اور امام ہی زندہ ہدایت ہیں اور امام ہی اُس راہِ راست پر روشنی ڈالنے والے نور ہیں، یہ قرآن کی پہلی مثال ہے جو سورۃ الفاتحہ میں موجود ہے۔

ایک اور مثال حقیقت کی، دین کی، تجارت سے دی گئی ہے اور یہ مثال قرآن کے کئی مقامات پر پائی جاتی ہے اور اِس سلسلے کی ایک خاص آیت یہ ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ" (۹:۱۱۱)، بے شک خداوندِ عالم نے مومنین سے اُن کے اموال کو اور اُن کی جانوں کو خرید لیا ہے اِس کے بدلے میں اُن کو جنّت دے دے گا۔ اِس میں دین کے سارے مطالب سمو جاتے ہیں "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ" بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین سے اُن کی جانوں کو خرید لیا اور اُن کے مالوں کو خرید لیا۔ جان و مال کے بعد اور کوئی چیز مومن کے پاس نہیں رہتی ہے، جان سے اُس کی جان، اُس کے عزیزوں کی جانیں، رُوح یہ سب کچھ آ گیا اور مال کے لفظ میں ساری جائیداد اور اُس کی کمائی اور کچھ بھی ہو اور اسی کے ساتھ مومن کی ساری حیثیت سے بات ہو گئی۔ اللہ [نے] مومن سے اُس کی جان کو خرید لیا، اِس کی وضاحت کیا ہے؟ یہ ہے کہ جب بھی چاہے گا وہ موت دے دے گا، چونکہ یہ جان اُس کی خریدی ہوئی ہے، اور ہمارے پاس امانت ہے یہ ہے کہ اولاد میں سے بھی جو قبل از وقت لیں یا بعد میں لیں یا نہ دیں یہ اُس کی مرضی ہے چونکہ سودا ہو چکا ہے، یہ ہے کہ بیماری آئے گی اور جان پر تکلیف آئے گی، تو اُس کی خریدی ہوئی جان پر تکلیف آئے گی ہمیں اِس میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے، اور اگر ہم اِس سلسلے میں کوئی اعتراض اٹھائیں گے، کوئی شکایت، شکوہ کریں گے تو یہ ہماری نادانی ہو گی، چونکہ خدا نے اعلان فرمایا اور جس کو ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے ہم سے سودا کیا ہے۔ جان پر جو بھی تکلیف آئے اور جان کی جو بھی قربانی دین کی راہ میں ہو اور جان میں جو بھی کمی آئے اور والدین اور عزیز ان میں سے جس کسی کی جیسی موت واقع ہو، جیسی

بیماری آئے اور نفوس میں جو کمی ہو اِس میں ہمارا کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے، یہ قول و قرار ہو چکا ہے اور آیۂ بیعت جو اسماعیلی مذہب میں اور پورے اسلام میں اِس کی بہت بڑی اہمیت ہے، بیعت کی جس کی ہم روزانہ (practice) کرتے ہیں، جس کی تجدید کرتے ہیں، تو جس آیت کو میں نے ابھی بھی (quote) کیا یہ آیت آیۂ بیعت کی تشریح ہے، جب ہم بیعت کرتے ہیں مکھی کے ہاتھ پر، امام کے ہاتھ پر، کسی عملدار کے ہاتھ پر، تو اُس میں ہم اِس خدا کے ساتھ جو سودا ہوا ہے اِس کی تجدید کرتے ہیں، اِس معاہدے کی تجدید کرتے ہیں، یہ (renewal) ہے، تاکہ ہم بھول نہ جائیں کیونکہ انسان جو ہے وہ بھولنے والا ہے، اِس لئے ہم اپنے دل میں اِس سودے کو یاد کرتے ہیں، کہ ہم نے اپنی جانوں کو اور اپنے مالوں کو خدا کے ہاتھ پر بیچ ڈالا ہے کہ اِس کے عوض میں ہم کو جنّت ملے گی، اِس نیت سے بیعت کرنی ہے۔ لفظِ بیعت جو ہے عربی میں خرید و فروخت کے لئے آتا ہے، اِس میں خریدنے کے معنی بھی ہیں فروخت کرنے کے معنی بھی ہیں۔ بعض زبانوں میں کچھ الفاظ ایسے ہیں کہ اُن میں متضاد معنی پائے جاتے ہیں، متضاد معنی دو طرفہ اور یہ لفظ بھی انہی میں سے ہے، کہ بیعت صرف خریدنے کے لئے نہیں ہے، صرف فروخت کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے لئے ہے۔ لہٰذا اِس بیعت میں دو ہاتھ اِس لئے ہوتے ہیں کہ ایک خریدنے کی نمائندگی کرتا ہے، اور ایک بیچنے کی نمائندگی کرتا ہے، تو جو بیعت لیتا ہے وہ خدا و رسول اور امام کی طرف سے جنّت کے دینے کی مثال کو پیش کرتا ہے اور جو مرید بیعت کرتا ہے وہ اپنی جان اور اپنے مال کو فروخت کرنے کا (demonstration) کرتا ہے، تو دیکھا آپ نے کہ اسلام میں جو مثالیں ہیں، جو قرآن میں مثالیں ہیں اُن میں خرید و فروخت یا تجارت کی مثال کی کیا اہمیت ہے، بہت بڑی اہمیت ہے۔ مثال تو مختصر ہے لیکن اِس میں دین کے سارے مقاصد آجاتے ہیں، دین کی ہر بات اِس میں آجاتی ہے، اور یہ سودا جو خدا کے ساتھ ہوا ہے دنیا کا کوئی سودا نہیں ہے کہ ایک ہی دن میں کسی چیز کو اٹھائیں اور کسی کو دے دیں بات ختم، ایسا نہیں ہے، ہم اپنی زندگی بھر کے اعمال سے اِس کی تشریح کرتے ہیں۔

ہم جس طرح اسلامی، ایمانی زندگی گزارتے ہیں اسی میں یہ بات پوری ہو جاتی ہے، ایسا نہیں کہ جو کچھ مال ہے وہ ایک دن اُٹھا کے خدا کے گھر میں دے دیں، ایسا نہیں ہے کہ اپنی جان جو ہے اِس کو جو ہے قربان کریں تو یہ سودا بن جائے یہ بات نہیں ہے۔ اِس کی تفصیل، اِس کی تشریح اور وضاحت دین کے انداز پر ہوتی ہے اور پوری زندگی میں، اور زندگی کے پورے میدان پر اِس کا پھیلاؤ ہے۔ لہٰذا قرآن کی مثالوں میں سے یہ جو ہم دوسری مثال بیان کرتے ہیں اِس کی بھی بہت بڑی اہمیت ہے کہ اِس میں خدا نے مومن کے جان و مال کو خرید لیا ہے اور مال و جان کے خریدنے میں بہت بڑے معنی ہیں، تو پھر ہم قوانین دین کے مطابق اِس سودے کو پورا کرتے ہیں اور یہ جاننا ضروری ہے کہ بیعت کیوں ہے اور بیعت کے لفظی معنی کیا؟ اِس کا مطلب کیا ہے اور اِس کی اہمیت کیوں ہے جو ہر روز ہم بیعت کرتے ہیں، صبح و

شام بیعت کرتے ہیں۔ اِس سے متعلق جو آیات ہیں اُن کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے اور اُن کے مطلب کو سمجھنا چاہئے اور جو مومن اِن معنوں کے ساتھ بیعت کرے گا، تو میں سمجھتا ہوں کہ اُس کو بہت بڑا ثواب ملے گا کیونکہ علم کی روشنی میں عمل کرنے سے بہت بڑا ثواب ملتا ہے۔ ابھی ابھی کچھ بات ہوئی تھی سجدہ غیر شعوری طور پر کرنے اور شعوری طور پر کرنے میں، اور معرفت کے بغیر سجدہ کرنے میں، اور معرفت کی روشنی میں سجدہ کرنے میں کیا فرق ہے، یہ بات ہے کہ اگر ہم بیعت کو علم کی روشنی میں کرتے ہیں، تو اِس سے فوری طور پر ہم کو سکون مل جائے گا، ہمیں خوشی ہوگی، ہمیں راحت ملتی رہے گی کہ ہم اِس بیعت کو جو کرتے ہیں اِس کا مقصد کیا ہے؟ اِس کا مقصد یہ ہے۔ جس طرح کبھی ہم نے صلوٰۃ کے معنی اور اِس کی حکمتوں کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو مومن صلوٰۃ کی حکمتوں کو سمجھتے ہوئے صلوٰۃ پڑھے گا اُس کو بہت ثواب ملے گا اور اُن بہت سارے ثوابوں کی ایک جھلک یہ ہے کہ جو مومن صلوٰۃ کی حکمتوں کو سمجھتے ہوئے صلوٰۃ پڑھتا ہے، تو اُس کو اعتماد آتا ہے، اُس کو خوشی ہوتی ہے کہ وہ مومن صلوٰۃ کی تاویلات کو سمجھتا ہے۔ اسی طرح جب بندۂ مومن بیعت کے معنوں کو، بیعت کی حکمتوں کو سمجھے گا، تو اُس کو خوشی ہوگی اور اِس عمل سے اُس کو سکون ملے گا، راحت ملے گی، یہ تجارت کی مثال ہے۔

ایک اور چیز اِس سلسلے میں یہ کہ خداوندِ عالم نے ہمیں دنیا دے دی ہے، تو دنیا کے بارے میں قرآن نے اور حدیث نے دو پہلو بتائے، دنیا اچھی ہے اور دنیا بری ہے، بیک وقت دنیا اچھی بھی ہے اور دنیا بری بھی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا اچھی ہے کس معنیٰ میں اور دنیا بری ہے کس معنیٰ میں؟ دنیا اچھی ہے اِس معنیٰ میں کہ اگر آپ دنیا کو فروخت کر کے خدا کے اِس سودے کے مطابق آخرت کو لیتے ہیں تو دنیا سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ جو شخص دنیا میں نہیں آیا ہے اُس کے پاس سودے کے لئے کوئی، کچھ نہیں ہے! کچھ نہیں ہے اور جو مفلس ہے وہ کیا کر سکتا ہے، مومن کے پاس خدا کے اِس سودے کے لئے کوئی چیز ہونی چاہئے، جان ہونی چاہئے، مال ہونا چاہئے تا کہ خدا اِس آیت کے مطابق مومن کے ساتھ کچھ سودا کرے اِس معنیٰ میں دنیا اچھی ہے، اِس کے برعکس دنیا بری ہے،، بہت بری ہے۔ اگر یہ دنیا اِس سودے کے لئے نہیں ہے یعنی کوئی مومن یا کوئی شخص ایسا سودا نہیں کر پاتا ہے تو اُس کے لئے دنیا بہت بری ہے اور وہ دنیا وبالِ جان ہے پھر وہ شخص اسی دنیا کی وجہ سے کہ اُس نے دنیا کو اِس طرح سے استعمال کیا مبتلا ہو جائے گا، خدا کے حضور میں گرفتار ہو جائے گا، اِس معنیٰ میں دنیا بری ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں دنیا کے متعلق دو باتیں پائی جاتی ہیں، دو مختلف باتیں پائی جاتی ہیں یا کہ دو متضاد باتیں پائی جاتی ہیں، کبھی دنیا کو بہت بری قرار دی گئی ہے اور کبھی دنیا کو اچھی قرار دی گئی ہے، تو اِس سے مومن پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ کیوں دنیا بری ہے اور کس لئے دنیا اچھی ہے اور اِس کے علاوہ خداوندِ عالم نے ایک مثال مومن کے جاننے کے لئے زراعت سے دی ہے، کاشت کاری سے دی ہے، کھیتی باڑی سے مثال دی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ صدقہ ہو یا نیکی یا کوئی اور نیک عمل اُس کے اضافے کی مثال ایک ایسے دانۂ گندم کی طرح ہے

کہ جس کو زمین میں بویا جاتا ہے، تو ایک ہی فصل میں اُس کے سات خوشے بنتے ہیں، ہر خوشے میں سَو دانے ہیں، گویا ایک ہی فصل میں ایک دانے کے ساتھ سَو دانے بن جاتے ہیں اور پھر اسی طرح دوسری فصل میں، دوسری فصل میں اِس میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہو جاتا ہے (۲۶۱:۲)۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ خداوندِ عالم نے دین کی مثال، ایمان کی مثال اور مومن کے نیک اعمال کی مثال زراعت سے بھی دی ہے، کاشت کاری سے بھی دی ہے اور اِس سلسلے کی ایک حدیث جسے آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ ''اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْآخِرَۃِ'' یہ ہے، کہ دنیا کیا ہے آخرت کے لئے کھیتی باڑی ہے، جو انسان دنیا میں کچھ بوئے گا وہی آخرت میں کچھ کاٹے گا اور جو یہاں کچھ بھی نہیں کرے گا وہ آخرت میں کچھ بھی حاصل نہیں کرے گا، اِس حدیث کا مطلب یہ ہے۔

اِس حدیث کی ایک اور منطق یہ بنتی ہے کہ اگر دنیا آخرت کی کھیتی باڑی ہے، تو بار بار اِس کھیتی باڑی سے کیوں نہ فائدہ اُٹھایا جائے، کیونکہ کھیتی باڑی کی مثال میں یہ صحیح نہیں ہے، کہ کوئی زمیندار، کوئی دہقان، کوئی کاشتکار صرف ایک ہی سال میں کاشت کرے، یہ زمین ایک ہی فصل کے لئے نہیں ہوتی ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے، اِس سے لاانتہائی کا تصور ملتا ہے، یعنی ہم دنیا سے بار بار فائدہ اُٹھاتے رہیں گے، ہماری ایک حقیقت جو ازلی اور ابدی ہے وہ تو اپنی جگہ سے ہٹتی نہیں ہے لیکن اُس کا ایک سایہ ہے یعنی ایک شخصیت، وہ تو دنیا سے ہمیشہ فائدہ اُٹھاتی رہے گی اور اسی میں مزہ ہے، اِس حدیث کا ایک تصور یا کہ اِس کا ایک فلسفہ یا کہ اِس کی ایک منطق یہ بنتی ہے۔ یہ ایک نمونہ تھا، کہ قرآن کی جو مثالیں ہیں وہ دو قسم کی ہیں اور اُن مثالوں میں کس طرح ممثول کو بیان کیا گیا ہے، یہاں تک کہ قرآن کا کوئی لفظ سوال کے پہلو سے خالی نہیں، یہ میرا ایک دعویٰ ہے، آپ توجّہ فرمائیں کہ یہاں پر میں شاید ایک نئی بات یا انقلابی بات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن کا کوئی لفظ، خواہ کوئی بھی لفظ ہو وہ سوال کے پہلو سے خالی نہیں ہے، اُس کے اندر ایک سوال کا پہلو ہے، مثال کا ایک پہلو ہے، مثال ہے، یہاں تک کہ خدا کے جتنے نام ہیں اُن میں بھی مثال کا پہلو ہے۔ مثلاً اسم رحیم کو لیجئے یا رحمان کو لیجئے، رحم کرنے والا، اِس میں بھی مثال کا پہلو ہے یعنی خدا کی اِس صفت کو یوں سمجھایا گیا ہے جیسے ایک شخص ہے سامنے، بڑا آدمی ہے یا بادشاہ ہے یا کوئی لیڈر ہے یا کوئی غنی ہے، تو انگر ہے، ایک غریب جا کے اُس کے سامنے روتا ہے، جب یہ روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، آنسو بہاتا ہے یا اپنی تکلیف کی داستان سناتا ہے، تو اُس سننے والے شخص کے دل پر ایک کیفیت گزرتی ہے، اُس کیفیت سے اُس کے دل میں رقت، گداخت، نرمی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، بعض دفعہ آنسو آتے ہیں، اور اگر آنسو نہیں بھی آتے ہیں تو دل اُس کا پگھل جاتا ہے، اِس کیفیت کا نام ہے رحم آنا، رحم آنا، یہ تو بندے کی بات ہوئی۔ اب ہم اِس کیفیت کو ذاتِ خدا سے کس طرح چسپاں کریں، ناممکن ہے، کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ خدا اپنے بندے کے حال سے قبل از وقت باخبر نہ ہو، اور جب کوئی شخص اُس کے سامنے جا کر گریہ وزاری کرتا ہے، تو خدا کے

دل میں نرمی آتی ہے، یہ کیفیت اُس پر اثر انداز ہوجاتی ہے، اُس کو متاثر کرتی ہے، پھر اُس میں ایک تغیّر پیدا ہوتا ہے، تبدیلی آتی ہے اور ایک رحم کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، کیا ایسا ہے؟ نہیں! نہیں! یہ تو خدا کے معاملے میں مثال کی حیثیت ہے۔ ہاں! اگر امام کو صفاتِ بشریت کے ساتھ خدا کا زندہ نام قرار دیا جائے، تو امام کے قلب میں یہ بات ہوسکتی ہے، تو اُس صورت میں یہ بات صحیح ہوسکتی ہے ورنہ جہاں ذاتِ خدا کا تصوّر ہے، اُس میں بے چونی ہے، اُس میں یک رنگی ہے، اُس میں تغیّر نہیں ہے، اُس میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے، اُس میں انقلاب نہیں ہے، اُس میں جدّت نہیں ہے، تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم خدا پر اثر انداز ہوجائیں اور اُس میں تغیّر ہو اور رحم کی کیفیت پیدا ہوجائے۔ اِس لئے یہ صرف مثال ہے اور یہ جو حقیقت بنتی ہے ایسی صورت میں ہے، کہ امام کو خدا کا زندہ نام قرار دیا جائے اور ظاہراً اور باطناً یہ کیفیت امام میں ہوسکتی ہے، لیکن نور کے اعلیٰ درجے میں جہاں پر کوئی تغیّر نہیں ہے یہ بات نہیں ہوسکتی ہے اور آپ جب ریسرچ کریں گے تمام خدا کے ناموں میں، تو یہی بات پائی جائے گی۔

خدا کے کسی ایسے نام کو لیں جس میں غصّے کے معنی پائے جاتے ہیں، تو غصّے میں انسان کی مثال میں یوں ہوتا ہے کہ ایک آدمی اپنے صحیح موڈ میں بیٹھا ہے کہ یکا یک کوئی بات اُس کو ناگوار گزرتی ہے، وہ برہم ہوجاتا ہے اور غضبناک ہوجاتا ہے، کیا یہ خدا کی ذات میں ممکن ہے کہ کوئی چیز اُس کو غضبناک بنائے اور اُس کی ذات میں تغیّر آئے اور اُس کا موڈ خراب ہوجائے، جیسے کسی انسان کا موڈ خراب ہوجاتا ہے، یہ بات نہیں ہے۔ ایک ایک کر کے خدا کے جتنے صفاتی نام ہیں اُن میں دیکھیں گے، تو یہ بات پائی جائے گی اور ایک طرف سے اِس ریسرچ کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ صفات جو ہیں اعلیٰ حدود کی ہیں اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا، کہ وہ خدا کے معاملے میں مثال کی حیثیت رکھتی ہیں اور جو ہمیں فرمایا گیا ہے، کہ تم دعا کرو میں رحم کروں گا، یہ حکم اپنی جگہ پر صحیح ہے، اِس حکم کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ اِس تصور سے، اِس دعا سے اور اِس بہانے سے ہماری ذات کے اندر بہت ساری کلیدیں کھل جاتی ہیں، ہماری ہستی کی ساخت، بناوٹ ایک مشینری کی طرح ہے، ذہنی اور قلبی کیفیت میں، تو کچھ چیزیں اِس طرح سے (lock) ہوجاتی ہیں (lockup) ہوجاتی ہیں کہ ہم اُن کو ہاتھ بڑھا کر ٹھیک نہیں کر سکتے ہیں یعنی ہمارا ہاتھ ہمارے ذہن تک نہیں پہنچتا ہے، ہمارے دل تک نہیں پہنچتا ہے، ہماری رُوح تک نہیں پہنچتا ہے۔ اِس کے لئے رسائی یہ ہے، (approach) یہ ہے کہ ہم عبادت اور بندگی سے شروع کریں، تو اُس میں یکا یک ہمارے اندر کے جو پرزے ہیں وہ صحیح کام کرنے لگتے ہیں، ہم سوچتے کچھ اور ہیں اور ہوتا کچھ اور ہے، ہم سوچتے اِس طرح سے ہیں کہ خدا کو رحم آئے گا، خدا کے دل میں رقت پیدا ہوگی اور ہم بار بار خدا کو پکارتے ہیں جیسا کہ وہ یعنی توجہ نہیں دے رہا ہو، جیسا کہ وہ پرواہ نہیں کر رہا ہو، جیسا کہ اُس تک خبر نہیں گئی ہے، یہ بات نہیں ہے، اِس تکرار سے، اِس دہرانے سے، اِس (repetition) سے خود ہم کو فائدہ ہے، کہ ہم جس قدر بھی پکاریں، دعا کریں اتنا ہمارا جو باطن

ہے، ہمارے ذہن کی جو مشینری ہے، اور ہمارے قلب کے جو پرزے ہیں اور رُوح کی جو راہیں ہیں وہ اِس دعا سے، وہ اِس بندگی سے کھل جاتی ہیں۔ اِس لئے خدا نے کہا کہ مجھے پکارتے رہو، بلاتے رہو، بلاتے رہو جیسے وہ نہیں سنتا ہو، جیسے ہماری آواز اُس تک نہیں پہنچتی ہو، تو اِس سے ظاہر ہے کہ یہ خود اپنے اِس مرض کا اِس میں علاج ہے، اپنے اِس مرض کی دوا ہے، اور باقی مثال ہے، تو ہم اگر عقیدے کی حد میں یوں کرتے ہیں ٹھیک ہے اور اگر علم کی روشنی میں عبادت و بندگی کرتے ہیں، تو اُس میں زیادہ بہتر ہے، مطلب یہ کہ قرآن کی مثالیں ہیں، کچھ نمایاں مثالیں ہیں اور کچھ مثالیں ایسی ہیں کہ اُن میں لفظِ مثال آیا ہے، مثل آیا ہے اور کچھ مثالیں ایسی ہیں کہ اُن میں لفظِ مثل نہیں آیا ہے لیکن معنوی طور پر وہ مثالیں ہیں اور اِس سے بڑھ کر جو تیسری قسم کی مثالیں ہیں وہ ذرا گہرائی میں ہیں، اور جس کی بابت میں نے عرض کیا جیسے خدا کے ناموں میں سے ایک نام رحیم ہے یا خدا کے ناموں میں سے ایک کوئی نام غصّے سے متعلق ہے لیکن آپ کو غصّے سے متعلق کوئی نام نہیں ملے گا، خدا کے صفاتی نام ہیں، قہّار اور جبّار کے معنی غصے کے نہیں ہیں، قہّار یعنی کہ زبردستی سے کنٹرول کرنے کے معنی ہیں اور جبّار مجبور کرنے کے معنی ہیں، تو وہ بھی صلاح کی طرف مجبوری ہے، نیکی کی طرف مجبوری ہے اور کسی چیز کو اُس کے درجے میں رکھنے کے لئے مجبوری ہے، تو اِس مجبوری میں، اِس جبر میں صلاح ہے، حکمت ہے، بھلائی ہے اور بہتری ہے۔

لہٰذا لفظِ غضب آیا ہے مگر اِس کا (source) نہیں ہے، ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ'' وغیرہ اِس کے علاوہ بھی قرآن میں غضبِ الٰہی کا ذکر ہے مگر اِس کے متعلق کوئی ایسا نام نہیں ہے، اِس کی وجہ یہ ہے، کہ اصل میں خدا کے جو نمائندے ہوتے ہیں اُن کا غضب خدا کا غضب ہے۔ یہی نہیں بلکہ دوسری صفات بھی نمائندگی میں ہیں، تو پیغمبر کو ناراض کرنا خدا کو ناراض کرنا ہے اور پیغمبر کا غصہ ناک ہوجانا خدا کا غصہ ناک ہوجانا ہے اور پیغمبر کے جانشین کو ناراض کرنا پیغمبر کو ناراض کرنا ہے۔ اسی طرح امام کی خوشنودی پیغمبر کی خوشنودی ہے اور پیغمبر کی خوشنودی خدا کی خوشنودی ہے، تو یہ چند باتیں تھیں جو اتفاق سے بتائی گئیں اور میرے خیال میں یہ فکر انگیز باتیں ہیں، اِس سے کئی سوالات اُٹھ سکتے ہیں اور کچھ انقلابی تصورات ذہن میں آسکتے ہیں، اِس لئے میں اِن باتوں کو مفید سمجھتا ہوں اور اِس کے ساتھ اب وقفۂ سوالات ہوگا تو اُس میں کوئی عزیز اِس موضوع سے متعلق یا اِس کے قریب کا کوئی سوال چاہے تو اُٹھا سکتا ہے اور ہم آپ کی دعا سے اور مولا کی توفیق سے کوشش کریں گے کہ اُس سوال کا کوئی مناسب جواب پیش کیا جائے، شکریہ اور یا علی مدد۔

سوال: (محی الدین) سر، سوال اِس طرح ہے کہ اجر اور جزا جو ہے صرف انسانوں کو ملتا ہے، باقی دوسری چیزیں جو انسانوں کے علاوہ پتھر ہیں، درخت ہیں، تو اِن کو اطاعت کرنے کی کیا ضرورت ہے خدا کے حضور میں، اِس کو ذرا سمجھائیں؟)

جواب: جیسا کہ آپ عزیزوں نے سُن لیا یہ بہت ہی بنیادی سوال ہے اور اِس کا تعلق پوری کائنات سے ہے اور سوال بہت بڑا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ جہاں بموجبِ قرآن یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک طرح سے اطاعت ہر چیز کرتی

ہے، بے جان چیزیں، اور نباتات، جانور اور یہاں تک کہ کافر بھی، ہر چیز سجدہ کرتی ہے، ہر چیز تسبیح پڑھتی ہے اور ہر چیز نماز قائم کرتی ہے، لیکن اجر کے بغیر یہ کیوں ایسا ہے؟ اِس کا جواب یوں ہے کہ خدا نے قانون بنایا وہ یہ بنایا، کہ دنیا میں جو بھی لوگ آئے ہیں وہ اگر خدا کو پہچانیں گے، تو اُن کو پورا پورا اجر وصلہ ملے گا اور باقی کو نہیں ملے گا، تو پھر اِس پر سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اِن سب کو کیوں پیدا کیا گیا اور اِن مخلوقات کی کارکردگی کو سجدہ، تسبیح، نماز جیسے الفاظ میں کیوں یاد کیا گیا؟ یہ ہے کہ ہر چیز کو دنیا میں فائدہ ملتا ہے، خدا کی بادشاہی میں ہر چیز کو اُس کے درجے کے مطابق ایک ہستی ملی ہے، ایک وُجود ملا ہے، ایک جگہ ملی ہے اُس کو پیدا کیا گیا ہے، اِس امکانیت کے ساتھ کہ اگر وہ صحیح معنوں میں اطاعت کرے، تو اُس کو ارتقاء ملے گا، اُس کو بلندی ملے گی اور اِس ترقّی و ارتقاء کی مثال کو بھی خدا نے دنیا میں ظاہر کیا ہے، جیسا کہ جمادات اگر نباتات کی اطاعت کرتی ہیں، تو اُن کو ارتقاء ملتا ہے، کہ جمادات نباتات بن جاتی ہیں، جمادات اگر حیوان کی اطاعت کرے، حیوان میں فنا ہو جائیں تو نباتات حیوانات بن جاتی ہیں، حیوانات جو حلال ہیں وہ جب انسانوں کے کام آتے ہیں اور انسانوں کے لئے قربان ہو جاتے ہیں، تو اُن کو بلندی ملتی ہے، انسان جو انسانِ کامل کے کام آئیں، اُس کی اطاعت کریں تو اُن کو اسلام کا راستہ کھلتا ہے، اسلام کا دروازہ کھلتا ہے، یہ ارتقاء ہے، یہ نہ ہو تو پھر ایک طرح سے اُن کو عارضی فائدہ ملتا ہے کہ دنیا میں اُن کا وجود ہے، دنیا میں اُن کا وجود ہے، اُن کے اِس ظاہری وُجود کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ بھی اُن کو مہیا ہیں مگر خدا کے نزدیک جو اصل چیز ہے وہ اُس سے محروم ہو جاتے ہیں، لیکن ہم دیکھیں گے ذرا دُور دُور کی بات کو دیکھیں گے کہ جو خدا کے مقصد کے مطابق جن کو رُوحانی ترقّی نہیں ملتی ہے، جو صراطِ مستقیم پر فائز نہیں ہوتے ہیں، اُن کے لئے کیا؟ تو ہم اِس سوال کو اِس طرح سے مکمل کریں گے، اِس سوال کے جواب کو کہ وقتی طور پر یہ ساری مخلوقات جب تک خدا کی معرفت کو نہ پہنچے تو اُن کی رُوحانی ترقّی نہیں ہوگی، اُن کا عروج نہیں ہوگا، ایک بات۔

پھر بہت ساروں کو سزا ملے گی، انسانوں کو سزا ملے گی، جہالت کی سزا اور جانور خود سزا میں مبتلا ہیں، اُن کو سزا نہیں ملے گی مزید، وہ پہلے سے کسی سزا میں مبتلا ہیں، نباتات کو سزا نہیں ملے گی، جمادات کو سزا نہیں ملے گی، انسانوں کو سزا ملے گی، اسلئے کہ سزا ملنے کی ایک وجہ ہے۔ جس طرح انسان کو ثواب ملنا چاہئے اِس طرح اُس کے برعکس عذاب ملنا چاہئے، اُس کی وجہ عقل ہے، عقل خدا کی طرف سے ایک حجّت تھی، اِس عقل کی وجہ سے معرفت بھی ضروری ہوئی، شعوری عبادت بھی ضروری ہوئی جس میں نجات تھی۔ پھر اُن گرے ہوئے انسانوں کو سزا دینے کے بعد خدا اُن کو پاک کرے گا، خدا اُن کو پاک کر کے پھر اُن کو آگے بڑھائے گا، یہ اِس لئے کہ آپ دیکھتے ہیں دنیا میں ایک سلجھی ہوئی حکومت مجرموں کو سزا دیتی ہے، اُس کا مقصد انتقام لینا نہیں ہے، اُس کا مقصد اصلاح ہے، لہٰذا اِس اصلاح کے بعد وہ جب باز آئیں گے، تو حکومت ایسے لوگوں کی بھلائی کے لئے کوشاں رہے گی، جو کچھ کہ اُس سے ہو سکتا ہے، جب دنیا میں اور ایک سلجھی ہوئی

حکومت میں یہ بات ہے، تو خدا اِس مثال سے بہت زیادہ برتر ہے، تو خدا نے جو جہنم بنائی ہے وہ اصلاح کے لئے ہے، اصل میں انتقام کا ذکر بھی تو آتا ہے لیکن اصل انتقام مقصود نہیں ہے (revenge) نہیں ہے، اصلاح مراد ہے۔ اِس اصلاح کے بعد خدا اُن لوگوں کو بھی آگے بڑھائے گا، باقی رہے جانور تو جانور کے لئے راستہ ارتقاء کی طرف کھلا ہے، نباتات، جمادات، یہ ایک سیڑھی کی طرح ہے بلکہ بعض حکماء نے اسی کو صراطِ مستقیم کہا، اللہ کی سب سے بڑی راہ یہ ہے کہ جمادات نباتات میں فنا ہوگئیں نباتات بن گئیں، نباتات جانوروں میں فنا ہوگئیں، جانور انسانوں میں فنا ہو گئے اور انسان انسانِ کامل میں فنا ہوگیا، یہ صراطِ مستقیم ہے۔ اِس میں اُوپر آنے کے لئے راستہ ہے لیکن انسانی مرحلے میں آنے کے بعد دو باتیں ممکن ہیں یا یہ کہ جہنم میں جا کے جانا پڑے گا یا یہ کہ جہنم سے نجات ملے گا لیکن ایک بات میں کروں یہاں پر قرآن نے ایک ایسا کلیہ پیش کیا ہے جس کے مطابق ہر شخص کو جہنم سے گزرنا ہے، یہ میں بڑی جرأت کے ساتھ کہتا ہوں چونکہ قرآن کا اعلان ہے، میں کوئی کُرید کر بات نہیں بتاتا ہوں بلکہ ظاہر بات ہے، ''وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا'' (۱۹:۷۱)، تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے کہ جہنم کے راستے سے نہ چلے، فرق یہ ہے کہ کچھ لوگ زانوؤں کے بل گر پڑیں گے اور کچھ لوگ اُسی میں سے آگے بڑھیں گے چونکہ جہنم جو ہے وہ راستے میں ہے، تو لہٰذا کچھ لوگ بہت پہلے اُس سے آگے بڑھیں گے، کچھ لوگ دیر سے اُس سے نکل جائیں گے، یہ فرق ہے۔

اِس سے اِس سوال کا جواب مل گیا کہ خدا کی بادشاہی ابھی ختم ہونے والی نہیں ہے، خدا کی بادشاہی جو ہے ازلی اور ابدی ہے یعنی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے، تو پتھر کے لئے بھی موقع ہے، کہ وہ آگے بڑھے، مٹّی کے لئے بھی موقع ہے کہ وہ آگے بڑھے، نباتات، جانور وغیرہ پھر ہر چیز کی جو اطاعت ہے یا جو سجدہ ہے گرچہ وقتی طور پر اُس کا فائدہ نہیں ہے لیکن آگے چل کر اُس کی جو مشقّت ہے، اُس کی جو تسبیح ہے وہ ضائع نہیں جائے گی، تو خداوندِ عالم کی بادشاہی میں جو کچھ ہے وہ خدا کی نظر میں ہے، اور اگر اِس کے بغیر سب کو فرشتے بناتا تو خدا کی بادشاہی نہیں چلتی اور اُس میں کوئی رنگا رنگی نہیں ہوتی، سب کو انسان بناتا تو پھر بھی یہی بات ہوتی، سب کو جانور بناتا تو کچھ مزہ نہیں ہوتا، سب کو درخت بناتا تو کچھ اِس میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی، سب کو جمادات یعنی بے جان چیزیں قرار دیتا تو کوئی بات نہیں بنتی، یہ مصلحتِ خداوندی ہے کہ جن چیزوں کو پتھر بنایا ہے اُس میں بھی خدا کی مصلحت ہے، ہوسکتا ہے کہ اُس کو، ایک پتھر کو ایک زمانۂ دراز کے بعد ایک بادشاہ بنائے، جیسے عمر خیام کہیں مٹّی سے مخاطب ہوتا ہے، کہیں صراحی سے مخاطب ہو کے کہتا ہے، کہ اے صراحی! تو کبھی ایک بادشاہ کا سر تھا جو ابھی صراحی ہے، اِس قسم کی دُور دُور کی باتیں اور امکانیت کی باتیں کرتا ہے یہ عمر خیام کی عادت ہے اور یہ بعید نہیں، محال نہیں، ممکن ہے۔ جس طرح ہم سائنسی طور پر دیکھتے ہیں، کہ جو مادّہ ہوتا ہے وہ تین حالتوں میں پایا جاتا ہے اور وہ تین حالتیں ایسی ہیں کہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں یا یہ کہ وہ تین قسم کے جو مادّے ہیں وہ آپس میں آنے جانے اور

تبدیل ہونے کے رستے رکھتے ہیں،اسی طرح خدا کی بادشاہی میں جو چیز ہے وہ دُور دُور تک دیکھا جائے تو وہ ایک چیز ہے،اِس میں گوناگونی ہے،اس میں تغیّر وتبدل ہے،ہمیں ذرا دُور دُور تک وسیع القلبی سے دیکھنا چاہئے،یہ اسماعیلی مذہب کا تصور ہے کہ یہاں پر مساواتِ رحمانی ہے اور یہاں پر دیگر انسانوں کے متعلق بھی اچھے خیالات ہیں،گو کہ وقتی طور پر ہر عقیدے کا ایک دائرہ ہوتا ہے اور ہر چیز کو وُجود میں لانے کے لئے ایک سانچا ہوتا ہے،اُس سانچے کے بغیر کوئی چیز نہیں بنتی ہے،یہ جو ہمارے عقائد ہیں،ہمارے مذہبی وُجود کے لئے سانچے کی طرح ہیں،اور اگر ہم کو بچپن میں یہ نہ بتایا جاتا کہ دیکھو تمہارا مذہب صحیح ہے اور سب غلط ہیں یہ نہ بتایا جاتا،اور دوسرے مذہب والوں کو بھی اِس قسم کی تعلیم نہ دی جاتی تو کوئی بھی مذہب اپنا جداگانہ وجود نہیں رکھتا،تو اِس لئے ایک وقت ایسا آتا ہے جو مذہب سے انسان فائدہ اُٹھا کر انسان برتر ہو جاتا ہے،مذہب سے بھی برتر ہو جاتا ہے،جب خدا ملتا ہے،تو اُس وقت خدا مذہب سے برتر ہوتا ہے،تو اُس وقت پتا چلتا ہے،کہ سب کے لئے خدا کے نزدیک ایک مصلحت ہے،ایک اچھا سا پروگرام ہے،لیکن ایسا تو ہونا چاہئے نا،کسی کو تو پتھر بننا چاہیے،مثلاً ہم اگر خدا کے دربار میں ہوتے،ازل میں ہوتے،ملاءُ الاعلیٰ یعنی اعلیٰ سرداروں کے ساتھ ہوتے اور (suppose) خدا ہمارے ساتھ میٹنگ کرتا اور پوچھتا پیار سے،محبّت سے،دیکھو مجھے ایک ایسی دنیا بنانی ہے تو کون پتھر بن جائے گا،کون قربانی پیش کرے گا کہ میرے لئے پتھر بن جائے اور میرے لئے جانور بن جائے،تو شاید ہم میں سے جو اچھے ہیں،جو جاننے والے ہیں تو (voluntarily) کہتے ہیں کہ خداوندا! تیری سلطنت سے قربان،مجھ کو اِس دفعہ پتھر بنانا،کوئی کہتا ہے کہ میں تیرے لئے، تیرے لئے میں اُونٹ بن جاؤں،کوئی کہتا ہے کہ تیرے لئے میں گھوڑا بن جاؤں،یہ ضرور بات ہوتی،یہ اُس صورت کی بات ہے کہ جب اِس کی کوئی ابتداء ہوتی، کچھ ایسی بات ہے۔

ذرا ہم نے اگر گہرائی میں جانا ہے اور گہرائی سے دیکھنا ہے تو کچھ ایسی مصلحت ہے اور وقتی طور پر عقیدہ اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اسماعیلی مذہب ہم کو یہ روشنی عطا کرتا ہے،امام ہی اِس کے دروازوں کو کھول کے بتاتا ہے،اِس کو کہتے ہیں وسیع القلبی،اِس کو کہتے ہیں وسعتِ نظری یا وسیع النظری،جب ہمارا دل ایسا ہوگا،صاف ہوگا،سب کے لئے خیر خواہ ہوگا،ساری انسانیت کے لئے خیر خواہ ہوگا،تو یہ ہمارے لئے قابلِ تعریف بات بن جائے گی،تو سب کے لئے ایک مصلحت ہے لیکن وقتی طور پر جن کو جہنم میں جانا چاہئے،جہنم میں جانا پڑے گا اور جہنم عبارت ہے جہالت سے یعنی جہنم سے جہالت مراد ہے،جہالت،نادانی ایک آگ ہے،ذہنی وُجود کو ختم کرنے کے لئے،عقلی اور علمی جزوں کو ختم کرنے کے لئے،فنا کر دینے کے لئے،جہالت بہت بڑی بیماری بھی ہے اور آگ بھی ہے۔اِس جہالت کے بہت سے نام ہیں،اِس جہالت کو نجاست بھی کہا جاتا ہے،اِس جہالت کو تاریکی بھی کہا جاتا ہے،اِس جہالت کو شک بھی کہا جاتا ہے،اِس جہالت کو بیماری بھی کہا جاتا ہے،اِس جہالت کو ظلم بھی کہا جاتا ہے،اِس جہالت کو آگ سے بھی تشبیہہ دی گئی ہے،جہاں جہالت کی تشبیہہ

آگ سے دی گئی ہے، تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ذہنی دنیا کو، ایک علمی اور عقلی دنیا کو نیست اور نابود کر دیتی ہے۔ جس طرح آگ مادی چیزوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے، اسی طرح جہالت ایک اچھی خاصی عقلی دنیا کو، علمی دنیا کو، ذہنی دنیا کو اور رُوحانی دنیا کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔ اِس لئے جو جاہل ہے ''اَلْجَاهِلُ فِي النَّارِ'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جاہل کل کو جہنم میں جائے گا نہیں! اِس حدیث کے اِس (portion) کا یہ مطلب نہیں ہے، ''اَلْجَاهِلُ فِي النَّارِ'' جاہل آج بھی آگ میں ہے یعنی جاہل میں جو جہالت ہے وہ آگ ہے، ''اَلْجَاهِلُ فِي النَّارِ'' جاہل جہالت میں ہے، اِس کے معنی ہوئے کہ جاہل دوزخ میں ہے، جاہل آگ میں ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے اُس اچھے سوال کا یہ ایک مفید سا جواب اور مفصّل سا جواب تھا۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ مرسلات کی حکمتیں

کیسٹ نمبر: Q-32 تاریخ: ۷؍ جون؍ ۱۹۸۴ کراچی

Click here for Audio

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آج درسِ قرآن کے سلسلے میں آپ عزیزوں کے سامنے سورۂ مرسلات کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں، اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ اِن آیاتِ کریمہ کی جو رُوحانی حکمت ہے یعنی جو تاویل ہے اُس کو بیان کیا جائے۔

"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ وَالۡمُرۡسَلَاتِ عُرۡفًا (۱:۷۷) قسم ہے اُن ہواؤں کی جو نرمی سے آتی ہیں، یہ اس آیۂ کریمہ کی ظاہری تفسیر ہے مگر اِس کی تاویل کو سنیئے، اللہ تعالیٰ قسم کھاتا ہے اُن فرشتوں کی جو نفسانی موت کے موقع پر نرمی سے جان کو لیتے ہیں یعنی قسم ہے اُن فرشتوں کی جو نرم ہوا کی طرح یعنی نسیمِ سحر کی طرح نرمی سے رُوحِ مومن کو کھینچتے ہیں۔ آپ عزیزوں کو یاد ہوگا کہ جسمانی موت سے قبل بھی ایک موت ہے، اُس کو رُوحانی موت کہا جاتا ہے، اصل میں اسی نفسانی موت کی بات ہے، کیونکہ جب ایک انسان عام موت سے مرجاتا ہے اُس میں جو کچھ ہوتا ہے اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے یعنی وہ موت تقریباً تاریکی میں واقع ہوتی ہے، اُس میں رُوحانی واقعات کا پتہ نہیں چلتا، اِس کے برعکس جو نفسانی موت ہے اُس میں رُوحانی واقعات گزرتے ہیں اور قرآن کے نزدیک یہ امر ضروری تھا، کہ اُن واقعات کی طرف توجہ دلائی جائے، اور یہاں وہی تذکرہ ہے یعنی رُوحانی موت سے متعلق حکمتیں بیان کی گئی ہیں، تو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نرمی سے رُوح کو کھینچنے والے فرشتوں کی قسم کھائی۔

اِس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: "فَالۡعَاصِفَاتِ عَصۡفًا" پھر اُن تند ہواؤں کی قسم جو تندی سے چلتی ہیں (۲:۷۷) یعنی اُن فرشتوں کی قسم جو تندی سے جان قبض کرتے ہیں، چونکہ رُوحانی تجربات کے سلسلے میں یہ امر بھی ضروری ہوتا ہے، کہ دیکھا جائے کہ جب نرمی سے رُوح قبض کرلی جاتی ہے، اُس میں کیا کیفیت گزرتی ہے اور اِس کے برعکس جب سختی سے جان لے لی جاتی ہے اُس میں کیا سختی گزرتی ہے، یہ سارے واقعات ایک رُوحانی شخص پر گزرتے ہیں۔ اُس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: "وَالنّٰشِرَاتِ نَشۡرًا" اور اُن فرشتوں کی قسم! جو رُوح کو پھیلا دیتے ہیں (۳:۷۷) جس طرح کہ پھیلانا چاہیئے، اب اِس کی ذرا تشریح کی ضرورت ہے کہ کس مقصد کے پیشِ نظر رُوحِ مومن کو پھیلا دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ جب

انفرادی قیامت برپا ہوجاتی ہے،تو عزرائیل علیہ السّلام کی سرپرستی میں لاتعداد ایسے فرشتے آتے ہیں جن کا تعلق رُوح قبض کرنے سے ہوتا ہے اور وہ آکر رُوحِ مومن کو کھینچتے ہیں۔جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ رُوح اگرچہ ایک رُوح کہلاتی ہے لیکن یہ لاتعداد ذرّات پر مشتمل ہے اور اِس میں خدا کی بہت بڑی حکمت ہے،پس جب مومن کی رُوح کھینچ لی جاتی ہے تو اُس وقت رُوح کا آخری سرا،سر کی چوٹی سے باہر نہیں نکلتا ہے،باقی رُوح بدن سے اور پھر سر سے باہر نکلتی ہے اور جو رُوح اِس طرح بدن سے خارج ہوجاتی ہے وہ اِس دنیا میں بکھیر دی جاتی ہے۔آپ پوچھیں کیوں؟اِس لئے کہ خداوندِ عالم رُوح کو ایک پُرحکمت فصل کی طرح اِس دنیا میں بو دینا چاہتا ہے یعنی ایسی رُوح کے ذرّات پوری دنیائے انسانیت میں پھیل جاتے ہیں،اور اسی طرح ہر انسان کی ہستی میں مومن کے لئے ایک ہستی بن جاتی ہے یعنی کرۂ ارض پر جتنے انسان ہیں اُن میں فی کس ایک ذرّہ پہنچتا ہے اور اُس ذرّے کی نسبت سے وہ شخص کُل کو آپ کی رُوحانی سلطنت میں کام آتا ہے اور اسی طرح پوری دنیا رُوحانی طور پر فتح ہوجاتی ہے،مسخّر ہوجاتی ہے۔اِس سلسلے میں مولائے روم کا ایک اشارہ سنیئے"تخمِ اقبال و سعادت تاابد از زمین تااسمان انداختیم"اقبال مندی اور سعادت مندی کے بیج کو ہم نے اپنے ابد کے لئے زمین سے لے کر آسمان تک بکھیر دیا،تاکہ اِس پوری کائنات میں جو بوئی ہوئی فصل ہے اُس کو میں ابد میں کاٹ سکوں،اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کی ایک آیۂ کریمہ میں ارشاد ہوا ہے کہ خداوندِ عالم قیامت کے دن اِس پوری کائنات کے جوہر کو یعنی (essence) کو نچوڑ کے ایک موتی بنالے گا۔اُس موتی میں آسمانوں اور زمین کی قیمت ہوگی،اِس لئے کہ اِس پورے جہان کی رُوح یا کہ جوہر اُس میں موجود ہوگا،اور اسی قسم کی یہ ایک مثال ہے کہ جب مومن بڑے کام کے سلسلے میں ترقّی کرتے کرتے عزرائیل کی منزل کو پہنچتا ہے تو عزرائیل اُس پر رُوح قبض کرنے کی (practise) کرتا ہے،ایک بار نہیں بلکہ تقریباً ایک ہفتے تک یہ عمل جاری رہتا ہے۔آپ باور کریں گے کہ اُس وقت مومن کی شخصیت کو ایک سانچے کی طرح استعمال کیا جاتا ہے،یعنی جو کائنات میں رُوح ہے اُس کو بار بار اِس سانچے میں ڈالا جاتا ہے اور پھر اِس میں سے رُوح کو ہر بار قبض کیا جاتا ہے یہاں تک کہ تقریباً ایک ہفتہ گزرتا ہے تو مسلسل یہ (practise) ہوتی ہے،یہ عمل جاری رہتا ہے تاکہ اِس سانچے میں سے مومن کی کاپیاں،رُوح کی کاپیاں نکالی جائیں۔جس طرح کوئی شخص اینٹ کے سانچے میں اینٹ بناتا ہے یا کسی کارخانے میں کسی چیز کا سانچا ہوتا ہے اُس میں وہ چیزیں بنائی جاتی ہیں،اور پھر جب بہشت میں جاکے دیکھا جاتا ہے،تو اُس وقت ایک عظیم رُوحانی سلطنت وہاں پر موجود ہوتی ہے۔

اہلِ بہشت جن میں سے کچھ کا نام غلمان ہے،کچھ کا نام حور ہے اور وہ اُن میں سے ہر ایک اپنا تعارف کراتا ہے،جب پوچھا جائے کہ تم کہاں سے ہو؟کوئی کہتا ہے کہ میں فلان ملک سے ہوں اور میں تمہاری نسل سے ہوں،فلان وقت میں جو آپ کی رُوح بکھیر دی گئی تھی اُس میں سے ایک ذرّہ ہمارے والدین کو ملا تھا اور اُس میں سے یہ میری ہستی ہے،تو

اُس وقت اُس جنتی مخلوق سے خوشی میں اضافہ ہوجاتا ہے،اِس طرح جنّت کی ہر چیز مومن کے اعمال سے بنائی جاتی ہے،اِس کی ایک عام مثال یہ ہے کہ دنیا میں اگر اچھے سے اچھا باغ ہے یا اچھے سے اچھا بنگلہ ہے،تو کوئی شخص اُس کو دیکھ کے پسند تو کرتا ہے لیکن اُس سے مکمل خوشی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ یہ بنگلہ کسی اور کا ہے اور اگر اِس جیسا باغ اور اِس جیسا بنگلہ اُس نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہوتا،تو اِس کو بے حد خوشی ہوتی ،لہٰذا خداوند احکم الحاکمین نے جنّت کو مومن کے اعمال سے بنایا ہے،وہاں کی ہر چیز مومن کی اعمال سے بنی ہوئی ہے،اِس لئے جنت کی جو خوشی ہے وہ بے پناہ ہے۔

اِس سلسلے کی دوسری مثال،ایک آیت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا،کہ اُس آیت میں خزائنِ الٰہی کا ذکر ہے،یہ کئی دفعہ آیت آچکی ہے:''وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ''دنیا کی کوئی چیز نہیں ہے،خواہ انسان ہے یا اور کوئی چیز مگر وہ چیز پہلے ہمارے خزانوں میں ہوا کرتی ہے اور وہاں سے وقت اور زمانے کے علم کے مطابق ہم اُس کو جس مقدار میں چاہتے ہیں نازل کرتے ہیں(۱۵:۲۱)اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جو مخلوق کی ارواح ہیں،جو رُوحیں ہیں وہ پہلے خدا کے خزانوں میں ہوتی ہیں،لیکن خدا کے خزانے کہاں ہیں؟ خدا کے پاس ہیں،خدا کے پاس ہیں لیکن پاس اور نزدیک کیا یہ مکانی ہے؟ نہیں!یہ شرفی ہے،خدا جب کہتا ہے کہ میرے پاس،اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ مکانی طور اور جغرافیائی طور پر خدا کا کوئی مرکز ہے اور اُس مرکز سے جو بھی نزدیک ہو اُس کے متعلق کہا جائے کہ یہ میرے نزدیک ہے،یہ بات نہیں ہے،یہ نزدیکی رُوحانی ہوتی ہے،علمی ہوتی ہے اور شرف وعزّت کے لحاظ سے خدا کی یہ نزدیکی یا قربت مقرّر ہوتی ہے۔اب دنیا میں جو خدا کا دین ہے اُس میں جو مومنین ہیں،وہ خدا کے نزدیک ہیں،سو وہی مومنین خدا کے خزانے ہیں،اِس قانون کے مطابق دنیا والوں کو خدا جو کچھ دینا چاہتا ہے،خواہ فرزند دینا چاہتا ہے،رزق دینا چاہتا ہے،علم دینا چاہتا ہے،بخت دینا چاہتا ہے،دولت دینا چاہتا ہے،کچھ بھی ہو،وہ سب اپنے خزانوں میں سے نکال کے دیتا ہے،اِس قانون کے مطابق یہ ضروری ہے،کہ دنیا بھر کے لوگوں کی رُوحیں مومن میں سے ہو کے جائیں اور اِس معنیٰ میں جو مومنین ہیں خدا کے خزانے ہیں،تو دنیا میں انسانیت کے بیج کو بکھیر دینے کے لئے ارواح کو قبض کیا جاتا ہے جبکہ عزرائیل کا مرحلہ آتا ہے اور پھر یہ(practise)ایک ہفتے تک چلتی ہے اور پھر وہ رُوحیں اِس کائنات میں بکھیر دی جاتی ہیں اِس کو نشر کہتے ہیں یعنی پھیلا دینا،تو قرآن کا لفظ مختصر ہوتا ہے اور اِس کی رُوحانی تشریح لمبی ہوتی ہے۔''وَالنّٰشِرٰتِ نَشۡرًا''(۷۷:۳)اور روح کو بکھیر دینے والے فرشتوں کی قسم،آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ قرآن کا اپنا ایک(style)ہے،ایک اندازِ بیان ہے،جس طرح کہ''وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا''(۵۶:۳۳)تم تسلیم کرو جیسا کہ تسلیم کرنے کا حق ہے،اسی طرح''وَالنّٰشِرٰتِ نَشۡرًا''اور پھیلا دیتے ہیں جیسا کہ پھیلا دینے کا حق ہے۔اِس میں جو فعل ہے وہ مبالغے کی صورت میں ہے یعنی مکمل طور سے اور کامل طریقے سے اِس کو،اِن رُوحوں کو پھیلا دیتے ہیں کہ کوئی جگہ اِن سے

باقی نہیں رہتی ہے یہاں تک کہ پوری کائنات میں اِن رُوحوں کو بکھیر دیتے ہیں، تاکہ کل کو جب خداوندِ عالم اِس (universe) کو نچوڑے گا، تو اُس میں سے پھر واپس یہ رُوحیں مومن کو لوٹیں، اور ہر چیز اِس کی اپنی ہو، کسی چیز کے ساتھ بیگانگی نہ ہو بلکہ اپنائیت ہو، اس قانون کی رو سے۔

''وَالنّٰشِرَاتِ نَشْرًا ۝ فَالْفَارِقَاتِ فَرْقًا'' (۷۷:۳) اور اُن فرشتوں کی قسم جو جدا کرتے ہیں رُوح کو جیسا کہ جدا کرنے کا حق ہے۔ مثلاً مومن کی ہستی میں سے رُوح کو نکالا اور اِس کی جگہ پر کائناتی رُوح کو ڈالا اور اِس طرح کرتے کرتے ایک ہفتے تک یہ کام ہوتا رہا۔ ''فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا'' اور اُن فرشتوں کی قسم جو ذکر کو ڈالتے ہیں (۷۷:۵) یہ اشارہ ہے کہ اُس موقع پر کچھ نئے اذکار یعنی بول میں سے کچھ اور بول اُبھر آتے ہیں، اسمِ اعظم کے کچھ ذیلی اسمِ اعظم اُبھر آتے ہیں ''عُذْرًا اَوْ نُذْرًا'' یہ کام زبردستی سے بھی ہوتا ہے اور خوشی سے بھی ہوتا ہے۔ اب یہ خداوندِ عالم نے قسم کھائی، اتنے سارے عظیم واقعات سے قسم کھائی، آپ کو یہ بھی معلوم ہے، کہ انسان اپنے سے اُوپر کی کسی چیز کی قسم کھاتا ہے لیکن خدا کے لئے ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اُس کی ذات سے برتر ہو جس کی وہ قسم کھائے، لہٰذا خدا مخلوقات میں سے اُن چیزوں کی قسم کھاتا ہے جو فضیلت میں مخلوقات سے بڑھ کر ہیں یا یوں کہا جائے کہ خدا کے قریب کی چیزوں کی وہ قسم کھاتا ہے۔ وہ چیزیں ہوتی ہیں اُس کے ماتحت، اس کے نیچے مگر دوسروں کے مقابلے میں وہ چیزیں خدا سے قریب ہوتی ہیں، مثلاً کبھی کسی (code word) میں پیغمبر کی قسم کھاتا ہے اور برملا بھی پیغمبر کی قسم کھاتا ہے جیسے فرمایا کہ ''لَعَمْرُكَ'' (۱۵:۷۲) تیری زندگی کی قسم، تیری جان کی قسم، آنحضرتؐ سے فرماتا ہے، تو اسی طرح کبھی امام کی قسم کھاتا ہے اور کبھی قلم کی قسم کھاتا ہے، کبھی لوحِ محفوظ کی قسم کھاتا ہے، تو یہ مراتب ایسے ہیں جو خدا سے قریب ہیں۔ اِس کے برعکس بعض حضرات نے کچھ یوں سوچا کہ بس خدا جس چیز کی چاہے قسم کھاتا ہے، اور کبھی وہ گھوڑے کی سون کی بھی قسم کھاتا ہے وغیرہ، یہ بات نہیں ہے، اُس کے اندر جو تاویل ہے وہ عظیم ہے، اُس تاویل کے اندر کوئی عظیم شئ پوشیدہ ہے اور خدا کسی عظیم شئ کے بغیر قسم نہیں کھاتا ہے، تو یہ عظیم واقعات ہیں، رُوحانیت کے واقعات ہیں جو فرشتوں کی وجہ سے پیش آتے ہیں، تو خداوند اِن واقعات کی قسم کھاتا ہے، اور دوسری بات جب بھی خداوندِ عالم قسم کھاتا ہے اُس کے بعد کوئی ضروری امر بیان کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح انسان کی عادت ہے کہ جب بھی وہ کسی بات پر زور دینا چاہتا ہے، تو اُس وقت وہ قسم کو یاد کرتا ہے، قسم کھاتا ہے، تو اِس قسم کے بعد خداوندِ عالم کہتا ہے کہ: ''اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ'' جو کچھ تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ وقوع پذیر ہونے والا ہے (۷۷:۷) یعنی قیامت جس کے متعلق تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ تو پیش آنے والی چیز ہے۔

''فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ'' تو یہ قیامت کب پیش آئے گی؟ قیامت، انفرادی قیامت ایسے پیش نہیں آئے گی، مگر جب ستارے مٹ جائیں (۷۷:۸) اور یہاں بھی تاویل ہے، دیکھیں کہ رُوحانی ترقّی کے سلسلے میں یا کہنا چاہئے

اسماعیلی اصطلاح میں، بیت الخیال کے سلسلے میں جب روشنی نظر آتی ہے تو وہ ستاروں کی روشنی ہے، رُوحانی ستاروں کی روشنی ہے، وہ روشنی اِس لئے ہے کہ کوئی بھی شخص جو اہلِ حق میں سے ہو یا اہلِ باطل میں سے، جب محنت کرتا ہے تو اُس روشنی کو پہنچتا ہے لیکن وہ مقام ایسا ہے، کہ اُس سے آگے سوائے ہادیٔ برحق کی ہدایت کے کوئی نہیں بچ سکتا ہے، وہاں تک تو ہر کوئی جا سکتا ہے، شیاطین بھی وہاں تک جا سکتے ہیں لیکن وہاں اتنا زبردست انتظام ہے، کہ وہاں پر آسمانِ اوّل ہے، رُوحانیت کا اور اُس پر کچھ چراغ مقرّر ہیں، اُن چراغوں کا کام یہ ہے کہ وہ اہلِ باطل کو آگے جانے نہ دیں، شعلے برسائیں اور اُن کو وہاں سے لوٹائیں، تو وہ ایک آیت میں یعنی کچھ آیتوں میں ''مَصَابِیۡحَ ''(۶۷:۵) یعنی چراغ کہلاتے ہیں اور ایک دوسری آیت کے مطابق ستارے کہلاتے ہیں (۳۷:۶۔۷) لیکن دونوں کا مقصد ایک ہے، نام کا فرق ہے مگر وہ چراغ ستارے ہیں، وہ ستارے چراغ ہیں۔ اب قیامت برپا نہیں ہوگی جب تک کہ وہ پردے کے لئے جو روشنی ہے اُس کو اور اُن ستاروں کو مومن کے آگے سے نہ ہٹا دیا جائے اور کافروں کے لئے وہ پردہ اِس طرح سے رہے گا اور روشنی رہے گی لیکن مومن کو آگے بڑھانے کے لئے اُن ستاروں کو مٹا دیا جائے گا کیونکہ وہ چوکیدار کے طور پر تھے قرآن کے مطابق، تو خداوندِ عالم اِس بات کی نشاندہی فرماتا ہے، کہتا ہے کہ قیامت اُس وقت برپا ہوگی، مومن کی انفرادی قیامت جب تک کہ ستارے مٹا دئے جائیں گے، ویسے بھی دوسری تاویل کے اعتبار سے ایک مومن کو اعلیٰ رُوحانی ترقّی کرنی ہے تو ذیلی قسم کے حدودِ دین سے اُس کو آگے بڑھانا ہوگا، حدود کو اُس کے سامنے سے ہٹانا ہوگا نہیں تو وہ حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے یا یوں کہا جائے کہ وہ حدود کو (cross) کرے گا، یہ ہوا ستاروں کا مٹ جانا، اِس کے برعکس اِس ظاہری کائنات میں جو ستارے ہیں وہ کبھی نہیں مٹ سکتے ہیں، تو خداوندِ عالم نے قیامت کی علامتوں میں سے ایک رُوحانی علامت یہ بتائی کہ قیامت، انفرادی قیامت (individual resurrection) اُس وقت قائم ہو جائے گی جبکہ ستاروں کو مٹا دیا۔

''وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتۡ ''(۷۷:۹) اور جب کہ آسمان کشادہ ہو جائے گا، آسمان کو کشادہ کیا جائے گا، چونکہ بول کے سلسلے میں ایک شخص بیت الخیال تک پہنچا تھا تو اُس کا رُوحانی آسمان محدود ہو جاتا ہے اور جب وہ پرواز کرے گا، آگے بڑھے گا تو اِس کا آسمان کشادہ ہو جائے گا، جس طرح مادّی طور پر جب ہم زمین پر ہیں تو آسمان چھوٹا ہے اور جب کوئی خلانوردی کرتا ہے فضاؤں میں اور بلندیوں میں جاتا ہے تو اُس وقت اُس کے لئے آسمان کشادہ ہو جاتا ہے، تو قیامت کی دوسری علامت یہ بتائی گئی کہ اُس وقت آسمان بہت کشادہ کیا جائے گا۔ ''وَاِذَا الۡجِبَالُ نُسِفَتۡ ''اور جس وقت کہ پہاڑ اُڑا دیئے جائیں گے (۷۷:۱۰) پہاڑ کیا ہیں؟ دیکھیں کہ انسان کی ہستی کے اندر منجمد رُوحیں ہیں اور بے شمار رُوحیں منجمد ہیں، جب صورِ اسرافیل بج جائے گا تو اِس سے رُوح کے بے شمار ذرّات بن جائیں گے اور لاتعداد رُوحیں بن جائیں گی، یہ ہوا پہاڑوں کا ذرّہ ذرّہ ہو جانا۔ ''وَاِذَا الۡجِبَالُ نُسِفَتۡ ''(۷۷:۱۰) اور جب پہاڑ ذرّات بن بن کے اُڑنے

لگیں گے،تو اُس وقت وہ ذرّاتِ رُوح اڑنے لگتے ہیں۔''وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ''(۷۷:۱۱)اور جبکہ انبیاءؑ وقتِ مقرر پر حاضر کیے جائیں گے،مطلب یہ ہے کہ انفرادی قیامت کیا ہے؟ وہ اجتماعی قیامت کی ایک صورت ہے،اجتماعی قیامت اُس کے اندر پوشیدہ ہے،مگر فرق صرف اتنا ہے،کہ لوگوں کو اِس کا احساس نہیں ہوتا ہے،اُس کو صرف ایک شخص دیکھتا ہے،سب لوگوں کو دیکھتا ہے اور سب لوگ بصورتِ ذرّات اُس میں نمائندگی کرتے ہیں اور پھر تمام پیغمبروں کی رُوحانیت کا مظاہرہ ہوتا ہے(demonstration)ہوتا ہے۔

آدم کے زمانے میں،نوح کے زمانے میں،ابراہیم،موسیٰ،عیسیٰ اور آنحضرتؐ کے زمانے میں جو رُوحانی واقعات گزرے تھے اُن سب کا(demonstration)ہوتا ہے وہ ترتیب وار ہوتا ہے،تو اِس لئے فرمایا جاتا ہے کہ قیامت اُس وقت ہوگی جبکہ حضرتِ انبیاء کی رُوحانیت کا مظاہرہ ہو جائے گا۔''لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ''(۷۷:۱۲)سوال ہوتا ہے کہ کس وقت کے لئے یا کونسا وقت تعین کیا گیا تھا یا کس وقت کے لئے مہلت دی گئی تھی۔''لِیَوْمِ الْفَصْلِ'' (۷۷:۱۳)فیصلے کے دن کی مہلت دی گئی تھی یا وقت جو مقرر ہوا تھا وہ فیصلے کے دن کے لئے مقرر ہوا تھا۔''وَمَآ اَدْرَاكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ''(۷۷:۱۴)اے مخاطب! تجھ کو کیا معلوم کہ فیصل کا دن کیا ہے''وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ'' (۷۷:۱۵)بربادی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کی۔اِس سورہ میں آپ دیکھیں گے آخر تک کئی دفعہ اِس آیت کا اعادہ کیا گیا ہے،اِس آیت کو دھرایا گیا ہے یعنی کیا بربادی ہے جھٹلانے والے کی؟ بربادی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی۔اب یہاں ٹھہر کے ذرا تجزیہ کریں گے یا بحث کریں گے کہ جھٹلانا کس معنیٰ میں! خدا کو ایک بار خدا ماننے کے بعد کوئی شخص نہیں کہہ سکتا ہے کہ خدا جھوٹ بولتا ہے یا تو کوئی انسان خدا کو بنیاد ہی سے نہیں مانتا ہے،وجودِ خدا کو،وجودِ باری تعالیٰ کو تسلیم نہیں کرتا ہے،جب کوئی شخص اللہ کی پاک ہستی سے انکار کرتا ہے،تو پھر اِس کی کوئی منطق نہیں بنتی ہے کہ وہ کہے کہ خدا جھوٹ بولتا ہے،جب کوئی بھی خدا کو خدا مانتا ہے،تو اعلیٰ ترین خوبیوں کے ساتھ خدا کو مانتا ہے اور اِس کے برعکس جو شخص خدا کو نہیں مانتا ہے،تو وہ بنیاد ہی سے نہیں مانتا ہے،پھر خدا کے متعلق وہ کچھ یعنی خدا ہے مگر ایسا ویسا نہیں کہہ سکتا ہے۔چنانچہ اِس منطق کے بموجب یہ بات نہیں بنتی ہے کہ کوئی کہے کہ خدا ہے مگر جھوٹ بولتا ہے،اور پھر جب قرآن میں ہے تو اِس کی کوئی وجہ ہوگی،اِس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص پیغمبر کو جھٹلاتا ہے اور جو شخص امام کو جھٹلاتا ہے وہ خدا کو جھٹلاتا ہے،کیونکہ جس طرح امام کی اطاعت پیغمبر کو پہنچتی ہے اور پیغمبر کی اطاعت خدا کو پہنچتی ہے یعنی خدا سے منسوب ہو جاتی ہے،اِس طرح جو شخص امام کو جھٹلاتا ہے وہ پیغمبر کو جھٹلاتا ہے اور جو شخص پیغمبر کو جھٹلاتا ہے تو نتیجے کے طور پر خدا کو جھٹلاتا ہے،اِس جھٹلانے میں کچھ ایسے معنیٰ ہیں۔اِس کے علاوہ جو شخص حقائق اور معارف کو اپنے طور سے نہیں سمجھتا ہے وہ بھی جھٹلاتا ہے۔

پیر ناصرِ خسروؒ جو ایک عظیم حکیم ہیں انہوں نے اپنی مشہور کتاب زاد المسافرین میں جھٹلانے سے متعلق وضاحتیں کی ہیں اور جھٹلانے کی حد بتائی ہے یا (definition) کیا ہے۔ اب اِس کے بعد ہم آگے بڑھتے ہیں، ''اَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡاَوَّلِيۡنَ '' (۱۶:۷۷) خداوندِ عالم بطریق سوال ارشاد فرماتا ہے، کہ آیا ہم نے اگلے منکرین کو ہلاک نہیں کیا؟ یعنی سرورِ انبیاء ﷺ سے قبل جن لوگوں نے اپنے زمانے کے پیغمبروں کو جھٹلایا تھا کیا ہم نے اُن کو ہلاک نہیں کیا؟ ''ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِيۡنَ '' (۱۷:۷۷) ارشاد ہوتا ہے، کہ پھر بعد کے جو منکرین ہیں اُن کو بھی ہم اگلے کافروں کے پیچھے پیچھے چلائیں گے یعنی جو برتاؤ اگلے کافروں سے کیا گیا تھا وہی برتاؤ پچھلے کافروں سے بھی کیا جائے گا۔ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جس طرح اگلے پیغمبروں کے زمانے کے کافروں کو طرح طرح سے ہلاک کیا گیا، اِس طرح آنحضرتؐ کے دَور میں جن کافروں نے کفر کیا اُن کو یکبارگی ہلاک نہیں کیا گیا اور پھر اِس کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ جو سلوک ہم نے اگلے کافروں سے کیا تھا وہی سلوک ان سے بھی کیا جائے گا، اب یہ مسئلہ کیسے حل ہو؟ یہ مسئلہ اِس طرح سے حل ہوگا کہ زمانۂ نوح میں جو طوفان برپا ہوا تھا اُس میں زیادہ خطرناک طوفان رُوحانیت کا تھا، ہم انکار نہیں کرتے ہیں، کہ ظاہر میں طوفان نہیں ہوا تھا، گو کہ ظاہر میں بھی ایک طوفان ہوا تھا لیکن وہ مثال کے طور پر تھا، سب سے خطرناک جو طوفان تھا وہ رُوحانی پہلو سے تھا، علیٰ ہٰذا القیاس، جن جن زمانوں میں منکرین ہلاک کئے گئے، اُن کی وہ ہلاکت دراصل رُوحانی نوعیت کی تھی، چنانچہ اِس معنیٰ میں خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے، کہ ہم نے اگلے کافروں سے جو انتقام لیا تھا رُوحانی طور پر، وہی انتقام اب بھی لے سکتے ہیں اور ضرور لے لیں گے، تو ظاہر میں کوئی یکسانیت نظر نہیں آتی ہے اور باطن میں بے شک تمام کافروں کے ساتھ ایک ہی سلوک جائز قرار دیا جاتا ہے۔

''كَذٰلِكَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِيۡنَ '' (۱۸:۷۷) اور ہم مجرموں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ ''وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ '' (۱۹:۷۷) بربادی ہے اُس روز یعنی قیامت کے روز جھٹلانے والوں کی۔ ''اَلَمۡ نَخۡلُقكُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ '' (۲۰:۷۷) خداوندِ عالم بطورِ سوال فرماتا ہے، کہ کیا ہم نے تم کو حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ ''فَجَعَلۡنٰهُ فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ '' (۲۱:۷۷) پس اُس پانی کو ہم نے ایک مضبوط جگہ میں قرار دیا۔ ''اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ '' (۲۲:۷۷) ایک مقرّرہ وقت تک۔ ''فَقَدَرۡنَا'' پس ہم نے اندازہ کیا ''فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ '' (۲۳:۷۷) سو ہم اچھا اندازہ کرنے والے ہیں۔ ''وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ '' (۲۴:۷۷) بربادی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کی جب کہ قیامت ہوگی۔ ''اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا '' (۲۵:۷۷) کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا ہے؟ ''اَحۡيَآءً وَّاَمۡوَاتًا '' (۲۶:۷۷) جو کہ وہ زندوں کو بھی اور مردوں کو بھی سمیٹی ہوئی ہے یعنی اِس کے دو پہلو ہیں، ظاہر میں دیکھا جائے تو یہ زمین ہے جس نے زندوں کو اپنی سطح کے اُوپر رکھا ہے اور مردوں کو اپنے پیٹ میں دبا لیا ہے، اس طرح رُوحانیت کی زمین ہے یعنی انسان

کی شخصیت ہے، اُس میں زندہ رُوحیں بھی ہیں اور مردہ رُوحیں بھی ہیں، آپ کو اِس قول سے شاید تعجّب ہو لیکن آپ حضرات سائنس کو جانتے ہیں کہ انسان کی اِس شخصیت کے اندر ایک (cell) ہے، تو اُس (cell) کے اندر ہزاروں کی تعداد سے ذرّات ہیں رُوح کے، اسی طرح پورے بدنِ انسانی میں کھربوں سے بھی زیادہ رُوحیں موجود ہیں، اِن رُوحوں میں سے زندہ رُوحیں ہیں، اور مردہ رُوحیں ہیں، اور نیم مردہ رُوحیں ہیں، اور خوابیدہ رُوحیں بھی ہیں، اِس معنیٰ میں انسان کی شخصیت کو تاویل کی زبان میں زمین قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ زمین نے زندوں کو اور مردوں کو سمیٹ لیا ہے۔

''وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ وَّاَسْقَيْنَاكُمْ مَّآءً فُرَاتًا''(۷۷:۲۷) اور ہم نے زمین پر پہاڑ بنا دیئے ہیں جو بلند ہیں اور جو اٹل ہیں یعنی ہلتے نہیں ہیں، اور ہم نے تم کو میٹھا پانی پلایا۔ اِس کے بھی دو پہلو ہیں، ظاہر میں یہ پہاڑ ہیں جو زمین پر کھڑے ہیں، بلند پہاڑ جو اٹل ہیں ہلتے نہیں ہیں اور میٹھا پانی اُس میں سے صاف ستھرا پانی آتا ہے چشموں کا پانی، ندیوں کا پانی اور پانی کے ذخائر پہاڑوں میں ہیں کہ اُس کی بلندیوں پر برف کے ذخیرے ہیں، گلیشیرز ہیں اور چشمے ہیں، ندیاں ہیں اور بارش کا پانی ہے اور تمام تر پانی جو پہاڑ سے آتا ہے، صاف ہوتا ہے، وہ گندہ نہیں ہوتا ہے، ستھرا ہوتا ہے اور میٹھا ہوتا ہے یہ ظاہری بات ہوئی۔ اب اِس کی تاویل یہ ہے کہ پہاڑوں سے حجّت اور پیر درجے کے افراد مراد ہیں اور حجّت کی بات چلی، تو میں آپ کو بتاؤں کہ حجّت کیسا درجہ ہے؟ ناطق جو پیغمبر کا ٹائٹل ہے اُس کے زمانے میں ایک اساس یعنی علیؑ جیسے امام کو اساس کہا جاتا ہے، تو وہ مولا علیؑ، آنحضرتؐ کے حجّت تھے اور مولا علیؑ کے لئے کوئی امام حجّت تھے اور امام کے لئے پیر درجے کا کوئی حجّت ہوتا ہے تو یہ حجّت کے تین درجے ہوتے ہیں، تین درجے کے حجّت ہوتے ہیں۔ ایک بہت بڑا حجّت پیغمبر کے لئے ہوتا ہے، وہ ایسا امام ہوتا ہے جو نبوّت سے چارج لیتا ہے دین کا، دین کے اقتدار کو سنبھالتا ہے، جیسے آنحضرتؐ کے دَور میں مولا علیؑ تھے اور آدمؑ کے دَور میں مولانا ہابیلؑ تھے اُن کو شہید کیا گیا پھر اُن کی جگہ پر مولانا شیثؑ کو حجّت اور وصی اور امام قرار دیا گیا، تو اسی طرح ہر بڑے پیغمبر کے زمانے میں جو حجّت ہوتا ہے وہ ایک عظیم امام ہوتا ہے اور پھر اساس کا جو حجّت ہوتا ہے وہ ایک امام ہوتا ہے اور امام کا جو حجّت ہوتا ہے وہ ایک پیر ہوتا ہے، گو کہ آج کل دَورِ قیامت ہے، اِس میں البتہ حدود کے بارے میں، حدود کو اِس زمانے کے مطابق ماننا ضروری نہیں ہے لیکن زمانۂ ماقبل کے مطابق حدود تھے۔

چونکہ ہمارے پاس، اسماعیلیوں کے پاس (literature) کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے، اُس (literature) کے مطابق ہمیں اصطلاحات کی ضرورت پڑتی ہے، اُن (literature) میں جانے کے لئے اِن اصطلاحات کی ضرورت ہوتی ہے، جاننا ہوتا ہے، تو بہرحال یہاں جن پہاڑوں کا ذکر چلتا ہے وہ حجّت ہیں، اب حجتوں کو پہاڑ کیوں قرار دیا گیا؟ کس معنیٰ میں؟ دیکھیں! کہ پہاڑ جس طرح سے آسمان سے قریب ہیں جب بارش برستی ہے، تو زمین سارے پانی کو نہ تو جذب

کرسکتی ہے نہ اُسکا ذخیرہ کرسکتی ہے، بس جتنا پانی زمین کے اندر جذب ہوگیا جذب ہوگیا اور باقی جو پانی ہے وہ گزر جاتا ہے، مگر پہاڑ اِس کے برعکس عمل کرتے ہیں، وہ کیا کرتے ہیں کہ وہاں پہاڑ جو ہیں اُن میں ٹھنڈک ہے لہٰذا وہاں پر اکثر بارش کی جگہ پر برف پڑتی ہے، جب برف پڑتی ہے، تو برف کا ذخیرہ بن جاتا ہے اور وہاں پر گلیشیرز ہیں، یخ بستہ پہاڑ ہیں، تو اِس کے علاوہ عظیم پہاڑوں کے اندر ایسے جوف ہیں یعنی خالی جگہ ہیں کہ اُن میں پانی بھر جاتا ہے اور اِس میں سے چشمے بنتے ہیں اور برف اور گلیشیر اور ندی نالوں کی صورت میں جو بارش کا پانی ہے، جو آسمان برساتا ہے اُس کو پہاڑ سنبھالتے ہیں اور بتدریج (gradually) اِس پانی کو، پانی کے ذخیرے کو میدانی علاقوں کی طرف چھوڑتے ہیں۔ بالکل اسی طرح سے جو حدود ہیں، مثلاً اساس، امام اور پیر، وہ رُوحانیت کی تمام بارش کو اپنی ذات کے اندر ٹھنڈا کر کے اُس کا ذخیرہ کر لیتے ہیں، چشموں کی طرح، برف کے ذخیروں کی طرح اور گلیشیروں کی طرح اور پھر رفتہ رفتہ اِس ذخیرے میں سے مریدوں کی طرف پانی کو، علم کے پانی کو چھوڑتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُن کا جو پانی ہوتا ہے بڑا میٹھا ہوتا ہے، یعنی وہ آلودہ نہیں ہوتا ہے، مکدّر نہیں ہوتا ہے، اِس کے برعکس کہ کوئی میدانی علاقوں میں دُور کسی ندی کا پانی آتا ہے یا دُور کسی نہر کا پانی آتا ہے، تو اُس میں شک ہوتا ہے، وہ مکدّر ہوتا ہے، ناصاف ہوتا ہے، کہیں کوئی غسل خانے کا پانی اُس میں گرتا ہے، کہیں کسی باغ سے گزر کر پانی گرتا ہے، کہیں اُس میں سے مویشی پانی پیتے ہیں وغیرہ، تو یہ کیا مثال ہے؟ یعنی رُوحانی علم کو اساسوں نے، اماموں نے، پیروں نے جو سنبھالا وہ بڑا صاف اور ستھرا رہا، اِس کے برعکس جو اہلِ ظاہر کی روایات سے جو علم آتا ہے وہ آلودہ ہوا ہوتا ہے، تو خداوندِ عالم دو قسم کے پانی کے صاف ہونے کی ضمانت لیتا ہے۔

ایک یہ کہ جب آسمان سے پانی برستا ہے اُس کے متعلق کہتا ہے کہ: ''وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا'' (۲۵:۴۸) اور ہم نے آسمان سے صاف صاف پانی برسایا۔ یہ اُس علم کی مثال ہے یا تو نبوّت کے زمانے میں وحی کے طور پر یا امامت کے دَور میں ہدایت کے طور پر جو علم ملتا ہے وہ بارش کے پانی کی طرح ہے، اور یہ وہ ہدایت ہے جو عام جماعت کو ملتی ہے، اور دوسرا وہ پانی ہے جو پہاڑوں میں ہوتا ہے، تو اِس میں علمِ لدنّی اور علمِ تائید ہے جو اساس، امام اور پیروں کے توسّط سے یہ علم چلتا ہے، تو یہاں پر پہاڑوں کا ذکر آیا تھا اور اُن پہاڑوں کے پانی کے صاف اور میٹھے ہونے کا ذکر ہوا تھا۔ پھر وہی خداوندِ عالم کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے کہ: ''وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ'' (۷۷:۲۸) بربادی ہے جھٹلانے والوں کی اُس روز جب قیامت برپا ہوگی ''اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ'' (۷۷:۲۹) اُن مجرمین سے فرمایا جاتا ہے، کہ تم نے دنیا میں جس چیز کو جھٹلایا تھا اب ذرا جا کے اُس کو دیکھو، تم نے دنیا میں جس چیز کو جھٹلایا تھا اب جا کے دیکھو، کیا وہ تمہارے کہنے کے مطابق جھوٹی ہے، کیا وہ سچّی ہے۔ یہ بھی خدا کے قانون میں ضروری ہوتا ہے کہ مجرمین نے دنیا میں جس چیز سے انکار کیا ہے اُس چیز کو قیامت کے دن ان کے سامنے لا کر دکھایا جائے گا، اگر

لوگوں نے قرآن کو جھٹلایا ہے، تو قرآن کی عظمت اُن پر ظاہر کی جائے گی، اگر لوگوں نے امام کو جھٹلایا ہے یا پیغمبر کو جھٹلایا ہے، تو اُس پر پیغمبر اور امام کی شان، عظمت ظاہر کی جائے گی، کیونکہ قیامت کا جو دن ہے وہ تصفیہ کے لئے ہے، دکھانے کے لئے، عدل کے لئے ہے اور سزا کے لئے، جزا کے لئے ہے۔

''اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ''(۳۰:۲۲) تم اب ایک ایسے سائے کی طرف چلو جس کی تین (branches) ہیں، تین شاخیں ہیں، ایک سایہ ہے، اور جس کی تین شاخیں ہیں، اُس کی طرف چل کے دیکھو، اِس کی تاویل خداناشاسی، پیغمبر ناشاسی اور امام ناشاسی ہے، کہ جس طرح قرآن حکم دیتا ہے کہ: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ''(۵۹:۴) یہی تین درجات ہیں اور اِن کی شناخت ضروری ہے اور جو لوگ اِن تین درجات کو نہیں پہچانیں گے، اِن کی اطاعت نہیں کریں گے، تو اِن کے لئے قیامت کے دن تین سائے ہوں گے، ایک خدا کو نہ پہچاننے کا سایہ یعنی تاریکی، پیغمبر کو نہ پہچاننے کا سایہ اور امام کو نہ پہچاننے کا سایہ، اِن سایوں کی طرف اُن کو لے جایا جائے گا۔ ''لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ''(۷۷:۳۱) لیکن تم ایسا نہیں سمجھنا کہ یہ راحت کے سائے ہیں، جس طرح اِس کے برعکس کچھ دوسرے سائے بھی ہیں اُن کی تو تعریف کی گئی ہے، یہ تو صرف تاریکی کے لئے ہیں، اِس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ ''لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ'' اِس میں تمہارے لئے سکون کا سایہ تو نہیں ہے اور نہ اِس میں ایسی ٹھنڈک ہے کہ آگ سے تم کو بچایا جائے۔

''اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ''(۷۷:۳۲) دوزخ ایسی چیز ہے کہ اُس کے شرارے یا اُس کی چنگاریاں محلات کی طرح نکلتی ہیں۔ ''كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ''(۷۷:۳۳) وہ زرد اونٹوں کی طرح ہیں، یہاں پر اِس کی بھی تاویل ہے وہ یہ کہ جس روشنی کا ہم نے ذکر کیا تھا، رُوحانیت کے ابتدائی مرحلے میں، تو وہ روشنی اِس لئے ہے، اُس روشنی کے دو مقصد ہیں، ایک مقصد تو یہ ہے کہ وہاں سے شیاطین کو آگے نہ جانے دے، آسمان کی طرف پرواز کرنے سے اُن کو روک دیا جائے، لہٰذا وہ شعلوں کی صورت میں وہ روشنی، وہ آگ اُن کی طرف آتی ہے، تو یہاں جو اشارہ ہے اُس مقام کی طرف ہے اور اُس روشنی کی طرف ہے، اُس روشنی کے ہوتے ہوئے کوئی بھی شیطان، کوئی بھی اہلِ باطل رُوحانی آسمان کی طرف پرواز نہیں کرسکتا ہے۔ [''وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ''(۷۷:۳۴) بربادی ہے جھٹلانے والوں کی اُس روز جب قیامت برپا ہوگی]

''هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ''(۷۷:۳۵) یہ وہ دن ہے جس میں تم کو بولنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ ''وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ''(۷۷:۳۶) اور اُن کے لئے اذن نہیں ہے کہ کچھ عذرخواہی کریں۔ ''وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ''(۷۷:۳۷) بربادی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لئے۔ ''هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ'' یہ جدائی کا دن ہے

اور یہ فیصل کا دن ہے ''جَمَعْنَاكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ''(۷۷:۳۸) ہم نے تم کو جمع کیا اور تم سے پہلے جو لوگ گزرے تھے اُن کو بھی تمہارے سامنے لایا تا کہ تم دیکھو کہ خدا کی کیا قدرت ہے۔''فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ '' (۷۷:۳۹) اگر تمہارے پاس کوئی حیلہ ہے، کوئی مکر ہے تو میرے خلاف کر کے دیکھو، یہ خدا کا اعلان ہے۔''وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ''(۷۷:۴۰) اُس روز جھٹلانے والوں کی تباہی ہے۔''اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلَالٍ وَّعُيُوْنٍ '' (۷۷:۴۱) بے شک اُس روز پرہیز گار لوگ سایوں میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے۔ اُس روز جو مومنین ہیں، جو پرہیز گار لوگ ہیں وہ سایوں میں ہوں گے، راحت کے سایوں میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے۔ سایہ سے اجسام، اجسامِ لطیف اور اجسامِ کثیف مراد ہے، اِس جسم کو سایہ کہا گیا ہے اور ''عُيُوْنٍ ''یعنی چشموں سے ایسے کلمات مراد ہیں علم کے کہ جن میں سے ہمیشہ علم کی ندیاں، علم کی نہریں بہتی رہتی ہیں، رُوحانی علم کے (sources)، اُن کو یہاں ''عُيُوْنٍ ''کہا گیا، کیونکہ ہم دنیا میں ہوتے ہوئے جسمانی غذاؤں کی لذّتوں کو محسوس کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ جنّت کی جو لذّتیں ہیں وہ بھی ایسی ہی محدود ہیں، کہ جنّت کی لذّتیں عقلی ہیں اور علمی ہیں اور پھر رُوحانی ہیں، اُس کے بعد البتہ لطیف جسمانی قسم کی لذّتیں ہیں، تو تین قسم کی لذّتیں پائی جاتی ہیں، بہشت میں۔ سب سے اعلیٰ لذّتیں جو ہیں وہ عقلی اور علمی صورت میں ہیں، اُس کے بعد جو لذّتیں ہیں وہ رُوحانی صورت میں ہیں، اُس کے بعد جو لذّتیں ہیں وہ لطیف جسمانی لذّتیں ہیں یہ جسم نہیں! ایک اور جسم ہے، اُس کو کوکبی بدن کہا جاتا ہے، اُس کو (austral body) کہا جاتا ہے، وہ بہشت میں ملے گا۔

''وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ''(۷۷:۴۲) اور پھل ہیں جو وہ چاہتے ہیں، تو یہ عقلی غذاؤں کا نام بھی پھل ہے، مثلاً ایسا علم جو (summary) کے طور پر، جو خلاصے کے طور پر ہوتا ہے، جس میں بہت کچھ علم سمویا ہوا ہوتا ہے تو ایسا علم پھل کہلاتا ہے، اور اِس کے علاوہ پھل سے مراد رُوحیں ہیں، رُوحیں، رُوح پھل ہے، جسم درخت ہے، جس طرح درخت سے پھل بنتا ہے، اِس طرح انسان اِس دنیا میں آیا ہے، درخت کی طرح نشوونما پاتا ہے اور اِس میں سے رُوح کا پھل آتا ہے اور پھر عقل کا مغز اُس میں ہوتا ہے، جس طرح پھل ہے اور اُس میں مغز ہے، اِس طرح انسان کی رُوح پھل ہے اور اُس کی عقل مغز ہے، اور اسی مقصد کے لئے اِس درخت کو یہاں دنیا میں اُگایا گیا ہے۔''كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ''(۷۷:۴۳) اُن سے فرمایا جاتا ہے یعنی مومنین سے اور متّقین سے کہ تم کھاؤ پیو اُس چیز کے بدلے جو تم نے دنیا میں کیا تھا۔''اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ''(۷۷:۴۴) بے شک ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو بدلا دیا کرتے ہیں۔ احسان دو قسم کا ہوتا ہے، ایک اپنی ذات کے لئے احسان ہوتا ہے اور دوسرا دوسروں کے لئے احسان ہوتا ہے، لیکن کوئی بھی شخص جب تک اپنی رُوح کے لئے احسان نہیں کرتا ہے دوسروں کے لئے احسان نہیں کرسکتا ہے، اِس لئے احسان جو ہے وہ اپنی رُوح کے لئے ہے اور رُوح پر احسان یہ ہے کہ جس طرح رُوح خدا کے نور

کا ایک ذرّہ ہے، اِس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جس کا یہ حقدار ہے، عبادت، بندگی، علم، معرفت اور تقوی اور اخلاق کی بلندی اور دیگر انسانی صفات سے اس کو آراستہ کیا جائے، یہ پہلا احسان ہے۔ اب احسان کے بعد کوئی شخص دوسرے پر احسان کر سکتا ہے، مثلاً کوئی شخص گھر میں مفلس ہے اور خود کا کچھ بھی نہیں ہے، تو دوسروں کے لئے وہ کیا نیکی کر سکتا ہے، کیا خدمت کر سکتا ہے۔ اِس لئے سب سے پہلے اپنی رُوح پر احسان کرنا ہے، اِس کے بعد دوسروں کو ہم احسان کر سکتے ہیں، اِس احسان کی یہ تشریح ہے۔

''وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ''(۷۷:۴۵) جھٹلانے والوں کے لئے اُس دن بربادی ہے۔ یاد رہے کہ کسی بھی سورہ میں اگر ایک مقرّر آیت کو دہرایا جاتا ہے، تو اُس میں تاکید کا پہلو ہوتا ہے، جس طرح سورۂ رحمان میں ''فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ''(۵۵:۳۳) کی آیت دہرائی گئی ہے۔ ''كُلُوۡا وَتَمَتَّعُوۡا قَلِيۡلًا اِنَّكُمۡ مُّجۡرِمُوۡنَ '' (۷۷:۴۶)، اور مجرمین سے فرمایا جاتا ہے، کہ تم دنیا میں کھاؤ اور فائدہ اُٹھاؤ کچھ تھوڑا سا، کیونکہ تم مجرم ہو، تم اپنی اس مہلت سے فائدہ اُٹھاؤ۔ ''وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ''(۷۷:۴۷) اُس روز جھٹلانے والوں کی بربادی ہے۔ ''وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ ارۡكَعُوۡا لَا يَرۡكَعُوۡنَ ''(۷۷:۴۸) جب اُن سے کہا جاتا تھا کہ تم رُکوع کرو تو وہ رُکوع نہیں کرتے تھے۔ ہمارے بزرگانِ دین نے سجدہ اور رُکوع کے درمیان تاویل کا یہ فرق بتایا ہے کہ سجدہ کی تاویل پیغمبر کے لئے اطاعت اور رُکوع کی تاویل اساس کے لئے اطاعت یعنی فرمانبرداری زمانۂ نبوّت کے اعتبار سے۔ پھر زمانۂ امامت کے اعتبار سے سجدہ امام کے لئے اطاعت اور رُکوع سے مراد حجّت کے لئے یعنی پیر کے لئے اطاعت، تو یہاں پر سجدے کا ذکر نہیں ہے اور درمیان سے ایک (item) کو عبادت کے ایک (item) کو لیا ہے، ایسے میں بالکل تاویل کا امکان ہوتا ہے، کیونکہ اگر اِس [سے] یعنی نماز مراد ہوتی تو نماز کا ذکر ہونا چاہیئے اور اگر سجدے کا نام ہوتا، تو سجدہ چونکہ بہت بڑا (item) ہے، اُس سے عبادت، بندگی اور نماز بھی مراد ہوتی لیکن یہاں پر جو خالی رُکوع کا ذکر ہے، تو رُکوع، شرعی نماز کے بغیر رُکوع الگ رُکوع نہیں ہے، ایسا ناممکن ہے کہ نافرمانوں سے فرمایا جائے، کہ تم رُکوع کرو، چونکہ رُکوع جو ہے وہ بڑا (subject) نہیں ہے، تو اِس سے پتہ چلا کہ یہ تاویل ہے اور اِس میں اساس کی اطاعت کا ذکر آتا ہے کیونکہ اساس ناطق کی اطاعت کا دروازہ ہے یعنی امام اور اساس کے توسّط سے پیغمبر کی شناخت ہوتی ہے، اِس لئے امام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ''وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ''(۷۷:۴۹) بربادی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کی۔ ''فَبِاَىِّ حَدِيۡثٍ بَعۡدَهٗ يُؤۡمِنُوۡنَ ''(۷۷:۵۰) تو اِس کے بعد پھر کس چیز پر وہ ایمان لے آئیں گے۔ اِس کے بعد کسی اور چیز پر ایمان لانے کے لئے کوئی موقع نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ یعنی پچاس آیتوں کا یہ سورہ ختم ہو جاتا ہے اور آج کی گفتگو بھی ختم ہو جاتی ہے اور اِس سلسلے میں اگر کسی عزیز کو کوئی سوال ہو تو وہ پوچھا جا سکتا ہے ہم اُس کے جواب کو مہیا کرنے کے لئے کوشش

کریں گے، شکریہ۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ رُکوع کی جو تاویل ہے وہ اساس کی اطاعت ہے، قرآنِ حکیم میں اور تاریخ کی روایات میں ملتا ہے کہ مولا مرتضیٰ علیؑ نے بحیثیت اِساس کے ایک مرتبہ رُکوع کی حالت میں اپنی انگوٹھی کو پیش کیا تھا ایک سائل کے لئے، تو سر ہم اِس (demonstration) کو یا اِس (action) کی کیا امام سے اُس کی تاویل کر سکتے ہیں؟

جواب: ایک عمدہ سوال کیا اور سوال یہ کہ جہاں رُکوع کی تاویل اساس ہیں یا امام ہیں، تو کیا اِس تاویل سے اِس واقعے کی کچھ مناسبت ہے جس میں کہ مولا علیؑ نے بحالتِ رُکوع ایک سائل کو اپنی گرانقدر انگوٹھی بطورِ زکوٰۃ کے عنایت کر دی تھی، اِن کا یہ سوال ہے۔ میں عرض کروں گا کہ ہاں! اِن دونوں باتوں کے درمیان مناسبت ہے، چونکہ رُکوع کی تاویل خود امام ہیں، اساس ہیں، لہٰذا خدا کی قدرت سے ایک ایسی کیفیت میں انہوں نے زکوٰۃ دی تھی کہ وہ کیفیتِ رُکوع تھی، اور تاکہ سمجھنے والے سمجھ جائیں کہ اُس وقت وہ اپنے مرتبے پر، درجۂ اساسی پر پہنچے ہوئے تھے، اور وہ پیغمبر کے لئے اساس کا اور حجّت کا درجہ رکھتے تھے، اِس معنیٰ میں اِن دونوں باتوں کے درمیان رشتہ اور مناسبت ہے اور (symbol) کے طور پر اِس کو خداوندِ عالم نے ارشاد فرمایا ہے۔ بے شک اِس میں مناسبت ہے اور بے شک اِس میں تاویل ہے یہ کہ رُکوع یعنی مولا علیؑ کے مرتبے کو، اُس کے اساس ہونے کو اور لوگوں کی طرف یہ اشارہ ہے کہ لوگ مولا علیؑ کو رُکوع سمجھیں، تاویلی رُکوع اور اُن کی اطاعت کریں، تو اِس کا مختصر جواب یہ ہے۔

سوال: سر آسمانِ اوّل پر جو آگ کے شعلے موجود ہیں، اُن کو زرد اونٹوں سے تشبیہہ دینے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: ایک دلچسپ سوال کیا کہ آسمانِ اوّل پر جو ستارے ہیں یا جو چراغ ہیں جو نگہبانی کرتے ہیں کہ اہلِ باطل کو یا شیاطین کو آسمان کی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے سے روک دیا جائے، تو انہوں نے سوال کیا کہ اُس روشنی میں زرد رنگ کہنے کا کیا مطلب ہے اور اِس کا جواب یہ ہے کہ روشنی ہوتی ہے، اُس میں سفید رنگ اُس کو نورالانوار کہا جاتا ہے، جو اچھا رنگ ہے، اور جو زرد رنگ ہے اُس میں کمزور پہلو ہے، ہمارے بزرگانِ دین نے جو عظیم الشان کتابیں لکھیں ہیں اُن میں سے کتاب الزینہ میں شاید نور کی ہیئت وصورت کا تذکرہ فرمایا گیا ہے اور سفید نور کو نورالانوار کہا گیا ہے، روشنیوں کی روشنی، اِس کو (base) بنیاد قرار دیا گیا ہے، اور اسی طرح مختلف رنگ کی روشنی ہوتی ہے اور اِس میں جو زرد رنگ ہوتا ہے وہ کمزور ہوتا ہے، کمتر ہوتا ہے اور جیسے قرآنِ مقدّس کے ایک مقام پر ایک بیل کو ذبح کرنے کا ذکر ملتا ہے (۲:۶۷۔۷۳) اور اُس بیل کے ذبح کرنے سے قبل بنی اسرائیل سے اُس کی نشاندہی کی جاتی ہے، جبکہ وہ پوچھتے ہیں کہ کس قسم کے بیل کو ہم ذبح کریں، تو خداوندِ عالم زبانِ قدرت سے موسیٰ کے (through) اُن کو بتاتا ہے کہ دیکھو وہ ایک ایسا بیل ہے کہ اُس کا رنگ زرد ہے اور پھر بھی جو دیکھیں، تو اُس سے خوش ہو جائیں۔ اُس کی کئی تاویلیں ہیں اُن میں سے ایک تاویل نفس

امّارہ کی ہے کہ نفس امّارہ کی جب تحلیل ہوتی ہے، تو اُس کا رنگ، روحِ حیوانی کی تحلیل سے اُس کا رنگ زرد ہوتا ہے، اور اِس سلسلے میں، رنگوں کے سلسلے میں مولائے روم نے بھی مثنوی کی کتاب میں کچھ روشنی ڈالی ہے، اُس نے زرد رنگ کی کچھ تعریف نہیں کی ہے، بہرحال وہ جو روشنی سامنے آتی ہے اُس کی تشبیہہ دی گئی ہے، اُس کی ضخامت اور جسامت کے اعتبار سے محلات کی طرح اُس کی چنگاریاں بڑی بڑی ہیں اور زرد اُونٹ کی طرح یعنی اُس کے اجزاء سامنے آتے ہیں، تو اُس کی تشبیہہ دی گئی ہے اور وہ بے شک روشنی ہے، اور اُس چیز کے دو پہلو ہیں، نور بھی ہے اور نور نار بھی ہے، نار نور بھی ہے اور نار نار بھی ہے، دیکھیں کہ خداوندِ عالم نے کبھی تو اُن کو چراغ کہا، کبھی ستارے کہا، تو پھر کہا کہ زینت ہے، پھر کہا کہ ایک طرف سے زینت تو ہے اُن سے آسمانِ اوّل کو لیکن ساتھ ساتھ یعنی شیاطین کو مار بھگانے کے لئے بھی وہ مقرّر ہے، اور یہ ہے بڑا دلچسپ سوال تھا اور ایک طرح سے اِس کا جواب مہیّا کیا گیا۔

سوال: سر جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ منکرین کے جھٹلانے کی جو سزا دی گئی تھی، وہی سزا اُن کے بعد کے منکرین کے جھٹلانے کی ہے، تو سر جنہوں نے کھلم کھلا پیغمبر کی ذات سے یا خدا کی ذات سے انکار کیا، جن کو ہم کفّار کہتے ہیں، کیا اُن کی سزا اور جو صرف پیغمبر کی امّتی ہوں اور امام کو جھٹلائیں تو اُن کی سزا برابر ہوگی؟

جواب: اِن کے سوال کو جو اچھا ہے اور مفید ہے، جس حد تک میں نے (catch) کیا ہے، چونکہ آپ ذرا نرمی سے گفتگو فرماتی ہیں اور میں دُور تک اچھی طرح سے نہیں سُن پاتا ہوں اور میں نے جس طرح سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جن منکرین کو سزا دی گئی تھی، زمانۂ سلف میں، انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا تھا اور اگر کچھ لوگ امام کو جھٹلاتے ہیں۔ یہ سوال علم کے لحاظ سے مشکل نہیں ہے، (policy) کے لحاظ سے مشکل ہے اور بہرحال خدا کا معاملہ ہے اور خدا کے معاملے میں جو بھی انکار کرتا ہے، تو اُس کو سزا ملتی ہے بلکہ سب سے تفصیلی اطاعت امام کی ہے۔ دیکھیں کہ جو اطاعت ہم تک پہنچی ہوئی ہے وہ امام کی اطاعت ہے، رسول کی اطاعت اِس کے بعد ہے، خدا کی اطاعت اُس کے اُوپر ہے، ایک طرح سے دیکھا جائے، جب نیچے سے ہم اُوپر کی طرف سفر کریں، لہٰذا امام کی اطاعت بہت ہی ضروری ہے لیکن میں جانتے ہوئے اور اِس میں کچھ تفصیل کرنا نہیں چاہتا ہوں چونکہ دعوت یا کہ درس کی کچھ (policy) بھی ہوتی ہے، لہٰذا میرے مطلب کو آپ نے سمجھ لیا ہوگا، اور اِس لیے میں اِس کو اختصار سے جواب دیتا ہوں، شکریہ۔

سس

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ یوسف کی تاویلات

کیسٹ نمبر: Q-33 تاریخ: ۲۸/اپریل/ ۱۹۸۳، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آج آپ عزیزوں کے سامنے سورۂ یوسف کی کچھ حکمتیں بیان کرنے کے لئے کوشش کی جاتی ہے۔ سورۂ یوسف قرآنِ مقدّس کی بارہویں سورت ہے، اِس سورہ میں بہت سی حکمتیں ہیں یعنی یہ سورہ اعلیٰ درجے کی تاویلات سے بھرپور ہے، اِس لئے اِس سورۂ مقدّسہ کی کچھ تاویلی حکمتیں بیان کی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے آیت نمبر ایک میں، سورۂ یوسف کے آغاز میں حروفِ مقطعات آتے ہیں اور وہ ہیں: ''الٓـر'' اُس کے بعد ارشاد ہے: ''تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ'' (۱۲:۱) تو ''الٓـر'' کے معنی ہیں عقلِ کُلی، نفسِ کُلی اور رقیم یعنی رُوحانی تحریر۔ دوسرے الفاظ میں الف سے قلمِ اِلٰہی مراد ہے، لام سے لوحِ محفوظ مراد ہے اور را سے رقیم یا مرقوم یعنی تحریر مراد ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے قلم نے جس کا دوسرا نام عقلِ کلی ہے، لوحِ محفوظ پر آیاتِ خداوندی درج کیں، تو تین چیزیں ہوگئیں، ایک یہ کہ قلم دوسری چیز لوحِ محفوظ اور تیسری چیز اِس لوحِ محفوظ پر جو کچھ لکھا گیا، وہ قلم اور لوح کا فعل ہے یا نتیجہ ہے، تو یہی تین آیات ہیں جن میں دیگر تمام آیتیں جمع ہوجاتی ہیں اور یہ تین آیتیں اپنی ذیلی آیتوں کے ساتھ کتابِ مبین کی آیتیں ہیں۔ کتابِ مبین سے بولنے والی کتاب مراد ہے اور بولنے والی کتاب رُوحانیت ہے جو امام کا نور ہے جو ناطق اور اساس کا نور ہے جو قرآن کی رُوح ہے۔ مبین کے اہم معنی دو ہیں، ایک مبین کے معنی ہیں ظاہر، ایک مبین کے معنی ہیں بیان کرنے والا یا بیان کرنے والی۔ یہاں ''الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ'' (۱۲:۱) کا مطلب ہے بولنے والی کتاب، بیان کرنے والی کتاب اور قرآن اِسی کا ایک عکس ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر آیتیں تین ہیں جو دیگر تمام آیات کا سرچشمہ ہیں، ایک تو قلمِ اِلٰہی ہے یعنی عقلِ کُلی اور دوسری آیت لوحِ محفوظ ہے جو نفسِ کُلی ہے اور تیسری خدا کی بنیادی آیت رقیم ہے یعنی تحریر ہے، رُوحانی تحریر جو قلمِ اِلٰہی اور لوحِ محفوظ کا نتیجہ ہے، رقیم کا ذکر قرآن میں سورۂ اصحابِ کہف (۱۸:۹) میں بھی آتا ہے، اور یاد رہے کہ ''الٓـمّٓ'' کا جو مطلب ہے وہی ''الٓـر'' کا ہے۔ وہی مطلب ''الٓـر'' کا بھی ہے، تو اِس میں جو فرق ہے وہ آخری حرف کا فرق ہے، کہ وہاں پر میم ہے اور یہاں پر را ہے اور یہ بات بھی، یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ اُونچے حقائق

کے کئی نام ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ جس حقیقت کا نام قرآن کے شروع میں ''الٓمٓ'' میں، سورۂ بقرہ کے آغاز میں جس حقیقت کا نام میم ہے، یہاں اُسی حقیقت کا نام را ہے، اِس لئے ''الٓمٓ'' کی جو تاویل ہے وہی تاویل ''الٓرٰ'' کی بھی ہے۔ تو خداوندِ عالم کا یہ فرمانا کہ یہی تین چیزیں بولنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ اِس سے یہ مراد ہے کہ بنیادی طور پر، (source) کے طور پر، سرچشمہ کے طور پر تین آیتیں ہیں خدا کی، اور اِن ہی تین آیتوں سے سب آیات ظہور میں آتی ہیں یا ساری آیتوں کا وُجود بن جاتا ہے۔

یہاں پر ایک اور نکتہ قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ خدا فرماتا ہے کہ: ''سُبۡحَانَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ''(۳۶:۳۶) پاک ہے وہ ذات جس نے چیزوں کے تمام جوڑوں کو پیدا کیا یعنی چیزوں کے جوڑے پیدا کئے اور جوڑے کے بغیر کوئی چیز نہیں ہے اور صرف ایک ذات ہے جو اِس بات سے، اِس اُصول سے یا جوڑوں کے قانون سے برتر ہے، وہ ذاتِ سبحان ہے، باقی اُس کی خدائی میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب جوڑوں میں ہیں۔ چنانچہ قلمِ الٰہی اور لوحِ محفوظ یہ ماں باپ کی طرح ہیں، یہ جفت ہیں، یہ ایک جوڑا ہیں، اِن ہی سے آیاتِ خداوندی ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی جنم پا چکی ہیں، تو یہ انسان کے مقام پر جس طرح ماں باپ ہیں اِسی طرح قلمِ الٰہی اور لوحِ محفوظ ہیں، اِس لئے حکماء نے جفتِ بسیط کہا، عقلِ کُلی کو مرد کا مذکر کا درجہ دیا اور نفسِ کُلی کو مؤنّث کا درجہ دیا اور یہ دونوں آپس میں گویا ایک جوڑا ہیں، جفتِ بسیط ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں اور اِن سے جو چیز جنم پاتی ہے آیت کے طور پر معجزے کے طور پر تو یہ سب آیات ہیں۔ ویسے تو آیتیں بہت ہیں لیکن وہ سب آیتیں اِن میں جمع ہو جاتی ہیں تو جس طرح انسان کے ماں باپ کو اور خود انسان کو انسان کہا جاتا ہے یا بشر کہا جاتا ہے، اِسی طرح قلم کو، لوح کو اور اِن دونوں کی تحریر کو آیت کہا گیا۔ قلم پہلی آیت ہے، لوح دوسری آیت ہے اور اِن دونوں کے نتیجے میں جو کچھ رُوحانی طور پر پایا جاتا ہے، وہ تیسری آیت ہے اور اِن ہی تین بنیادی آیتوں میں تمام آیتیں جمع ہیں۔ یہاں پر یہ ذکر بھی کرتے چلیں کہ آیت کا کیا مطلب؟ آیت کے معنی نشانی، آیت کا مطلب معجزہ اور معجزہ کے معنی ایسا کام جس کو خدا اور رسول یا امام کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، وہ معجزہ ہے۔ کیونکہ معجزہ وہ چیز جو انسانوں کو عقلی طور پر عاجز کرے وہ معجزہ ہے، معجزہ! تو یہ تین آیات ہیں بولنے والی کتاب کی، تو بولنے والی کتاب کے بارے میں بتایا کہ یہ رُوحانیت ہے جو قرآن کی رُوح ہے جو ناطق اور اساس کا نور ہے یعنی زمانے کے امام کا نور، وہی بولنے والی کتاب ہے، وہ خود بولتی ہے۔

نمبر ۲ آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اُس کو عربی قرآن بنایا، عربی قرآن کی حیثیت سے نازل کیا تا کہ تم سمجھ سکو (۲:۱۲)۔ اِس آیت میں ایک بہت بڑا سوال اور بہت اہم سوال سامنے آتا ہے، وہ سوال یہ ہے، اگر تسلیم کیا جائے کہ یہ آیت اہلِ عرب سے متعلق ہے کیونکہ اِس میں ارشاد ہوتا ہے، کہ خداوندِ عالم نے قرآن کو عربی میں نازل کیا تا کہ وہ عرب کے

مسلمان اُس کو سمجھ پائیں، ایک طرح سے یہ صحیح بھی ہے، تو اِس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن اِس لئے عربی میں نازل ہوا تا کہ اہل عرب اِس کو سمجھ سکیں، تو اِس (logic) سے دوسرے سب مسلمان قرآن سے اور اِس خطاب سے مستثنیٰ یا (separate) یا الگ ہو گئے۔ کیونکہ خدا نے قرآن کو عربی میں اِس لئے نازل فرمایا ہے کہ اہلِ عرب کے لئے کوئی دشواری نہ ہو، اُن کی مادری زبان میں اللہ کی کتاب موجود ہے تو وہ اُس کو سمجھیں، تو پھر خدا کا مقصد اور دعوت کی غرض محدود ہوگئی، عرب اور عربی زبان عربوں تک اور عرب کے ملک تک اِس کا مقصد محدود ہوگیا اور جو عربی کو نہیں سمجھتے ہیں وہ اس سے الگ ہو گئے۔ اِس کا حل، اِس کا جواب اور اِس کی حکمت اور تاویل کیا ہو سکتی ہے۔

عرض یوں ہے کہ عربی اور عجمی، یہ دو اصطلاحیں ہیں۔ عربی سدیشی کو کہتے ہیں اور عجمی بدیسی کو کہتے ہیں یعنی دیسی اور غیر دیسی، عربی کا مطلب دیسی، ملکی، مقامی اور مادری زبان سے متعلق اور عجمی غیر عربی جو دیسی نہ ہوں جو اہلِ زبان نہ ہوں۔ اِس (sense) میں اِس آیت کے مرادی معنی یوں ہیں کہ خدا فرماتا ہے کہ اُس نے رُوحانی قرآن کو جو ابھی ابھی اگلی آیت میں جس کا ذکر ہوا، مومنین کی مادری زبان میں نازل کیا تا کہ اِس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو، تو یہ رُوحانی قرآن کی بات بن گئی۔ کیونکہ ابھی ابھی ہم نے بتایا تھا کہ قرآنِ مبین کا مطلب رُوحانیت، قرآن کی رُوح محمدؐ و علیؑ کا نور یعنی حاضر امام کا نور، تو وہ نورِ ہدایت جو باطن میں ہے جو رُوحانیت میں جو قرآن کی رُوح کی حیثیت سے ہے، وہ عجمی نہیں ہے عربی ہے یعنی سدیشی ہے بدیشی نہیں، اپنی زبان میں ہے تا کہ تم اِس کو سمجھ سکو، تو کتنی شاندار حکمت ہے اور خدا کا انتظام، نظامِ ہدایت کس طرح اور کس قدر ہمہ گیر اور ہمہ رَس ہے کہ اِس سے لوگ لاجواب ہو سکتے ہیں، اُن کے پاس کوئی جواب نہیں، کوئی گلہ نہیں، کوئی عذر نہیں، کوئی شکایت نہیں کہ خداوندِ عالم نے مقامِ رُوحانیت پر قرآن کو ایسا بنایا ہے، ایسا اُتارا ہے کہ وہ دنیا بھر کے لوگوں کی زبان میں ہے جو بھی مومن ہے جو بھی رُوحانیت سے رَسا ہو جائے گا، اُس کی زبان میں، مادری زبان میں قرآن وہاں پر موجود ہے، یہ عربی کا مطلب یوں ہے اور اِس کے معنی کا تعین اُس وقت صحیح ہوتا ہے کہ ہم اِس کے ساتھ ساتھ (opposite) میں عجمی اور عربی دونوں کے مطلب کو ایک ساتھ سمجھیں، جس طرح میں نے معلوم نہیں سدیشی اور بدیشی کے لفظ کو معلوم نہیں ہندی ہے یا سنسکرت ہے کو استعمال کیا، تو یہ ہے مقامِ رُوحانیت پر کتابِ مبین اور امامِ مبین۔

تو ایک نکتہ اور بھی یہاں پر ہے کہ بعض دفعہ قرآن میں امامِ مبین آتا ہے (۳۶:۱۲) بعض دفعہ کتابِ مبین آتا ہے، تو کتاب اور امام اگر الگ بھی تسلیم کریں تو مبین کا جو لفظ ہے وہ ایک ہے، تو اِن دونوں کے آپس میں مبین کا رشتہ جو ہے اُس کو جاننا چاہئے، مبین کے رشتے کو جاننا چاہئے۔ امامِ مبین بولنے والا امام اور ظاہری امام بھی اور کتابِ مبین بولنے والی کتاب، وہی امام، امام کتابِ مبین ہے اور کتاب امامِ مبین ہے، جیسے میں نے کہا کہ رُوحانیت میں محمدؐ و علیؑ اور حاضر امامؑ کا نور ایک ہے اور قرآن کی رُوح بھی وہی ہے، آسمانی کتاب بھی وہی ہے، تو یہ ہے کس طرح کوئی شخص قرآن سے (approach)

کرسکتا ہے تا کہ تم سمجھ سکو۔ جب خدا کے نزدیک یہ مقصد ہے، کہ لوگ سمجھیں تو اِس کے لئے قرآن کو ایسا نازل کیا گیا ہے، کہ وہ دنیا بھر کے لوگوں کی زبان میں ہے مقامِ رُوحانیت میں۔

تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ قرآن ''اَحْسَنَ الْقَصَص'' ہے اور خدا چاہتا ہے کہ اُس ''اَحْسَنَ الْقَصَص'' کو بیان کرے (۱۲:۳)۔ بہترین قصہ، سب سے بہترین قصہ ہے قرآن کس معنیٰ میں؟ سب سے بہترین قصہ کئی پہلوؤں سے، اور ایک پہلو یہ بھی کہ قرآن مقامِ رُوحانیت پر ہر زبان میں ہے، یہ اُس کا معجزہ ہے، یہ اُس کے مختلف رُوپ ہیں، یہ اُس کے (manifestations) ہیں، ظہورات ہیں کہ وہ مختلف زبانوں میں سامنے آتا ہے، یہ نور ہے، یہ نور کا کام ہے، یہ قرآن کی رُوح کا کام ہے، یہ محمدؐ و علیؑ کے نور کا کام ہے، نورِ ہدایت کا کام ہے کہ اُس کے مختلف ظہورات ہوں۔ اِس لئے یہ ''اَحْسَنَ الْقَصَص'' ہے، بہترین قصہ ہے، اُس میں تاویل ہے، اُس میں حکمت ہے، اُس میں مذہب کی تاریخ ہے، اُس کے ہر لفظ میں بہت سے معنیٰ ہیں، اُس کے الفاظ جامع ہوا کرتے ہیں لہٰذا وہ ''اَحْسَنَ الْقَصَص'' ہے، بہترین قصہ ہے قرآن کا اور خداوندِ عالم نے حضورِ اکرم ﷺ پر اِسی شان سے قرآن کو نازل فرمایا اور اِس قرآن کے نزول سے قبل حضورؐ اِس سے ناواقف تھے، اِن معجزات سے، اِن آیات سے، اِن قوانین سے ناواقف تھے۔

چوتھی آیت سے یوسفؑ کا قصہ شروع ہوجاتا ہے۔ فرمایا جاتا ہے کہ ایک وقت تھا کہ یوسفؑ نے اپنے باپ یعقوبؑ سے کہا کہ ابا جان میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو خواب میں دیکھا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یہ سب مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں (۱۲:۴)۔ یوسفؑ نے اپنے پدرِ بزرگوار سے کہا کہ اے میرے باپ! میں نے دیکھا کہ گیارہ ستارے سورج اور چاند میرے لئے سجدہ کر رہے ہیں، میں نے اِس حالت میں دیکھا۔ باپ فرماتے ہیں، کہ اے میرے بیٹے! تم اپنے بھائیوں سے اِس اپنے خواب کا ذکر نہیں کرنا اور اگر تم نے اِس کا ذکر کیا تو تم کو کسی آفت میں پھنسانے کی تدبیر کریں گے، کیونکہ شیطان انسان کے لئے ظاہری دشمن ہے (۱۲:۵) یہ فرمایا جاتا ہے، تو سب سے پہلے یہ کہ یوسفؑ نے یہ خواب دیکھا اور جہاں قرآن میں ایسے خواب کا ذکر آتا ہے، تو اِس خواب کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے اور پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا جاتا ہے والدِ بزرگوار کی طرف سے کہ وہ خواب بہت ہی عظیم ہے، اِس لئے تم اپنے بھائیوں سے اِس کا ذکر نہیں کرنا اور اگر تم نے کہیں اِس کا ذکر کر دیا تو وہ تم کو کسی آفت میں پھنسانے کی تدبیر کرنے لگیں گے کیونکہ شیطان انسان کے لئے ظاہر دشمن ہے، یہ باتیں ایسی ہیں کہ اِن میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اوّل یہ کہ گیارہ ستارے کی کیا تاویل ہے اور سورج کا کیا مطلب ہے، چاند سے کیا مراد ہے اور یوسفؑ کون تھے اور کیا بننے والے تھے، اُن کے والد کیا تھے۔ یاد رہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر آ کر امامت کی دو شاخیں بن گئیں، اسماعیل علیہ السلام بڑے تھے اور اسحٰق علیہ السلام چھوٹے بھائی تھے۔ اسماعیلؑ کی قربانی کی تاویل اُن کی رُوحانی قربانی ہے اور بعض کتابوں میں اسحٰقؑ کی

قربانی کا ذکر ہے، اُس کی کوئی وجہ ہے وہ یہ کہ ہمارے بزرگانِ دین کی ریسرچ کے مطابق، رُوحانی ریسرچ کے مطابق جو امام کے نور کی روشنی میں ہوتی ہے، تو پہلے بڑے بھائی قربان ہو چکے تھے اور پھر دوسرے بھائی قربان ہو چکے تھے، دونوں میں امامت تھی، بڑے بھائی پر چھوٹے بھائی حجاب مقرر ہوئے تھے، یہ بھی یاد رہے، یہ آپ کے لئے بہت ہی مفید ہے تا کہ آپ بزرگانِ دین کی کتابوں کو پڑھ سکیں۔ حجاب کسے کہتے ہیں؟ جب ایک امام کو چھپانا مقصود ہوتا ہے، تو اُسی کے ساتھ دوسرے امام کو مقرر کیا جاتا ہے جو نمایاں ہوتا ہے تو باطنی طور پر رابطہ ہوتا ہے اور مرکز وہ ہوتا ہے جس کا کوئی حجاب ہوتا ہے لیکن ظاہر میں یہی بولتا ہے جو حجاب کا ٹائٹل رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولادِ اسماعیلؑ اور اولادِ اسحقؑ میں ائمہ ہوتے آئے ہیں، پر اولادِ اسماعیلؑ میں جو امام مقرر ہوئے اُن کی امامت کا نمایاں تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ اُن پر حجاب تھے وہ ائمہ جو اولادِ اسحق سے تھے، اور یہی سبب ہے کہ حضرت مولانا ابو طالبؑ کی امامت اور اُس کے رُوحانی پہلو کا پتہ نہیں چلتا ہے، کیونکہ اُن میں جو امامت تھی وہ حجاب والی امامت تھی۔ اِس کے برعکس اولادِ اسحق میں سے جو ائمہ ہوئے، اُن کے کارہائے نمایاں ظاہر ہیں، لیکن چونکہ اسماعیلؑ امام بھی تھے اور پیغمبر بھی تھے اور نبوّت کی وجہ سے اُن کی رُوحانی کارگزاریاں اور بعض چیزیں ظاہر ہیں قرآن میں اور اسحقؑ بھی ایسے تھے۔ لیکن ہر امام ایسے نہیں تھے کہ وہ پیغمبر بھی ہو اور امام بھی، اِس لئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے جتنے ائمہ ہوئے وہ تو پوشیدہ ہی رہے اور اگر آپ نے یہ سوال کرنا ہے کہ حجاب کیوں؟ تو یہ قانونِ خداوندی ہے کہ سب سے پہلے خدا ہی کا حجاب ہوتا ہے۔ آپ قرآن کے انڈیکس کو اُٹھا کر لفظِ حجاب کو لیں، تو یہ آپ کو اُس مقام تک پہنچائے گا جہاں پر خدا فرماتا ہے کہ خدا کسی سے کلام نہیں کرتا ہے، مگر اشارے سے یا ایک حجاب کے پیچھے سے (۴۲:۵۱)۔ تو اشارہ سب سے پہلے آتا ہے، اُس میں بات نہیں ہوتی ہے اور اُس کے بعد کلام آتا ہے جو حجاب سے ہوتا ہے، پردے سے ہوتا ہے، تو یہ دو خاندان تھے جو امامت کے تھے۔

چنانچہ یوسف علیہ السلام حضرت اسحق علیہ السلام کی نسل سے تھے، اِس لئے وہ امامِ مستودع کے وارث تھے، امامتِ استیداع کے وارث تھے اور جس زمانے میں یوسف علیہ السلام نے یہ خواب دیکھا اُس وقت یوسف علیہ السلام امام نہیں تھے، اُن کے والد امام تھے اور آگے چل کر امامت اُن کو ملنے والی تھی، یہ عظیم خواب اُنہوں نے دیکھا تھا۔ اب اِسی سلسلے میں اُنہوں نے خواب میں یہ دیکھا کہ گیارہ ستارے اُن کے لئے سجدہ کرتے تھے اور سورج اور چاند اُن کے لئے سجدہ کرتے تھے۔ سجدہ کی تاویل تابعداری ہے، تو گیارہ کے عدد میں ایک کو ملائیں تو بارہ بن جاتے ہیں۔ جس زمانے میں یوسف علیہ السلام نے یہ خواب دیکھا تھا، اُس زمانے میں حضرت یوسف علیہ السلام بارہ حجتوں میں سے تھے تو اُن کو چھوڑ کر باقی گیارہ تھے، تو اُن گیارہ سے یہ آگے بڑھنے والے تھے اور وہ گیارہ اِن کی تابعداری کرنے والے تھے، یہاں تک کہ امامِ مستودع بھی اُن کی تابعداری کرنے والے تھے اور اُس کے باپ بھی۔ امام کی تابعداری کسی کے لئے نہیں ہوتی ہے مگر ایک ہی

مقام آتا ہے اور وہ آخری مقام ہوتا ہے، خواہ وہ سیکنڈوں کے حساب سے کیوں نہ ہو۔ جب وہ اپنے فرزند کو نور سونپتا ہے اور نور کو سونپنے کے لئے تو ایک مدّت چاہیئے لیکن آخر میں امر کو بھی سونپتا ہے، امر کو بھی سونپتا ہے، اختیار، تو اُسی امر کی تفویض کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بیٹے کے لئے تابعداری کرتا ہے، یہ ہوا باپ کا بیٹے کے لئے سجدہ کرنا۔

سجدہ کی تاویل تابعداری، تو یہاں ستاروں سے حجّت مراد ہیں، سورج سے امام مراد ہیں، چاند سے حجّت [اعظم] مراد ہے، باب یعنی سب سے بڑا حجّت اور گیارہ ستاروں سے گیارہ حجّت مراد ہیں، تو اِنہوں نے آگے چل کر حضرت یوسف علیہ السّلام کی تابعداری کرنی تھی اور امامؑ نے اپنے فرزند کو اختیارِ امامت سونپنا تھا۔ پہلے تو نور دیا جاتا ہے اُس کے لئے ایک وقت لگتا ہے اور جب نور مکمل طور سے وارث میں ظہور پذیر ہو جاتا ہے، تو پھر بھی جو سابق امام ہیں اُن میں نور ختم نہیں ہوتا ہے، نور تو کبھی ختم نہیں ہوتا ہے اور اِس سلسلے میں یاد رکھیں کہ باپ بیٹے کے لئے اِس لئے کہ سجدہ نہیں کرتا ہے، کہ اُس کے پاس جو روشنی تھی وہ ختم ہو گئی یہ بات نہیں ہے۔ یہ ایک قانون ہے اور یہ ایک مصلحت ہے، باپ میں روشنی علم کی، رُوحانیت کی ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ نور کوئی مادّی شئ نہیں ہے کہ یا تو باپ میں ہو یا بیٹے میں، نور بسیط ہے اور ہمہ رَس ہے۔ باپ میں اور بیٹے میں ہونا تو کیا وہ بارہ حجتوں میں اور بہت سارے مومنوں میں بھی نور ہو سکتا ہے وہ بسیط ہے، وہ رُوح ہے۔ پر باپ جو بیٹے کے لئے تاویلی سجدہ کرتا ہے یعنی نور کو سونپتا ہے یعنی اختیار کو، تو یہ قانون ہے، قانون ہے اور پیغمبروں کے لئے بھی یہ قانون رہا ہے، جو قانون پیغمبروںؑ کے لئے ہے، انبیاءؑ کے لئے ہے، وہی قانون اماموںؑ کے لئے بھی ہے۔ آپ مجھ سے پوچھئے کہ پیغمبروں کے سلسلے میں ایسی کون سی بات ہے؟ کئی آیات ہیں اُن میں فرمایا گیا ہے رسولوں سے کہ تم اپنے بعد کے آنے والے پیغمبر پر ایمان لاؤ، تصدیق کرو، (confirm) کرو، قوت دو، ایمان لاؤ گے، تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم دین میں نہیں تھے کہ وہ تمہارے لئے ایک دین لائے گا، تو اُسی سے تم مسلمان یا مومن کہلاؤ گے یہ بات نہیں ہے۔ پھر ہم ایمان کی تشریح میں ذرا جاتے ہیں، ہم نے کسی کتاب میں ایمان لانے کی کچھ تشریح کی ہے اور علیؑ کے ایمان لانے کے سلسلے میں اِس کی وضاحت کی ہے۔ علیؑ نے جو ایمان لایا اُس کے یہ معنی ہیں کہ اُس نے تصدیق کی اور اِسی طرح اگلا پیغمبر پچھلے پیغمبر پر ایمان لاتا ہے وہ اِس (sense) میں ایمان لاتا ہے کہ اُس کو (confirm) کرتا ہے، اُس کو مانتا ہے، اُس کی تصدیق کرتا ہے۔

لہٰذا ایمان لانے، اور ایمان لانے میں فرق ہے یعنی کسی کافر کے ایمان لانے اور کسی ولی یا نبی کے ایمان لانے میں بڑا فرق ہے۔ کافر کے ایمان لانے میں یہ بات ہے کہ وہ تاریکی کو چھوڑ کر روشنی میں آتا ہے اور کفر سے ایمان کی طرف آتا ہے، اور کسی پیغمبر اور امام کے ایمان لانے کی یہ بات ہے، کہ وہ (approve) کرتا ہے یا تصدیق کرتا ہے، زیادہ یہ تصدیق صحیح ہے، تو اِسی طرح کچھ آیات ہیں اُن میں خدا نے فرمایا ہے انبیاء علیہم السّلام سے کہ تم اپنے بعد کے پیغمبروں پر

ایمان لاؤ گے یعنی کہ تصدیق کرو گے۔ اِس تصدیق میں احترام بھی ہوسکتا ہے، اور تابعداری بھی ہوسکتی ہے یہ تابعداری بھی کسی کمی سے نہیں بلکہ ایک مصلحت کے تحت ہے، تو اِس لئے جو باپ بیٹے کے لئے سجدہ کرتا ہے، تو اُس کے معنی ہیں کہ اختیار کو سپرد کرتا ہے، تفویض کرتا ہے اور اِسی اختیار کو دینے کے معنی ہیں، کہ باپ نے بیٹے کو سجدہ کیا، تو میں وہ تاویل بتا رہا ہوں کہ یوسف علیہ السلام نے جو خواب دیکھا تھا اُس میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند یوسفؑ کے لئے سجدہ کر رہے تھے اور باپ نے اِس کو جان لیا وہ امام تھے اور یہی بات تھی کہ [کہا] تم اپنے بھائیوں سے نہیں کہنا کہ تم کو امامت ملنے والی ہے، نہیں تو وہ تم سے حسد کریں گے اور تم کو آفت میں ڈالیں گے۔

پھر شیطان کا نام لیا کہ شیطان انسان کا ظاہری دشمن ہے۔ اب دیکھیں کہ شیطان کا نام کیوں لیا؟ حسد بھائی کریں گے، یوسف کو مصیبت میں وہی لوگ ڈالیں گے لیکن شیطان کہاں سے آیا؟ دیکھیں کہ اِس کے دو معنی ہیں، ایک اِس کے یہ معنی ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں کو بہکانے والے کچھ دوسرے لوگ ہوں گے، وہی شیطان [ہیں]۔ کیونکہ بُرے کام کرنے والوں کے لئے جب کوئی موقع ملتا ہے تو وہ اُس بُرے کام کرنے سے باز نہیں آتے ہیں، ایک یہ معنی ہیں۔ دوسرے اِس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کا کوئی الگ تھلگ وجود نہیں ہے، وہ (calculate) انسانوں کے افعال سے، انفرادی اور اجتماعی افعال سے وجود کو حاصل کرنے والی ایک طاقت ہے۔ ہم اگر کسی ایسے بیابان میں چلے جائیں وہاں لوگ بھی نہیں ہیں، کوئی بھی نہیں ہے تو وہاں پر شیطان موجود ہوگا، اُس کو جنم ملے گا، ہمارے سوچنے سے، اعمال سے اور افعال سے شیطان کو وجود ملے گا، وہ تو برائے نام چیز ہے لیکن شیطان کا اکثر و بیشتر کام جو ہے وہ لوگ ہی انجام دیتے ہیں، تو اِن ہی دو وجوہ سے شیطان کا اِس میں ذکر آیا، تو اِسی طرح نمبر: ۴ آیت کی تاویل مکمل ہو جاتی ہے۔

لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ شیطان کو ''عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ'' (۱۲:۵) کیوں کہا گیا حالانکہ شیطان باطن میں بھی ہے ظاہر میں بھی ہے لیکن زیادہ سے زیادہ شیطان کا تعلق ظاہر سے کیوں ہے؟ زیادہ سے زیادہ تعلق شیطان کا باطن سے کیوں نہیں ہے؟ یہ سوال ہے۔ اُس کے لئے میں عرض کروں گا، کہ اِس کا بھی سبب ہے، یہ کہ گو کہ شیاطین جنّات میں سے بھی ہیں جو پوشیدہ ہیں اور انسانوں میں سے بھی ہیں جو ظاہر ہے۔ لیکن انسان چونکہ اِسی ظاہری دنیا میں رہتا ہے، لہٰذا شیطان کا مضبوط وجود ظاہر میں ہے، باطن میں صرف ایک (echo) ہے، صدائے گنبد ہے، گنبد کی صدا ہے، کہ ہم ایک گنبد میں آواز، ایک کُوبے کے اندر رہتے ہوئے آواز نکالتے ہیں یا کسی کو بلاتے ہیں یا پکارتے ہیں، تو وہ ہماری پکار اُس گنبد سے ٹکرا کے واپس آتی ہے۔ پہاڑوں میں بھی یہ بات ہوتی ہے، جب پہاڑ میں اُونچی آواز سے کسی کو پکارا جاتا ہے، تو وہ آواز اپنی رفتار سے جا کر پہاڑ سے ٹکرا کر پھر واپس سنائی دیتی ہے۔ اِسی طرح رُوحانیت میں جو شیطان ہے باطن میں وہ اِس ظاہری شیطان سے بنتا ہے، لہٰذا ''عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ'' (۱۲:۵) فرماتے ہوئے ہمیں زیادہ سے زیادہ شیطان سے بچنے کے لئے ظاہر کی

طرف توجہ دلانا اِس لئے ہے، کہ ہم باطن میں جانے سے پیشتر ظاہر میں سوچیں کہ شیطان سے بچنے کے لئے کیا ہے، تو اِس دنیا کے اندر بعض ہادیٔ برحق کے دشمن ہیں، وہی شیاطین ہیں، اگر ہم اُن سے خود کو بچائیں تو محال ہے کہ باطن میں شیطان ہم پر غالب آئے، غالب نہیں آسکتا ہے، کتنی [بھی] کوشش کے باوجود وہ غالب نہیں آسکتا ہے۔ لہٰذا شیطان کے معاملے میں ہمیں زیادہ سے زیادہ باطن کی نسبت ظاہر میں احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ قرآن میں ''عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ'' (۱۲:۵)، شیطان تمہارا ظاہر دشمن ہے کہہ کر ہمیں توجہ دلائی گئی ہے، اور اُس کے بعد ارشاد ہوتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے ارشاد ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرزند سے کہتے ہیں کہ ''وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ'' اور اسی طرح تمہارا پروردگار تم کو نوازے گا اے میرے فرزند! یعنی جو تم نے خواب دیکھا ہے، اسی کے مطابق تم کو نوازے گا اور برگزیدہ کرے گا یعنی تم کو نبوّت اور امامت عطا فرمائے گا ''وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ'' اور تم کو احادیث کی تاویل سکھائے گا، احادیث (in literal sence) باتوں کو کہتے ہیں اور وہ تم کو باتوں کی تاویل سکھائے گا (۱۲:۶)۔ اب اِس میں تاویل کو (common) کر دیا گیا اِس لئے کہ مقصود یہ ہے کہ ہر بات کی تاویل ہر بات کی تاویل، خواب بھی بات ہے اور بیداری میں جو گفتگو ہے وہ بھی بات ہے، جو کلامِ الٰہی وہ بھی بات ہے، یہاں تک کہ کوئی چیز نہیں جس میں تاویل نہ ہو، خواہ کوئی گالی کیوں نہ ہو، خواہ کوئی مذاق کیوں نہ ہو اگر یہ رُوحانین سے، میں رُوحانین کی بات کرتا ہوں، اگر کوئی فرشتہ کسی کو گالی دیتا ہے یا خدا کسی کو گالی دیتا ہے یا پیغمبر کسی کو گالی دیتا ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ خدا اور پیغمبر کسی کو کیسے گالی دے، پُرحکمت گالی! حدیثوں میں ہے کہ پیغمبر بعض دفعہ کہا کرتے تھے کہ تمہارا ہاتھ خاک آلود ہو جائے یعنی تمہارے ہاتھوں کو مٹی لگے۔ یہ بھی ایک طرح کی پُرحکمت گالی تھی، پُرحکمت رسولؐ کے نزدیک، لوگوں کے نزدیک نہیں، تو اِس لئے تاویل یہاں (common) ہے ہر بات کی تاویل۔

خواب میں ایک مومن کوئی بات سنتا ہے یا رُوحانیت میں کوئی بات سنتا ہے تو اُس کی تاویل ہے، ہر چیز کی تاویل ہے لیکن ایسا رُتبہ یا تاویل کی ایسی بلندی یہ تو صرف یوسف علیہ السلام کو حاصل تھی اور کسی پیغمبر کو امام کو یہ رُتبہ حاصل ہوتا ہے اور اُن کے بعد جو ہیں وہ تو یعنی اپنی کوشش کے مطابق یا اُن کی سطح کے مطابق یا اُن کے درجے کے مطابق ہوتا ہے، لیکن ہمیں قرآن کی روشنی میں یہ ماننا ہوگا کہ ہر بات کی تاویل ہے، ہر بات کی تاویل ہے۔ اِس مقام پر میں ایک (example) آپ کو دینا چاہوں گا، کہ زمانۂ قدیم میں ہمارے علاقے کے اندر مذہبی علم کی روشنی نہیں پھیلی تھی، لوگ کچھ مذہبی لحاظ سے اور علم کے لحاظ سے خاص طور سے، عقیدے میں نہیں لیکن علم کے لحاظ سے بہت پیچھے تھے۔ مجھے یاد ہے میں بچہ تھا جب نیا چاند نکلتا تھا، تو میں اپنے بزرگوں کی روایت کے مطابق چھت پر چڑھتا تھا اور چاند سے کچھ کہتا تھا، نہ معلوم کیوں یہ کہا جاتا تھا کہ نیا لباس دو اور پُرانا رزق دو، یہ ایک فرسودہ روایت تھی بظاہر۔ لیکن جب بعد میں رُوحانی انقلاب آیا تو

میں نے اپنے اِس رُوحانی انقلاب کے اندر کسی ایک مقام پر اِس بات کو دیکھا کہ کوئی رُوحانی یا کوئی رُوح اِس بات کو دُھراتی تھی۔ خیر اُس وقت اِس کی تاویل سمجھ میں نہیں آئی لیکن کچھ زمانے کے بعد بات سمجھ میں آ گئی، کہ نئے لباس کا کیا مطلب ہوتا ہے اور پُرانے رزق کا کیا مطلب ہوتا ہے، تو نئے لباس ایک شخصیت ہے اور پُرانا رزق جو ہے وہ علم ہے، علم جو ہے پُرانا ہے۔ ہم جو اِس بدن میں دنیا میں آئے ہیں یہ ہمارا نیا لباس ہے اور ایسے کئی لباس ہو سکتے ہیں مگر اِس جسم میں نہیں تو آسٹرل باڈی میں۔ یہ بحث بہت لمبی ہے اور اِس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم محدود تناسخ کو مانتے ہیں، محدود تناسخ کو نہیں مانتے ہیں، ہم مظاہر کو مانتے ہیں، (manifestations) کو مانتے ہیں، تو بہر حال یہ فضول جیسی بات جو ہے وہ تاویل کے ساتھ وہاں پر سامنے آئی اور اِس جیسی کئی مثالیں ہیں میں الگ آپ کو بتاؤں گا۔ جہاں میں اپنے رُوحانی واقعات کا ذکر کروں گا، تو اُس میں مجھے یاد دلانا کہ ایسی بہت سی چیزیں آپ کو بتاوں گا جو بظاہر مذاق جیسی چیزیں ہیں مگر اُن کے اندر تاویل بھری ہوئی ہے، تو اب آیئے کہ ''تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ'' کا مطلب ہے ہر قسم کی گفتگو اور ہر قسم کی بات کی تاویل حضرت یوسف علیہ السلام کو سکھائی گئی، تو یہ اُن کے پدرِ بزرگوار اُن سے پیش گوئی کرتے ہیں، بتاتے ہیں کہ بیٹے تم کو کسی سے ذکر نہیں کرنا ہے اپنے خواب کا اور خداوندِ عالم تم کو برگزیدہ فرمانا چاہتا ہے۔

آگے چل کر کیا ہوا دونوں باتیں صحیح ہوگئیں جو یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزند سے فرمایا تھا جو پیش گوئی کی تھی دونوں باتیں صحیح ہوگئیں، خدا نے یوسف علیہ السلام کو برگزیدہ کیا یہ بھی صحیح ہوگئی اور شیطان کو موقع ملا اور بھائیوں نے اُن سے حسد کیا اور اُن کو مصیبت میں ڈالا یہ بات بھی صحیح ہوگئی، تو خدا نے جو چاہا تھا اُس کو کوئی نہیں ٹال سکتا تھا، اُس کو کوئی نہیں بدل سکتا تھا یہ بات صحیح ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ کسی طرح سے معلوم نہیں اُن کے بھائیوں کو پتہ چلا کہ اُن کو امامت ملنے والی ہے، تو بھائیوں نے بھی اُن کو اذیت دینے میں کوئی کسر فروگذاشت نہیں کی، وہ شاید یوسف علیہ السلام نے نہ کہا ہو یا کہا ہو لیکن ایک بات سے اُن کو پتہ چلا کہ باپ اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف بہت توجہ دے رہے تھے، بہت پیار کر رہے تھے اور چونکہ نور کی منتقلی کے لئے جو پُل بنایا جاتا ہے، اُس پُل کے اندر چند (elements) ہوتے ہیں، اُن چند (elements) سے پُل بنتا ہے نور کی منتقلی کے لئے، نور کے انتقال کے لئے، انتقال معنی نقل کرنا، تبدیل کرنا۔ اُس میں ایک تو اسمِ اعظم دیا جاتا ہے، ایک اسپیشل خدائی بھیدوں کا علم دیا جاتا ہے، تعلیم دی جاتی ہے اور تیسری چیز محبّت اور توجہ اِس میں ہوتی ہے اور چوتھی چیز ہم اِس کو کہیں گے دُعا، خواہش، تمنّا، یہ بھی ہوتی ہے، تو یہ چار قسم کے (powers) سے نور کو منتقل کیا جاتا ہے، یہی معجزہ ہے، اِس کے سوا نور کی منتقلی کے لئے اور دنیا میں جو بڑے بزرگ، باپ ہوتے ہیں وہ بھی اپنے بچوں کی طرف توجہ دے، اُن کو محبت دے، خصوصی علم دے، تو اِس سے ایک پُل بن سکتا ہے، اُن کو نور نہیں تو اپنی بساط کے مطابق کوئی باپ اپنے بیٹے میں اپنی رُوح کو، اپنی قوتوں کو، اپنی صلاحیتوں کو، اپنی عادتوں کو منتقل کر سکتا ہے بحکمِ خدا، خدا چاہے تو۔ تو یہ خدا کی برگزیدگی کی

بات ہوئی اور یوسف علیہ السلام پر مشقتیں بھی گزریں۔

یہاں پر چھٹی آیت چلتی ہے، اِس میں تاویل کے علم کا ذکر آتا ہے اور نعمت کا ذکر آتا ہے کہ: ''وَ یُتِمُّ نِعۡمَتَہٗ'' اور خدا اپنی نعمت کو تم پر پوری کرے گا۔ ''عَلَیۡکَ وَ عَلٰۤی اٰلِ یَعۡقُوۡبَ'' اور آلِ یعقوب پر بھی۔ ''کَمَاۤ اَتَمَّہَا عَلٰۤی اَبَوَیۡکَ مِنۡ قَبۡلُ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡحٰقَ'' (۱۲:۶) وہ نعمت ایسی ہوگی جیسی ابراہیم کو ملی تھی او اسحق کو ملی، تو اِس میں نبوّت اور امامت کا ذکر آ گیا اور بہت بڑی نعمت ہے علم کی شکل میں، ہدایت کی شکل میں اور نبوّت و امامت کے نور کی صورت میں۔ اُس کے بعد ساتویں آیت میں ارشاد ہے کہ یوسفؑ اور اُن کے بھائیوں کے درمیان جو واقعات رُونما ہوئے ہیں، اُن میں پوچھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں (۱۲:۷) یعنی اِس میں بہت سی تاویلات ہیں، بہت سی حکمتیں ہیں، پوچھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں، تو یہ کون ہیں پوچھنے والے؟ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اِس سطح پر پہنچے اور مطلب کو سمجھے اور سوال بنائے۔ یہاں پوچھنے سے تقاضا مراد ہے، ہر انسان کے اندر علم کا ایک تقاضا رہتا ہے، خواہ وہ تقاضا ظاہر ہو یا پوشیدہ ہو، تو وہ تقاضا ایک سوال ہے، ایک (demand) ہے، تو مطلب حکمت کو، رُوحانیت کو، علم کو، تاویل کو سمجھنے سے متعلق جو مومنین میں تمنّائیں ہیں یا جو تقاضے ہیں اُن کے مطابق اِس سورہ میں بہت ساری حکمتیں، بہت ساری حکمتیں موجود ہیں۔

جب یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ البتہ یوسفؑ اور اُس کا بھائی ہمارے والد کو ہماری نسبت زیادہ عزیز ہے اور حالانکہ ہم ایک زبردست جماعت ہیں تو ایسا کیوں ہونا چاہئے؟ اُنہوں نے یہ کہا۔ ہمارے والد کے نزدیک یوسفؑ بہت ہی زیادہ [اہم] ہے اور اُن کے بھائی بہت ہی زیادہ عزیز ہیں ہماری نسبت، ہمارے مقابلے میں اور حالانکہ ہم جو گیارہ بھائی ہیں، ایک زبردست جماعت ہیں، تو کیوں ایسا ہونا چاہئے کہ ہمارا والد ہم کو نظر انداز کرے اور یوسفؑ اور اُس کے بھائی کو اتنا پیار دیں۔ یوسفؑ اور اُس کے بھائی سے کیا مراد ہے؟ یوسفؑ اور ایک بھائی جو بنیامین تھے، اُن کی ماں الگ تھی اور باقی بھائیوں کی ماں الگ تھی۔ یہاں صرف پیار اور محبت پر اتنا جھگڑا کیوں پیدا ہوتا ہے، اِس میں کیا راز ہے؟ چونکہ یہ تاویلی (interpretation) ہے اِس لئے اِس محبّت سے امامت کا منصب مراد ہے، وہ جانتے تھے کہ اِس توجہ سے یعنی امامت یوسف کو مل رہی ہے۔ جھگڑا کسی بے معنی محبّت پر نہیں تھا، جھگڑا منصبِ امامت پر تھا اور عجیب بات ہے کہ امامت کو کوئی جھگڑا کر کے زبردستی سے لے سکتا ہے۔ سو یوسفؑ کے بھائیوں میں یہ حسد اگر حسد کہا جائے، اگر حسد ہے تو کیوں ہونا چاہئے؟ اگر رَشک کہا جائے تو یہ رَشک کیوں ہونا چاہئے؟ اور حالانکہ ابھی آپ نے سنا کہ یہ حدود دِین میں بھی آتے ہیں، گیارہ حجّت بنتے ہیں تو حجتوں کے درمیان یہ جھگڑا کیوں ہونا چاہئے؟ صحیح ہے! حجّت دو دو پہلو سے ہوتے ہیں، شب کے ہوتے ہیں، روز کے ہوتے ہیں، شب سے مراد شر ہے، روز سے مراد خیر ہے، روز روشن ہے، شب تاریک ہے۔ ہم کو اپنی چھوٹی سی عقل کے مطابق یہ بات اچھی نہیں لگتی ہے، کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے امامت کے سلسلے میں جھگڑا کیا لیکن

یقیناً اور بھی حجّت تھے جو اِن میں سے ہر ایک کے (opposite) میں تھے، تو بہر حال حدودِ دین کچھ تو رات کی نمائندگی کرتے ہیں، کچھ دن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جس طرح دن اور رات کے ملنے سے روز بنتا ہے، دن بنتا ہے چوبیس گھنٹے کا اور اِسی طرح اضداد کی شناخت اضداد سے ہوتی ہے اور خیر و شر کا ہونا خدا کے نزدیک ضروری ہے، ہمارے نزدیک ضروری نہیں ہے۔ ہمیں شر سے بچنے کے لئے کہا گیا ہے لیکن خدا کی بادشاہی میں اِس کا وجود ضروری ہے، ہم ایسے نہیں ہیں اِس قابل نہیں ہیں کہ شر سے فائدہ اُٹھائیں، ہمیں ہر وقت شر سے بچ کر اور خیر سے فائدہ اُٹھانے کے لئے فرمایا گیا ہے۔ لیکن اِس میں کوئی خضر ہونا چاہئے جو خیر و شر دونوں سے باخبر ہو، دونوں کی حکمت کو جانتا ہو اور جہاں موسیٰ سے یہ نہیں ہو سکا کہ وہ شر کی حکمت کو سمجھیں۔ کیونکہ مجمع البحرین (۱۸:۶۰) دو دریاؤں کا سنگم وہ تھا جہاں خیر اور شر آپس میں ملتے ہیں، اِسی مقام پر خضر تھا اور حقیقت میں خضر نہیں تھا وہ کوئی اور رُوحانی اُستاد تھا۔ لیکن چونکہ یہ قصہ اِس طرح سے مشہور ہے تو ہم روایت کے مطابق اِس قصے کو پیش کر رہے ہیں تو اِس میں کوئی الزام نہیں ہے، تو کوئی خضر (میں روایت کی زبان میں کہتا ہوں) تو کوئی خضر ہونا چاہئے جو خیر اور شر دونوں کی حکمتوں کو جانتا ہو، تو یوسفؑ کے بھائی حجّت ضرور تھے لیکن لگتا ہے کہ وہ جتّانِ شب میں سے تھے، اِس لئے یہاں "لِّلسَّآئِلِيْنَ" (۱۲:۷) کے لئے یہاں بہت سا حکمت کا مواد موجود ہے خدا کی زبان سے۔

"اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ" (۱۲:۸) اُنہوں نے کہا کہ ہمارا باپ صریح گمراہی میں ہے غلطی پر ہے، ایسا کیوں کرنا چاہئے؟ پھر اُنہوں نے سوچا اور کہا کہ چلو یوسف کو قتل کرو یا کسی دُور زمین میں پھینک آؤ تا کہ تمہارے باپ کی توجہ خالی ہو گی تمہارے لئے، وہ آرام سے پھر تم کو پیار کرے گا تا کہ نتیجے کے طور پر کوئی منصب، کوئی درجہ، کوئی نمائندگی تم کو ملے گی اور اُس کے بعد پھر تم اچھی قوم بن جاؤ گے۔ لیکن اُن میں سے ایک نے کہا اُس کو قتل نہ کرو لیکن اُس کو ایک کنویں میں پھینکو، کنویں میں ڈالو تا کہ اُسے کوئی مسافر راہ چلنے والا اُٹھائے اگر تم کرنے والے ہو (۱۲:۹۔۱۰)۔ یہاں پر ایک بہت عظیم حکمت ہے اور یہ تاویلات سے پُر ہے، یہ کہ ہر مومن ایک تاجر ہے، ایک مسافر ہے، اُن تاجروں کی طرح جن کو رستے میں سے ایک کنویں سے یوسفؑ ملا تھا۔ یہ مثال ہر رُوحانی شخص پر صادق آتی ہے، کہ ہم اسمِ اعظم کی سواری پر مسافتوں کو طے کرتے ہیں تو ہم اپنی کسی رُوحانی تجارت کے طور پر یا کسی کاروبار کے طور پر مثلاً کہیں جا رہے تھے کہ یکا یک ہم کو کنویں سے یوسف ملتا ہے۔ ہم اُس کو چند کھوٹے درہموں سے خرید لیتے ہیں، ہمارے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہوتا ہے، تو یوسفؑ کے بھائی گویا ہم کو ہمارے ہاتھ پر یوسفؑ کو فروخت کرتے ہیں، ہم خوش خوش اُس کو لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ بڑا مکھڑا سا چاند ہے وغیرہ، تو اُس کو لیتے ہیں، لینے کے بعد بہت کم عرصے میں اُس کو کسی اور کے ہاتھ یوسف کو فروخت کر ڈالتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں اور کس لئے کہ ہم یوسفؑ کو ہمیشہ نہیں رکھ سکتے ہیں۔ ہم اُس کو اچھی قیمت پر جو ہم نے قیمت دی تھی اُس سے کئی، کئی، کئی گنا قیمت پر اُس کو کسی اور رُوحانی کے ہاتھ پر، فرشتوں کے ہاتھ پر اُس کو فروخت کرتے ہیں اور ہم یوسفؑ کو نہیں

سمجھتے ہیں اور اِس مالِ دنیا سے خوش ہوتے ہیں، اِس میں ایک پہلو یہ بھی ہے، تو اِسی کے ساتھ آج کی کلاس کو یہاں (stop) کریں گے اور پھر کچھ سوال جواب ہو سکتے ہیں۔ رُوحانی طور پر جن کو نور ملتا ہے تو اُس کے ملنے کے مختلف واقعات، مختلف صورتیں وغیرہ ہوتی ہیں، تو امام کا نور مومنین کی ہستی میں جو آتا ہے، تو وہ بھی ایسی بات ہے جیسے یوسف کو کنویں میں قید کیا گیا ایک طرح سے۔ اپنی رُوحانیت کی دنیا سے کوئی پاتا ہے نا امام کو! یا ایک طرح سے دیکھا جائے ابھی تو مومن کے اندر جو نور کی چنگاری ہے یا جو امامؑ پوشیدہ ہے اور اُس کو حرکت کے لئے موقع نہیں ہے تو کنویں میں بند ہے یوسفؑ ہے اور جب کسی کو ملے گا تو اُس وقت وہ کنویں سے نکل جائے گا۔

سوال: [سر! جب کنویں سے نکل جائے گا تو جیسا کہ آپ نے بتایا کہ پھر آگے چل کر اُس کو اچھے داموں فروخت کرتے ہیں۔ تو اِس کے کیا معنی ہیں؟]

جواب: اچھے دام میں فروخت کرنا یعنی اوّل تو وہ خرید لیتا ہے نا! کچھ کھوٹے درہم میں خریدتا ہے، تو مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس جو عبادت کا سرمایہ ہے یا جو علم کا سرمایہ ہے وہ اُن درہموں کی طرح ہے اُس کے مقابلے میں جو نور ملتا ہے اُس کے مقابلے میں، کہ ہماری کوشش اور ہمارے علم کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور جب یوسفؑ کو فروخت کیا جاتا ہے تو اچھے دام ملتے ہیں، تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں اگر یہ نور ہاتھ سے نکل بھی جائے، تو ظاہر ہے کہ ہم کو کافی دولت دے کے جائے گا، ایسے نہیں جائے گا، تو مومن کو بہت ہی علمی طور پر غنی کر کے جائے گا ایسا تو نہیں ہو سکتا ہے کہ امام ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے اور باتیں کرے اور دن رات لیکن کچھ دے کے جائے ہمیں ہاتھ سے دے کر جائے گا۔ جو اُس کا دیا ہوا ہے وہ تو ہمارے پاس رہے گا علم، دولت، معرفت، خدمت، تاویل بہت ساری چیزیں، وہ خود جس طرح بولتا تھا وہ اب نہیں بولے گا۔

سوال: [آواز واضح نہیں]

جواب: ہم نے بھی وقت دیا نا، اُس کی کیا غلطی ہو سکتی ہے، اُس کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔

سوال: [سر! اگر رکھنا چاہے تو رکھ بھی سکتے ہیں؟]

جواب: مشکل ہے، مشکل ہے۔

سوال: ([سر! نور تو بسیط ہے]۔

جواب: بسیط ہے، رہ سکتا ہے لیکن (conditions) تو ایسی ہیں کہ مشکل کسی پیغمبر کو رہ سکتا ہے، کسی پیر کو رہ سکتا ہے۔

سوال: [حضرت یوسفؑ کے فروخت کرنے کے بارے میں سوال]

جواب: جنہوں نے یوسفؑ کو فروخت کیا اُن کو نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سب سے بڑا سرمایہ یوسفؑ خود ہی تھے، نہ کہ وہ

چیز جو یوسفؑ کے بدلے میں لی اور جن لوگوں نے یوسفؑ کو لیا وہ فائدے میں رہے کیونکہ یوسفؑ خود ہی خزانہ تھے اور خود ہی سلطنت تھے، خود ہی بہت کچھ تھے اور قصے میں بھی اِس طرح سے دکھایا گیا ہے کہ جس عورت نے یوسفؑ کو خریدا اور جس معاوضے میں اُس عورت کے شوہر نے یوسف کو خریدا وہ تو بہت ہی معزز رہے، اور پھر مطلب یہ کہ جس ملک میں یوسفؑ گئے اور جس سلطنت میں وہ وزیر رہے تو اُن کی جان بچائی، اگر یوسفؑ کی تاویل نہ ہوتی تو سب لوگ ہلاک ہو جاتے۔ کیونکہ بادشاہ نے ایک ایسا خواب دیکھا تھا کہ اِس خواب کی تاویل کوئی نہیں بتا سکتا تھا اور اگر یوسفؑ اِس خواب کی تاویل نہیں بتاتے، تو سب لوگ ہلاک ہو جاتے، اِس لئے کہ سات برس فراوان سالی کے تھے، بہت کچھ فصل وغیرہ، فصول، میوے وغیرہ خوب پیداوار ہونے والی تھی، اور اُس کے بعد سات برس قحط کے آنے والے تھے اور اِس کے لئے اہتمام لوگ نہیں جانتے تھے اور بادشاہ نے صرف ایک خواب دیکھا تھا، جس کی تاویل کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ یوسفؑ ہی نے جو خواب کی تاویل کی، اُس کی تاویل میں نجات ہے۔ یہ اشارہ ہے، ہمیں اشارہ ہے، کہ امام کی تاویل میں لوگوں کے لئے نجات ہے خصوصاً مریدوں کے لئے نجات ہے، کہ اگر امام کی تاویل نہ ہو تو لوگ اِسی طرح مریں گے، جس طرح کہ یوسفؑ کی تاویل کے بغیر لوگوں کو مرنے کا خطرہ درپیش تھا اور یوسفؑ ہی نے اُن کو بچایا اور اِس طرح بچایا کہ اُن کے لئے ذخیرہ رکھا۔ اِس طرح ہماری رُوحانی غذا کا اہتمام امام کی ہدایت کے تحت ہے، امام کی ہدایت نہ ہو، تاویل نہ ہو، حکمت نہ ہو، تو ہم رُوحانی ہلاکت میں ہلاک ہو سکتے ہیں۔ اِس طرح یہ بات بھی یوسفؑ کے اِس قصے میں آتی ہے، تو یوسفؑ ہی یعنی نہ صرف دولت تھے بلکہ زندگی کا سرمایہ تھے لوگوں کے لئے کہ اگر یوسفؑ نہ ہوتے تو لوگ مر جاتے، یوسفؑ کی قیمت کی میں بات بتاتا ہوں لیکن جن تاجروں نے یوسف کو بیچا تو وہ مالِ دنیا سے خوش ہو گئے۔

سوال: (سر یوسفؑ کی خواب کی تاویل جو آپ نے بتائی وہ کیا رُوحانی قصہ تھا)؟

جواب: رُوحانی قصہ تھا۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: مقالہ: سورۂ لقمان سے اہم سوالات (کتاب سوغاتِ دانش، صفحہ: ۱۴۸)

کیسٹ نمبر: Q-34-A   تاریخ: ۸/ جون/ ۱۹۸۴، کراچی

Click here for Audio

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عزیزانِ من! یا علی مدد!

آج کی اِس مقدّس علمی مجلس میں ہمارے عزیزان سورۂ لقمان سے متعلق کچھ سوالات و جوابات کو آپ کے سامنے پیش کریں گے، کیونکہ امریکہ سے ہمارے ایک عزیز دوست نے مجموعاً بصورتِ سوال سورۂ لقمان کے بارے میں چاہا تھا، کہ ہم اُس میں سے کچھ اہم سوالات کو بنا کے اُن کے لئے جوابات مہیّا کریں، اِس سلسلے میں ہم نے کچھ چار صفحات پر مبنی مقالہ تیار کیا ہے اور میرے خیال میں یہ مقالہ بڑا اہم ہے اور بہت ہی ضروری ہے چونکہ آپ کا پہلے ہی سے قرآن سے متعلق حکمتوں کا ایک درس چلتا ہے یا ایک کورس جاری ہے اور آپ ہمیشہ سے قرآن کے بھیدوں کو جاننا چاہتے ہیں اور اِس پر کافی کام ہوا ہے، اِس سلسلے میں یہ ایک اچھا موقع ہے کہ آپ اِن سوالات اور جوابات سے فائدہ اُٹھائیں اور توجّہ سے سُنیں تا کہ آپ کے علم میں اضافہ ہو جائے گا۔ اب ہمارے عزیزان نے جس طرح سے پروگرام بنایا ہے اور جیسے سوالات و جوابات تقسیم ہوئے ہیں، اُس کے مطابق آپ کو یہ مقالہ پڑھ کر سنائیں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر عزیز اِس گفتگو کے دوران جو بھی سوال ذہن میں آتا ہو اُس کو اپنے طور پر نوٹ کر کے رکھیں اور اِس مقالے کے اختتام پر ایک ایک کر کے ایسے سوالات کے جوابات کو دینے کے لئے کوشش کریں گے اور اُمید ہے کہ آپ حضرات اِس قیمتی وقت سے بھرپور فائدہ اُٹھائیں گے، ہر چند کہ کچھ حضرات ابھی نہیں آئے ہیں لیکن یقین ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد پہنچیں گے اِس لئے میں اپنے عزیزوں سے عرض کروں گا کہ وہ اپنا کام جس طرح انہوں نے پروگرام بنایا ہے وہ شروع کریں، شکریہ۔

سوال: [شہناز سلیم: سر آیت نمبر ۱۰ کے مفہوم کے بارے میں جو سوال یہاں پر ہے جس کے جواب میں یہ ہے کہ خدائے پاک نے کائنات کو ایسے ستونوں پر قائم کیا ہے جو ہمیں دکھائی نہیں دے رہے ہیں، سر اِس سلسلے میں کچھ مزید وضاحت فرمائیں؟]

جواب: سوال آپ کے سامنے کیا گیا اور وہ یہ تھا کہ خداوندِ عالم نے کائنات کو کچھ ایسے ستونوں پر قائم کیا ہے، کہ وہ

ستون ہمیں نظر نہیں آتے ہیں، یہ ایک نظریہ ہے۔ جبکہ اِس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے، کہ خداوندِ عالم نے آسمانوں کو یعنی کائنات کو بغیر ستونوں کے قائم کیا ہے، اور ہم نے یہاں پر اِس پہلے تصور کی حمایت کی ہے اور کہا ہے کہ خدا نے اِس کائنات کو ایسے ستونوں پر قائم کیا ہے، کہ وہ ستون ہمیں نظر نہیں آتے ہیں، یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور دلچسپ بھی کیونکہ اِس میں سائنس کا پہلو بھی آتا ہے، تو اِس سوال کے جواب کو مہیا کرنے سے قبل ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ اِس کائنات میں کوئی خالی جگہ ہے یا نہیں ہے؟ ہمیں ذیلی طور پر یا تمہید کے طور پر یہ بحث کرنی ہے اور اِس بحث میں یہ سوال اُٹھانا ہے کہ آیا اِس کائنات کے اندر کوئی خالی جگہ ہے؟ تو اِس میں کوئی حکیم، کوئی دانشور اِس کے لئے قائل نہیں ہوگا کہ کوئی جگہ خالی ہے، تو بے شک کوئی جگہ خالی نہیں ہے اِس کائنات کے اندر، زمین کی مثال لیجئے، سب سے پہلے مٹّی ہے اور اِس کے اُوپر پانی ہے، بہت سی جگہوں کو پانی نے گھیر لیا ہے اور پھر خشک زمین کا حصہ ہے، اِس کے اُوپر ہوا ہے اور زمین کے گرداگرد ہوا کا خول ہے، اِس کے بعد کرّۂ اثیر [یعنی بالائی فضا] کا خول ہے اور اِس کے اُوپر سائنسدانوں کی زبان میں ایتھر ہے، تو پھر اِس کائنات کی بعض جگہوں میں اجرامِ فلکی ہیں یعنی (bodies) ہیں (celestial bodies) ہیں، تو کوئی جگہ خالی نہیں ہے، جہاں کہا جاتا ہے کہ خلا یا خُلا کوئی خلانورد خلا میں گیا ہے، تو یہ لفظ کہنے کے لئے ہے، حقیقت میں کوئی خُلا نہیں ہے۔ ہاں! خُلا سے ان لوگوں کی مراد لطیف جسم ہوا، جس کو دوسرا جسم چیر کر اپنے لئے جگہ بنا سکتا ہے، مثلاً ایک پرندہ ہوا میں پرواز کرتا ہے، تو وہ ہوا کو چیرتے ہوئے پرواز کرتا ہے، پانی میں مچھلی تیرتی ہے، پانی میں مچھلی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے لیکن پانی چونکہ لطیف ہے، نرم ہے، تو جیسے ہی مچھلی آگے بڑھتی ہے تو پانی اُس کو جگہ دیتا ہے اور جو پیچھے جگہ خالی تھی اُس کو پانی پُر کرتا ہے، یہی حال ہوا کا ہے اور یہی مثال ایتھر کی بھی ہے، مثلاً یہاں سے کوئی چیز فضا میں جاتی ہے، جہاز، راکٹ وغیرہ، تو وہ پہلے زمین کے گرداگرد جو کچھ خول ہے اُس کو چیرتا ہے اور اِس کے اُوپر لطیف جسم ہے، ایتھر ہے جس کو قدیم حکماء نے ہیولیٰ کہا ہے، تو اُس ایتھر کو یا ہیولیٰ کو وہ چیز چیرتی ہوئی جاتی ہے۔

اگر اِس کائنات میں کوئی جگہ خالی ہوتی تو اُس جگہ کو پُر کرنے کے لئے کوئی سیارہ اپنی جگہ سے ہٹتا یا آسمان اندر کی طرف پچک جاتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کسی شیشے میں یا بوتل میں کوئی جگہ خالی ہے؟ جگہ خالی نہیں ہے، اُس میں ہوا ہے، کہنے کو تو آپ کہتے ہیں خالی بوتل یا خالی برتن، حقیقتاً وہ خالی نہیں ہے، اس میں ہوا پُر ہے، جیسے ہی آپ پانی یا دودھ اُس بوتل میں بھریں گے ویسے ہی ہوا اُس میں سے نکل جائے گی اور بعض دفعہ آپ دیکھتے ہیں کسی چھوٹے منہ والے برتن کو بالٹی میں ڈبوتے ہیں، تو اُس میں سے آواز نکلتی ہے اور یہ آواز کیا ہے؟ یہ پانی اور ہوا کا ٹکراؤ ہے کہ پانی کی جو مقدار بوتل میں جاتی ہے، اتنی مقدار میں ہوا خارج ہوتی چلی جاتی ہے اور اِس سے پہلے ہوا نہیں نکلتی ہے اور اس میں (by-force) کام بنتا ہے۔ لہٰذا ہم اِس (nature) میں یعنی خدا کی بنائی ہوئی فطرت میں کہیں بھی خالی جگہ

نہیں دیکھتے ہیں، بلکہ اجسام ہیں اور اُن میں سے اکثر لطیف اجسام ہیں، تو ایک جسم پر دوسرا جسم ٹھہرا ہوا ہے اور کائنات کے اجزاء ہیں کہ یہ اجزاء ایک دوسرے سے متصل ہیں ، دو چیزوں کے درمیان کوئی جگہ خالی نہیں ہے، اب ہم یہ سوچیں گے، کہ اِس کائنات کا مرکز کیا ہے؟ یعنی اِس کائنات کا سینٹر کیا ہے، وسط کیا ہے؟ زمانۂ قدیم میں کچھ حکماء نے سیارۂ زمین کو کائنات کا سینٹر قرار دیا تھا، مرکز قرار دیا تھا، یعنی جس سیّارے پر ہم انسان بستے ہیں اسی کو کچھ حکماء نے اِس کائنات کا سینٹر قرار دیا تھا، بعد میں یہ نظریہ غلط ثابت ہوگیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اِس کائنات کا سینٹر جو ہے، مرکز جو ہے وہ سورج ہے۔ (on the whole) دیکھنے سے یعنی اِس کائنات کو جب بحیثیتِ مجموعی دیکھیں گے تو اِس کا سورج سینٹر پڑتا ہے۔ ہمیں اپنے سر کے اُوپر سورج نظر آتا ہے، یہ بات اِس سیّارے کے اعتبار سے ہے لیکن من حیث المجموع اِس کائنات کو لیں اور اِس کو دیکھیں تو اِس کے اعتبار سے جو سورج ہے وہ اِس کائنات کا سینٹر ہے۔ اب یہاں پر ایک اور سوال اُٹھتا ہے کہ اُوپر نیچے کیا ہے؟ اوپر نیچے، ہر سیّارے کے اعتبار سے ہے اور بحیثیتِ مجموعی اِس کائنات کا کوئی اُوپر نیچے نہیں ہے، نہ کوئی (left) اور (right) ہے۔ اُوپر نیچے کا جو سوال ہے یہ جزوی سوال ہے، مغرب اور مشرق کا جو سوال ہے یہ جزوی ہے، تو میں عرض کر رہا تھا کہ سورج اِس کائنات کا مرکز ہے اور ظاہر بات ہے کہ اگر اِس پوری کائنات کی کوئی کششِ ثقل ہے جس طرح کہ سائنسدان کہتے ہیں یا باہر سے کوئی دباؤ ہے، تو وہ دباؤ سورج میں مرکوز ہونا چاہئے یعنی اِس کائنات کے وسط میں، درمیان میں۔ سائنسدان جس طرح سے توجیہہ کرتے ہیں اور کششِ ثقل کی جو توجیہہ کرتے ہیں وہ اُن کے نزدیک ہیں، کسی طرح سے ہم بھی مانیں گے سمجھنے کے لئے، یہ کہ کششِ ثقل ہے لیکن اِس کا نام رُوحانی علم کے نزدیک کچھ اور ہے۔

جہاں تک ہماری چھوٹی سی عقل رُوحانی علم کے سلسلے میں کام کرسکتی ہے اُس کے مطابق اس کائنات کو ایک طاقت نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور وہ کرسیٔ خدا ہے، ''وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ'' (۲۵۵:۲) خدا کی کرسی نے اِس کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے، اور ظاہر بات ہے، کہ جسم کو رُوح نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح انسان کی ایک رُوح ہے اسی طرح اِس کائنات کی ایک رُوح ہے۔ اسی کائناتی رُوح کو (universal soul) کہا جاتا ہے، اور یہی کرسیٔ خدا ہے، (universal soul) نے اِس کائنات کو دبوچ رکھا ہے اور اِس گرفت کی طاقت کا ایک سینٹر بنتا ہے وہ سورج ہے۔ سورج کو اگر معجزہ کہیں یا نہ کہیں لیکن اُس کی ایک توجیہہ ہے کہ وہ کس طرح روشن ہے، کچھ سائنسدانوں نے اِس کے متعلق کہا کہ یہ (helium gas) ہے اور اِس کا بہت بڑا ذخیرہ ہے لیکن میں سوال کرتا ہوں کہ یہ (helium gas) کہاں سے بنی اور اتنا بڑا ذخیرہ کہاں سے پیدا ہوا؟ اور اتنے ہزار برسوں میں وہ گیس کیسے ٹھہرا ہوا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ گیس نہیں ٹھہرتا، گیس نہیں ٹھہر سکتا، ٹھوس کوئی چیز ہے تو وہ ٹھہر سکتی ہے جو سورج گیس تو ہے میں بھی کہتا ہوں، لیکن میری توجیہہ کچھ الگ ہے اور جس معنیٰ میں کسی سائنسدان نے اِس کو

(helium gas) قرار دیا،(helium) کے نام میں مجھے اختلاف نہیں ہے، گیس کی کیفیت میں بھی اختلاف نہیں ہے لیکن اِس میں اختلاف ہے کہ کسی تصادم سے یا کسی (accident) سے یہ سورج اتنا بڑا ذخیرہ بن گیا، اتنا بڑا ذخیرہ بن گیا اور وہ گیس ہے تو پھر کس طرح ٹھہرا ہوا ہے؟ کیونکہ آپ کو معلوم ہے کسی چیز کا نکاس یعنی (exhaust) گولائی میں ہوتا ہے، تو وہ بڑا جلد خرچ ہو جاتا ہے اور سورج کا جو نکاس ہے وہ کسی ایک طرف سے نہیں ہے، چھ اطراف سے ہے اور گولائی میں ہے اور ہر طرف سے اُس کا نکاس ہے۔ اب اِس کا نکاس اِس قدر بڑی تیزی سے ہو رہا ہے، نکلتا ہے اور اتنی عظیم کائنات میں روشنی اور حرارت بکھرتی جاتی ہے ذرّات، سالمے بکھرتے جاتے ہیں اور جب تک اِس میں ایندھن نہ پڑتا چلا جائے دوسری طرف سے، تو اِس کا وُجود سو برس کیا پچاس برس میں ختم ہو جائے گا کیونکہ کوئی بھی ذخیرہ جتنا بڑا ہے اگر وہ بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے، تو کوئی سوال نہیں ہے کہ وہ خرچ نہ ہو، ختم نہ ہو، نہیں تو موسم میں فرق آتا اگر اُس میں اُس مقدار میں ایندھن نہ پڑتا جس مقدار میں کہ اُس کا (exhaust) ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ (input) اور (output) جو ہے اُس کا بالکل برابر ہے اسی لئے اُس کی گرمی اور روشنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

کچھ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ابھی سورج میں تغیّر آ رہا ہے اور رفتہ رفتہ قیامت کے دن یہ ٹھنڈا پڑھ جائے گا اور اِس کی روشنی ختم ہو جائے گی، ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، تو میں عرض کر رہا تھا کہ سورج اِس کائنات کا وسط ہے، مرکز ہے اور اُس پر نفس کُلی یا کہ (universal soul) کی گرفت کا مرکز بنتا ہے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک لیمو ہے بڑا سا، آپ کے پاس ایسی چھوٹی سی مشین ہے کہ وہ ہر طرف سے برابر دباتی ہے، تو ظاہر بات ہے کہ اِس کا (force) مرکز میں جمع ہو جائے گا۔ آپ کسی لکڑی کو توڑنے کے لئے کوشش کرتے ہیں، اور برابر دونوں ہاتھوں سے برابر پکڑتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ درمیان سے ٹوٹ جائے گی، دائیں ہاتھ کی طاقت، بائیں ہاتھ کی طاقت جو ہے درمیان میں جمع ہو جائے گی اور اُس میں تضاد پیدا ہو جائے گا کہ کسی چیز کے ساتھ ٹیک کے، گھٹنے کے ساتھ یا لکڑی کے ساتھ ٹیک کے دونوں ہاتھوں سے دباتے ہیں تو درمیان سے ٹوٹ جائے گی۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اِس کائنات کو جو طاقت بڑی قوت کے ساتھ پکڑ رہی ہے اور دبا رہی ہے، تو اُس کی درمیان میں، اِس کائنات کے درمیان میں تحلیل ہو رہی ہے، ذرّات کی تحلیل ہو رہی ہے اور وہاں جسم نور میں تبدیل ہو رہا ہے، (burst) ہو رہا ہے اور زوردار دھماکوں کے ساتھ روشنی لہروں کی شکل میں سورج کی گہرائی سے جوش آتا ہے اور روشنی اور حرارت ہر طرف بکھر جاتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ ایندھن/ایتھر اِس دباؤ سے اُس کے اندر پڑتا جاتا ہے اور اسی کیفیت میں سورج کوئی بنی بنائی چیز نہیں ہے۔

سورج کوئی بنی بنائی چیز نہیں ہے، جس طرح زمین کو کہنا چاہیے کہ یہ بنی بنائی چیز ہے، ٹھوس ہے، اِس کی تکوین ہو

گئی ہے،اِس کو کہتے ہیں تکوین،یہ کَون سے ہے،یہ زمین منجمد ہوگئی ہے عرصہَ دراز سے یا کسی گیس سے یا ذرّات سے یا کسی طرح سے اس کی شکل بنی ہے لیکن اِس کے برعکس جو سورج ہے وہ گیس ہے،سائنسدان اِس کا نام (helium gas) رکھ سکتے ہیں، کیونکہ اُن کے نزدیک جو مادّہ ہے،اُس کی (catagories) ہیں،اُس کے درجات ہیں،اُس کے الگ الگ نام ہیں،جس طرح ڈاکٹروں اور طبیبوں کے نزدیک جڑی بوٹیوں کے نام ہیں،اُن کے اجزاء ہیں اور اُن کے الگ الگ نام ہیں،اسی طرح سورج کا جو مادّہ ہے اس کا جو نام سائنسدانوں نے رکھا وہ صحیح ہے،اِس میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن جو اختلاف ہے وہ اِس بات میں ہے کہ اِس طاقت کا پس منظر کیا ہے یعنی کس بنا پر سورج بنتا جاتا ہے،سورج بنتا جاتا ہے،بگڑتا جاتا ہے ،اُس کی روشنی پھیلتی جاتی ہے اور اُس کی جگہ پر نئے ایندھن سے سورج بنتا ہے ،یہ گویا ایک شعلہ ہے کسی (lamp) کا،بڑے (lamp) کا اور وہ گول شعلہ ہے،جس طرح (petromax) یعنی جسے بعض حضرات گیس کہتے ہیں اُس کا شعلہ بنتا ہے اِس طرح وہ ایک شعلہ ہے،تو میں کہہ رہا تھا کہ اِس میں دو حرکتیں ہیں کائنات کے اندر،ایک حرکت روحانی طاقت ہے،کہ نفس کل نے اِس جسم کو بکھر جانے سے روکے رکھا ہے اور اُس کو دبا کے رکھا ہے،(hold) کیا ہے اور اُس کی حرکت مرکز کی طرف ہے اور پھر مرکز سے سورج کی جو (energy) ہے وہ گولائی میں کائنات کی طرف ہے اور پھر اِس طرح سے یہ مادّہ مرکز سے اُوپر کی طرف یا اُوپر سے باہر کی طرف ستون کا کام دیتا ہے،یہ کائنات اپنے آپ ستون ہے کہ اُوپر کے حصے کو گرنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے،تاہم (energy) کی حرکت کا ذکر دو طرح سے ہے،ایک دباؤ باہر سے مرکز کی طرف ہے،ایک حرکت یا پریشر یا دھکا مرکز سے اُوپر کی طرف ہے،باہر کی طرف،تو اِس گفتگو سے آپ کو پتا چلا ہوگا کہ اِس کائنات میں کوئی جگہ خالی نہیں ہے،کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔اب اگر یہ سوال بھی ہو کہ سورج کی جو مقدار ہے وہ ایک خاص مقدار ہے یعنی سورج اِس سے بڑا کیوں نہیں ہے؟اِس سے چھوٹا کیوں نہیں ہے؟ یہ اِس کائنات کے (size) کی وجہ سے ہے اور اِس کائنات کو پکڑنے کے لئے جتنی طاقت درکار ہے (universal soul) کو اِس پر ہے تو جو دباؤ ہے اور جتنا دباؤ چاہیئے،جتنی گرفت کی طاقت چاہیئے اور جس طرح سے نفس کُلی نے اِس کائنات کو (hold) کر کے رکھا ہے اور اِس کا جتنا،جتنے حصے میں اِس کا اثر پڑتا ہے یعنی ایک خاص جگہ پر حد سے زیادہ پریشر پڑتا ہے وہ سورج کا دائرہ ہے،اور اُس مقام پر مادّہ کی تحلیل ہو جاتی ہے اور نور میں تبدیل ہو جاتا ہے یہ سورج ہے،تو اصل بات یا اصل سوال جو تھا وہ یعنی اِس طرح سے تھا کہ یہ کائنات ستونوں کے بغیر کس طرح قائم ہے اور وہ ستون کیسے ہیں جو نظر نہیں آتے ہیں،تو ستون کے نظر آنے کی مثال ظاہر ہے کہ ہم لطیف چیز کو نہیں دیکھتے ہیں۔دیکھیں! چار عناصر کی بات لیجیئے،مٹی کثیف ہے تو ہم آسانی سے اِس کو دیکھتے ہیں،پانی کو ایک طرح سے دیکھتے ہیں ایک طرح سے ہماری نگاہ اُس کو کراس کرتی ہے،بعض دفعہ جو صاف و شفاف پانی ہوتا ہے،تو اُس میں سے ہماری نگاہ آگے جاتی ہے،تہہ تک جاتی ہے،پتہ چلتا ہے کہ سمندر کے نیچے کیا ہے،اور اِس کا

مطلب یہ ہوا کہ مٹّی سے پانی قدرے لطیف ہے اور ہوا پانی سے زیادہ لطیف ہے، تو اِس لئے ہم ہوا کو نہیں دیکھتے ہیں، ہوا کو نہیں دیکھتے ہیں، ہوا جسم ہے، ہوا مادّہ ہے، ہوا رُوح نہیں ہے پھر بھی بعض مادّے ایسے ہیں کہ اُن کو ہماری نگاہ نہیں دیکھ پاتی ہے، تو ہوا کو نہیں دیکھتے ہیں، جس طرح صاف و شفاف پانی کو کچھ دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں دیکھتے ہیں، ہوا کو بالکل ہم نہیں دیکھتے ہیں مگر اُس میں کچھ پانی کے بخارات ملتے ہیں جو بادل کہلاتے ہیں، تو اُس وقت ہوا کی حرکت کو دیکھتے ہیں یا ہوا کو اگر دیکھتے ہیں تو اُس وقت دیکھتے ہیں اِس ہوا میں جب مٹّی مل جاتی ہے، جسے غبار کہا جاتا ہے، تو اُس وقت ہوا دیکھتے ہیں، باقی اپنے طور سے مجرّد اور الگ خالص ہوا کو ہم نہیں دیکھتے ہیں اِس طرح آگ کو، ایندھن میں ہے اور (in action) ہے، تو آگ کو دیکھتے ہیں، جب آگ کام کر چکی ہے، تو ہم آگ کو نہیں دیکھتے ہیں، یہ مثال ہم کسی (lamp) کے شعلے سے لے سکتے ہیں کہ (lamp) کا جو شعلہ ہے جہاں پر اِس کا (feul) ختم ہوتا ہے تو وہ مجرّد ہوتا ہے، حالانکہ وہاں پر لطیف آگ ہوتی ہے ،اِس کو ہم نہیں دیکھتے ہیں، انسان کو مٹّی سے بنایا، جنّ کو آگ سے بنایا، ایک عنصر سے ایک مخلوق کس طرح بنتی ہے؟ لیکن یہ کچھ (indication) کے لئے ہے، (symbol) کے طور پر ہے، دیکھتے ہیں کہ انسان کو چار عناصر سے پیدا کیا گیا، مٹّی، پانی، ہوا، آگ یعنی حرارت ، پھر یہ کیوں کہا گیا کہ انسان کو مٹّی سے اور جنّ کو آگ سے، یہ اشارہ ہے اور (symbolical language) ہے کہ یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ جنّ نظر نہیں آتا ہے اور انسان نظر آتا ہے، ''مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ ''(۵۵:۱۵) ایسی آگ سے جو نظر نہیں آتی ہے، تو ہو سکتا ہے کہ جنّ بھی شروع میں چار عناصر سے ہو لیکن اُس میں لطافت آ گئی تو وہ نظر نہیں آتا، اور جنّات کے اچھے بُرے ہونے کی جو بحث ہے وہ الگ ہے، تو میں عرض کر رہا تھا کہ کچھ (pillers) ہیں جو نظر نہیں آتے ہیں اور اِس کائنات میں جہاں ایتھر ہے وہ نظر نہیں آتا اور ایتھر ہی اُن ستونوں کا کام کر رہا ہے جو نظر نہیں آتے ہیں، اِس کے ساتھ ہم اور زیادہ طول میں نہیں جائیں گے، اِس سوال کے جواب کو ختم کریں گے اور ابھی اِس کا پڑھنا باقی ہے۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ نظرِ ثانی: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: مقالہ: سورۂ لقمان سے اہم سوالات (کتاب سوغاتِ دانش، صفحہ: ۱۴۸)

کیسٹ نمبر: Q-34-B تاریخ: ۸/ جون/ ۱۹۸۴ کراچی

Click here for Audio

اب اِن سوالات کے سلسلے میں جہاں کہیں کوئی ابہام باقی رہا ہو یا کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو یا جہاں کہیں کچھ تشنگی باقی رہی ہو تو اُس کے متعلق میں آپ سے یہ خواہش کروں گا کہ آپ عزیزان الگ الگ سوالات کریں اور یہ ٹھیک رہے گا۔

سوال: [شاہدہ محی الدّین] سر آپ نے سوال نمبر گیارہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جو مومنین ہیں وہ انسانِ کامل جو خدا کا مظہر یعنی امام ہیں، اُس کے وسیلے سے اپنے لئے پوری کائنات کو مسخر پائیں گے اور نہ صرف اُس کی ظاہری بلکہ باطنی نعمتیں بھی جو ہیں اِن کو کسی کمی کے بغیر وہ حاصل ہو جائے گی، تو سر آپ اِس کی تشریح فرمائیں گے، کیسے ممکن ہے؟

جواب: اِن عزیزوں نے جس طرح سے سوال کیا وہ آپ حضرات نے سن لیا، بہت ہی عمدہ سوال ہے، اپنی نوعیت کا بہت اچھا سوال ہے ۔خداوندِ عالم نے جس طرح قرآنِ مقدّس میں ارشاد فرمایا کہ اُس نے تمہارے لئے آسمانوں کو، زمین کو مسخر کر دیا اور اُس نے اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تمہارے لئے پوری کر دیں ۔اِس سوال کے جواب کی تفصیل میں جانے سے قبل یہ تاثر دینا بہتر رہے گا، کہ آیا موجودہ وقت میں انسان جس طرح اِس دنیا میں رہتا ہے اور جو مختصر سی عمر اِس کی ہے اور جیسی اِس کی تھوڑی سی مہلت ہے اِس حالت میں اور اِس کیفیت میں ساری کائنات مسخر ہے، آیا اسی دنیوی زندگی میں اور جسمانی حیات میں اللہ کی سب نعمتیں ہم پر پوری ہو چکی ہیں یا اِس کا سبب کیا ہے؟ تو یہ سمجھنے کی بات ہے، ظاہر ہے کہ خداوندِ عالم جس شان سے کائنات کے مسخر ہونے کا اعلان فرماتا ہے وہ کچھ اور چیز ہے، اور موجودہ وقت میں انسان بہت سی جسمانی کوتاہیوں اور کمیوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، تو اِس کا جواب بس اِس طرح سے ہے کہ انسان موجودہ وقت میں جو زندگی رکھتا ہے یہ اِس کی حقیقی زندگی نہیں ہے، اِس کی ایک اور رُوح ہے، اِس کی ایک اور انا ہے، وہ چوتھی رُوح ہے ،وہ رُوحِ قدسی ہے، مختصراً یہ کہ جس طرح صوفیوں نے اپنے تصور کو پیش کیا ،وہ عمدہ تصور ہے کہا کہ انسانِ کامل، اِس کی (logic) یہ بنتی ہے کہ انسانِ کامل، ہم انسانِ ناقص، ناقص عربی میں وہ چیز جو کم ہے اور کم تر ہے، کامل کا مطلب وہ چیز جو پوری ہے، تو انسانِ کامل کا مطلب انہوں نے یہ لیا اور اِس میں یہ مفہوم رکھا کہ وہ مکمل انسان ہے جیسا کہ انسان ہونا چاہئے، جیسا کہ خدا کا منشاء ہے، اُس منشاء کے مطابق وہ کامل اور مکمل ہے اور ہم کم اور کمتر

ہیں، دیکھیں! انہوں نے جس طرح یہ اصطلاح بنائی، انسانِ کامل تو اُس میں یہ تاثر دیا کہ ہم انسانِ ناقص ہیں اور اِس میں تقاضا یہ کہ ہم بھی کسی نہ کسی طرح سے انسانِ کامل بن جائیں گے۔

پھر انہوں نے انسانِ کامل کو مرشد قرار دیا، پیشوا قرار دیا اور اُس کی پیروی لازمی قرار دی گئی، اِس گفتگو کا خلاصہ یہ نکلتا ہے، کہ انسان جو ناقص ہے اُس کو کامل کے سہارے کی ضرورت ہے تا کہ یہ بھی کامل ہو جائے، یہ تو صوفیوں کی بات ہو گئی، اور اسی طرح اسماعیلی تصور کو لیجیئے کہ اسماعیلی تصور میں ناطق اور اساس مومنین کے ماں باپ ہیں، اور اِس کے لئے اچھی خاصی حدیثیں بھی ہیں اور بہت ساری توجیہات بھی ہیں۔ اچھا! تو پیغمبر اور امام ہمارے رُوحانی والدین ہیں، تو اِس کی منطق یوں بنتی ہے، کہ جس طرح دنیا میں کوئی لائق اور فرمانبردار فرزند اپنے والدین کی طرح بن جاتا ہے، اُن کے مقام کو پاتا ہے، اُن کے رتبے کو پہنچتا ہے، تو اِس میں بھی یہ تصور ہے۔ اِن تمام معنوں میں انسانِ کامل جو مظہرِ نفسِ کُلی ہے، (universal soul) کا مظہر ہے اور نفسِ کُلی وہ ہے جس کو اِس کائنات پر کنٹرول حاصل ہے، جس کے باطن میں بہشت ہے، تو اب اِس سلسلے کے ساتھ خدا نے یہ فرمایا کہ اے انسان! تم جس مقام پر انسانِ کامل ہو، جس مقام پر تم نفسِ کُلی ہو اُس مقام پر ہم نے تم کو یہ کائنات مسخر کر کے رکھی ہے اور اُس مقام پر تم کو اپنی تمام تر نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ اِس بیان کے علاوہ ایک اور چیز میں عرض کرنا چاہوں گا اور اِس پر کافی بات چیت بھی ہو چکی ہے کہ ہر چیز دو مقامات سے گزر کے مکمل ہو جاتی ہے، ایک تو ہے حدِ قوت ہے اور دوسرا مقام ہے حدِ فعل اور خداوند جو اِس سلسلے کا اعلان فرما رہا ہے وہ حدِ فعل کے لئے ہے، ہم اِس وقت حدِ فعل میں نہیں ہیں، حدِ قوت میں ہیں یعنی ایسی حد میں ہیں کہ جہاں پر امکان ہے کہ ہمارا اِس کائنات پر کنٹرول ہو اور ہمیں خدا کی وہ ساری نعمتیں حاصل ہوں یہ۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں قرآن میں کہ خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے کہ ''وَاٰتَاكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ'' (۱۴:۳۴) اور تم نے جو کچھ سوال کیا اور تم نے جو کچھ طلب کیا ہم نے وہ سب کچھ تم کو دے رکھا ہے۔

اب دیکھیں ہم اپنی خواہشات کو بھی نہیں جانتے ہیں کہ ہم نے کیا مانگا، کیا طلب کیا، اِس کی ہمیں کوئی خبر نہیں ہے اور نہ ہمارے پاس اتنی ساری چیزیں ہیں کہ جن کے متعلق خدا یہ ارشاد فرمائے کہ ہم نے وہ ساری چیزیں تم کو دے رکھی ہیں جو تم نے طلب کیا۔ ظاہری بات ہے کہ یہ ہماری انائے علوی کی سطح پر بات ہے کہ انسان یہی نہیں ہے، اِس کے علاوہ بھی ہے یعنی انسان کی ایک اُونچی زندگی بھی ہے، اُس زندگی سے خدا خطاب فرماتا ہے، اُس رُوحِ علوی سے خدا مخاطب ہے، اُس مقام پر انسان کو، سب انسانوں کے لئے کائنات مسخر ہے، اُس مرتبے میں اللہ نے اپنی ساری نعمتیں انسان کو پوری کر دی ہیں، کیا ظاہری نعمتیں اور کیا باطنی نعمتیں۔ اگر ہم اِس محدود زندگی کی اِن محدود نعمتوں کو لے کے یہ کہیں کہ بس اللہ نے ہم کو سب کچھ دے رکھا ہے، پھر تو یہ ناشناسی ہوگی اور ہماری نادانی ہوگی اور ہماری طرف سے یہ سمجھنا ہو

گا کہ بس اللہ کی سلطنت بھی یہی کچھ ہے، بہشت بھی یہی کچھ ہے، نعمت بھی جو کچھ ہمیں حاصل ہے یہی کچھ ہے، تو اِس کا تصور کچھ یوں بنے گا جو خدا کی شان کے خلاف بات ہو گی، لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ انسانِ کامل جو ہے وہ ہماری رُوحِ علوی ہے، جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ مٹی کی رُوح مٹی میں نہیں ہے، مٹی سے الگ ہے لیکن وہ ہے مٹی کی رُوح، وہ کیا ہے؟ رُوحِ نباتی ۔جب مٹی نباتات میں فنا ہو جائے گی تو مٹی کو اپنی رُوح مل جائے گی اور اسی طرح نباتات کی بھی ایک الگ سی اضافی رُوح ہے وہ رُوحِ حیوانی ہے لیکن وہ رُوحِ حیوانی نباتات کے اندر نہیں ہے، اُس کو حاصل کرنا ہے، وہ جانوروں میں ہے اور یہ جو الگ رُوح ہے نباتات کو اس وقت حاصل ہو گی جبکہ نباتات خود کو (devote) کرے جانور کے لئے اور جب نباتات یعنی گھاس پات جانور کی غذا بن جائے گی تو اُس وقت وہ اپنی اُس مقررہ رُوح کو جو خدا نے اُس کے لئے رکھی ہے حاصل کرے [گی]۔ اِس طرح حیوان جو کچھ ہے وہ ختم نہیں ہے اِس کی ایک اور رُوح ہے جو اُس سے الگ ہے اور اِس کے حصول کی شرط ہے یہ کہ حیوان ایسا ہو کہ انسان کے لئے خود کو (devote) کرے، قربان ہو جائے تو تب جو حیوان ہے اُس کو رُوحِ انسانی ملے گی، اِس طرح انسان جو موجودہ وقت میں ہے وہ مکمل نہیں ہے۔ جس طرح صوفیوں کے حوالے سے بات ہوئی تھی کہ صوفیوں نے ایک خاص انسان کو مکمل اور کامل انسان قرار دیتے ہوئے یہ (hint) دیا کہ باقی سب جو انسان ہیں وہ ناقص ہیں، پھر اِس کا تقاضا یہ ہوا کہ یہ ناقص اُس کامل کی پیروی کرے تا کہ یہ بھی اُس جیسا ہو جائے اور کس طرح ہو گا، اِس طرح ہو گا جو نظامِ کائنات ہے، جو قانونِ فطرت ہے، تو قانونِ فطرت کی ابھی ابھی ہم نے تھوڑی سی (study) کی تھی مٹی سے شروع کر کے، یہ کہ ہر ادنیٰ درجہ اپنے سے اُوپر کے درجے میں خود کو (devote) کرے، خود کو فنا کرے، تو انسان کی فنا کچھ اس طرح سے ہے کہ تابعداری کرے، تابعداری کے (sense) میں فنا ہے، تو انسان تابعداری کرے گا اپنے مرشد یعنی امام کی تو اُس وقت امام اپنا نور اُس کو پہنچائے گا، جس طرح کہ پہنچانے کا طریقہ ہے، عبادت میں، بندگی میں، توجّہ میں، محبّت میں، دعاؤں میں اور ارشادات میں اور اسماء میں، کلمات میں اور ہر طرح سے اپنی روشنی کو وہاں پہنچائے گا، اور وہ شخص جو فرمانبردار ہے، جو مومن ہے اپنی چوتھی رُوح کو جو امام ہے اُس کو حاصل کرے گا، اپنی چوتھی رُوح کو حاصل کرے گا اور جب چوتھی رُوح کو حاصل کرے گا تو وہ اندر اندر سے مکمل ہو جائے گا اور پھر اُس وقت جو اللہ نے قرآن میں وعدہ کیا ہے وہ وعدہ اِس انسان کے لئے پورا ہو جائے گا، اور آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں ہر چیز کے لئے شرط ہے، شرائط کی بجا آوری کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاتا ہے، تو تسخیرِ کائنات اور نعمتوں کی تکمیل کے سلسلے میں جو سوال ہوا تھا اُس کا جواب اتنا کافی ہے۔

سوال: [محمّد عبدالعزیز] سر! آپ نے ابھی فرمایا کہ جو جانور ہیں وہ انسان کے اندر (devote) ہوتے ہیں، سر! حیوان کے اندر حرام اور حلال دو قسم کے ہیں تو سر حلال تو ہو جاتے ہیں ٹھیک ہے، سر، حرام کس طرح ہوتے ہیں پھر؟

جواب: انہوں نے اِس گفتگو کے (refrence) سے ایک اور عمدہ سوال کو اُٹھایا اور یہ سوال ہونا چاہئے، سوال کا اصل مرکز یا اہم مقام یہ ہے، کہ انہوں نے کہا، جہاں اِس ارتقاء کے سلسلے میں جانوروں کو انسان کی طرف عروج کر جانا چاہئے تو اِس میں ہم دیکھتے ہیں کہ سب جانور حلال نہیں ہیں اور کچھ جانور حلال ہیں اور کچھ جانور حرام ہیں اور حلال جانوروں کی انسان سے رسائی ہے، (approach) ہے، اِس کے برعکس جو حرام جانور ہیں وہ انسانوں سے الگ تھلگ ہیں، یہ اِن کا سوال ہے، بڑا عمدہ سوال ہے۔ (long run) میں دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اِس دائرۂ کائنات کے اندر جو مخلوقات پائی جاتی ہیں اُن کے آپس میں کسی نہ کسی طرح سے تعلقات ہیں، (relations) ہیں وغیرہ۔ ایک تو یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز انسانی فائدے کے بغیر نہیں ہے، کوئی جانور کھانے کے لئے ہے، تو کوئی جانور سواری کے لئے ہے، کوئی جانور شکار کے لئے ہے، اور کچھ جانور ایسے ہیں کہ اُن سے دواؤں کا فائدہ ہوتا ہے اور کچھ جانور ایسے ہیں کہ اُن میں (study) ہوتی ہے، ریسرچ ہوتی ہے اور اُن میں یعنی علم کی گوناگونی ہے، غرض یہ کہ کوئی چیز انسانی فائدے کے بغیر نہیں ہے، اور دنیا جس طرح مادّی علوم میں آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اِس طرح پتا چلتا ہے کہ کوئی چیز خالی از حکمت اور خالی از علم نہیں ہے اور خالی از فائدہ نہیں ہے، تو یہاں پر فائدہ مقصود ہے صرف کھانے کی بات نہیں ہے، صرف کھانے کی بات نہیں ہے بلکہ اِس میں جو اِس سیڑھی کے جو زینے ہیں وہ الترتیب انسانیت کی طرف آتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ایک اور بات ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کچھ بیماریاں بھی ہیں اور اُن بیماریوں کے جراثیم کو ختم کرنے کے لئے کچھ جانور ہیں، کچھ پرندے ہیں، اِس کے علاوہ کچھ جانور ایسے بھی ہیں جو حلال جانوروں کی غذا بن جاتے ہیں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ (long run) میں جو سارا فائدہ ہے وہ انسان کی طرف آرہا ہے۔ اِس معنیٰ میں اور اِس کے علاوہ رُوحانیت میں بھی بہت سارے عجائب وغرائب ہیں اور اِن تمام باتوں کے نتیجے میں یہ پتا چلتا ہے، کہ اِس پوری کائنات اور اِس کے اندر جتنی مخلوقات ہیں اُن سب کا فائدہ انسان کو حاصل ہے، اب یہاں پر رُک کر قرآنِ مقدّس کا ایک حوالہ پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ خداوندِ عالم نے نوحؑ سے ارشاد فرمایا کہ اے نوح! اب جو طوفان برپا ہو رہا ہے اِس میں دنیا کی ہر چیز ہلاک ہو جائے گی، یہاں تک کہ نباتات، جانور اور ہر چیز ہلاک ہو جائے گی، اِس کے لئے ایسا کرو کہ دنیا کی تمام نسلوں کے دو دو جوڑے اپنی کشتی میں لے لو تا کہ دنیا میں جتنے جانور ہیں اُن کی نسل کا خاتمہ نہ ہو جائے (۱۱:۴۰)۔ بہت دلچسپ بات ہے اور اِس میں تاویل کا پہلو بھی ہے، ایک سوال تو یہ کریں گے کہ اگر دنیا میں بہت سے جانور خود از خود پیدا ہوئے ہیں جو انسان کے مفاد کے لئے نہیں ہیں تو یہ حکم کیوں ضروری ہوا کہ ہلاکت سے جانوروں کو بچانے کے لئے اُن کے دو دو جوڑے لے لئے جائیں، حرام، حلال، اچھے بُرے وغیرہ۔ ہلاک ہونے دینا چاہئے تھا، جس طرح کافروں کی ہلاکت سے خدا کو پرواہ نہیں تھی، پیغمبر کو پرواہ نہیں تھی، تو اُن جانوروں کا کیوں یہ خیال پیدا ہوا یا یہ غم خواری کیوں ہوئی؟ کیا یہ جانوروں کی خاطر سے یا انسانوں کی خاطر سے ہے؟۔ اِس

سے بہت بڑے راز کا انکشاف ہوتا ہے اور یہ اشارہ مل جاتا ہے کہ دنیا بھر میں جتنے جانور ہیں اُن میں انسان کے لئے فائدہ ہے، ایک بات۔ دوسری بات یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کشتیٔ روحانی تھی یا کشتیٔ جسمانی، اگر کشتیٔ جسمانی کی بات ہے تو ظاہری کشتی آج بھی شاید کسی بڑی حکومت کے (museum) میں، عجائب خانے میں موجود ہے، کیونکہ کچھ برس ہوئے جو اخبار میں آیا تھا کہ کشتیٔ نوح جو ظاہری کشتی تھی کسی پہاڑ کی چوٹی سے، کسی یخ بستہ پہاڑ کی چوٹی سے ملی تھی، جہاز کے بننے کے کافی عرصے بعد اُو پر سے نظر آیا کہ پہاڑ کی چوٹی پر جو یخ بستہ پہاڑ کی چوٹی تھی اُس میں کوئی کالی کالی چیز نظر آئی تو پھر وہاں کی حکومت نے اُس تک رسائی کر کے کشتی کو لے آیا، تو اِس کے لئے کافی عرصہ گزر گیا، اخبار میں آیا تھا، جب اخبار میں آیا تھا تو (mir of hunza) نے اِس اخبار کو نکال کے دربار میں یہ بات کہی، اتفاق سے میں اُس روز اُس دربار میں میں تھا اور میری جیب میں بائبل ترکی میں یا کس زبان میں تھی، اُس کو نکالا اور سائز کو دیکھا تو جو اخبار میں کشتی کا سائز لکھا گیا تھا وہ وہی سائز تھا جو بائبل میں تھا لیکن اِس سے پتا چلا کہ وہ کشتی بہت زیادہ بڑی نہیں تھی۔

اب ایک ایسی کشتی میں دنیا بھر کے جانوروں کے جوڑے کیسے آسکتے تھے، کوئی بھی حقیقت کی بات ملتی ہے تو ذرا (approach) کرنے سے، ذرا ریسرچ کرنے سے، ذرا عقل سے کام لینے سے پتا چلتا ہے اور آپ کو معلوم ہے، کہ دنیا میں کتنے جانور ہیں، بے شمار، بے شمار قسم کے جانور ہیں، پرندے، چرندے اور تمام جانور جو متضاد ہیں یعنی کہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اِس سے پتہ چلا کہ ظاہری کشتی کے علاوہ بھی نوحؑ کی ایک باطنی، رُوحانی کشتی تھی اور اُس رُوحانی کشتی میں بشکل ذرّات اِن تمام جانوروں کو بچانا تھا کیونکہ خدا یہ نہیں چاہتا تھا کہ اِس دنیا کو ختم کرے۔ اِس گفتگو سے پتا چلا کہ دنیا میں جتنے جانور ہیں وہ سب انسان کے فائدے کی خاطر ہیں، کسی میں غذا کا فائدہ ہے، کسی میں کھال کا فائدہ ہے، کسی میں (fur) یعنی جو نرم بال ہوتے ہیں، کسی میں اُون کا فائدہ ہے، کسی میں سواری کا فائدہ ہے، کسی میں کسی دوا کا فائدہ ہے، کوئی جانور ایسا بھی ہے کہ وہ عجیب وغریب ہے، تو کسی میں یعنی پروں کا فائدہ ہے، کسی میں (study) ہے، اور کوئی جانور ایسا بھی ہے جو دوسرے جانور کے لئے جو (direct) انسان کو (approach) کرتا ہے اُس کے لئے اُس میں فائدہ ہے، غذا ہے، کچھ جانور ایسے ہیں کہ وہ جراثیم کو چن لیتے ہیں، کھا جاتے ہیں، کچھ جانور ایسے ہیں کہ اُن میں بیماری جذب ہو جاتی ہے، کچھ جانور ایسے ہیں کہ اُن میں عجائبات ہیں، عجائبات ہیں، تو انسان کو اپنے ماتحت مخلوقات پر بادشاہ بنایا گیا ہے، اِس موجودہ زندگی میں بھی، میں رُوحانی سلطنت کی بات نہیں کرتا ہوں اور یہ خداوندِ عالم کا قانون ہے۔ جیسے جمادات پر نباتات بادشاہ ہیں، نباتات پر جانور بادشاہ ہیں، جانوروں پر انسان بادشاہ ہیں اور انسان بھی ایک جیسے نہیں ہیں، جو دانا ہے وہ نادان پر بادشاہ ہے۔ ممالک کو دیکھیں کہ کہیں کوئی (minister) ہے، کہیں کوئی (presedent) ہے، کہیں کوئی بادشاہ ہے، وہ ایک شخصیت ہے، اُس نے اپنے (power) سے، اپنی سیاست سے، اپنی عقل سے باقی سب کو اپنا (subject) بنایا ہے، اپنی

رعیّت بنایا ہے، اِس سے ظاہر ہے کہ انسان جب عقلی طور پر آگے بڑھے گا، رُوحانی طور پر جب ترقی کرے گا تو لازمی طور پر یہ کائنات کو مسخر کرے گا۔ آج کا سائنسدان اِس سے قبل کے سائنسدان سے اِس قدر آگے ہے، اِس کی وجہ کیا ہے، اِس کی وجہ علم ہے، تحقیق ہے، ہنر ہے، تو آپ نے جو عمدہ سوال کیا تھا اُس کے سلسلے میں اتنا عرض کیا گیا اور یہ کافی ہے، شکریہ۔

سوال: [شہناز سلیم] سر! شاید صرف الفاظوں سے (confusion) ہے یا کچھ، سر دوسری جو آیت ہے سورۂ لقمان کی، کئی آیتیں ہیں ایک پُرحکمت کتاب کی اِس میں آیات سے آپ نے مراد اساس، ناطق اور عقلِ کُل کو لیا ہے جبکہ پُرحکمت کتاب سے آپ نے امام کی ذات مراد لیا ہے، تو مفہوم یوں ہوگا کہ عقلِ کل، نفس کل، ناطق اور اساس امام کی آیات ہیں، تو سر ظاہری طور پر ہم یوں کہتے ہیں کہ امام اُن کی آیت ہے یا مظہر ہے اور یہاں پر (sense) ذرا بدلا ہوا نظر آتا ہے، تو یہ صرف الفاظ کی بات ہے یا اِس میں کوئی گہری حکمت بھی ہے؟

جواب: سوال آپ نے سُن لیا اور کافی گہرائی سے سوچا گیا ہے اور عمدہ سوال ہے اور قابلِ تعریف ہے، اِس گہرائی اور گرفت کا اندازہ ہوتا ہے، کہ انہوں نے کس طرح سوال کو لیا ہے، عرض یہ ہے کہ کتاب کے سلسلے میں جو اشیاء آتی ہیں یعنی جن اشیاء سے یا جن چیزوں سے کام لے کر کتاب بنائی جاتی ہیں اُس میں جو آخری شئ ہے وہ کتاب قرار پاتی ہے، مثلاً کتاب کے سلسلے میں سب سے پہلے قلم ہے اور لوحِ محفوظ ہے، یہ تو ایک رُوحانی تختی ہے، پھر رقیم ہے جو رُوحانی تحریر ہے۔ اب چونکہ کتاب قلمِ الٰہی سے ہو کے لوحِ محفوظ پر نازل ہوتے ہوئے اور لوحِ محفوظ پر نقشِ تحریر قرار پاتے ہوئے اور پھر اُس کے بعد دنیا میں کتاب نازل ہوئی، تو حدود کے لحاظ سے دیکھیں کہ عقلِ کُلی ہے اور نفس کُلی ہے اور وہ رُوحانی تحریر ہے۔ پھر آپ دیکھیں کہ ناطق مظہرِ قلم ہے، اساس مظہرِ لوح ہے، تو جہاں امام مظہرِ رقیم ہے، جسمانیت میں، تو اِس میں ترتیب جو ہے اِس میں امام سب سے آخر میں آتے ہیں۔ مظہریت میں بھی سب سے آخر میں آتے ہیں لہٰذا کتاب کے سلسلے میں بھی، کتاب چونکہ آخری چیز ہے سو ''الٓمّٓ۔ تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيْمِ'' (۳۱:۱۔۲) کا مطلب بھی یہی ہوا کہ امام جو ہے آخری درجہ رکھتے ہیں لہٰذا یہ جو آیات ہیں وہ اِس کتاب کی آیات ہیں اور امام مجموعہ ہیں۔ اِس لئے امام ہی کتاب قرار پاتے ہیں اور چونکہ کتاب کو ہمیشہ ہونا چاہئے اور چونکہ کتاب کی لوگوں سے رسائی اور لوگوں کو کتاب سے رسائی ہونی چاہئے اور یہ بات بھی امام پر صادق آتی ہے، کہ اگر لوگوں کی رسائی عقلِ کُل تک ہوتی جو قلمِ الٰہی ہے، نفس کُل تک ہوتی جو لوحِ محفوظ ہے اور رُوحانی تحریر تک ہوتی جو رقیم ہے، ناطق تک ہمیشہ رسائی ہوتی اور اساس تک ہمیشہ رسائی ہوتی تو اِن میں سے کوئی درجہ اِن لوگوں کے لئے کتاب قرار پاتا، ایسا نہیں ہے، کتاب کا اصل (sense) لوگوں سے رسائی ہے، لہٰذا، اور یہی وجہ ہے کہ اساس کو اُمُّ الکتاب کہا گیا اور باقی اماموں کو اپنے اپنے وقت کی کتاب قرار دیا گیا، اِس میں سب سے بڑی روشن دلیل یہ ہے اور ہمارے بزرگانِ دین نے تاویلات کی کتابوں میں جہاں بھی کتاب کی تاویل کی اُس سے امام کو مراد لیا اور یہی

سبب ہے کہ امام کتاب ہے لیکن کتابِ ناطق ہے اور قرآن کتاب ہے لیکن کتابِ صامت ہے اور جو کتابِ ناطق ہے اُس کا دوسرا نام نور ہے اور جو کتابِ صامت ہے وہ قرآن ہے۔ جیسے قرآن میں آیا ہے کہ خدا نے تمہاری طرف نور کو بھیجا اور کتاب کو بھیجا[۵:۱۵] نور کا ذکر پہلے ہے، کتاب کا ذکر بعد میں ہے، اِس کی بھی وجہ ہے، وجہ یہ ہے کہ رسول اپنے وقت میں نور تھے اور کتاب قرآن تھی، تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے اِس عمدہ سوال کے لئے مناسب جواب یہی ہے، کہ اِن آیات کی کتاب امام ہے یعنی مجموعہ، کتاب سے مجموعہ مراد ہے، آیات کا مجموعہ کتاب کہلاتا ہے، تو اگر اِس میں پھر بھی کوئی تشنگی ہو تو ہم اور اِس میں اضافہ کر سکتے ہیں، شکریہ، میرے خیال میں ٹھیک ہے۔

سوال: [محی الدّین] سوال نمبر ۱۵ کے ریفرینس سے ہے، تو آپ نے لکھا تھا کہ انبیاء اور ائمہؑ ہر ایک اپنے وقت کا نفس واحدہ ہوا کرتا ہے جو اپنی ذات میں ایک ہوتا ہے اور خلائق کے تمام نفوس کو اپنے ساتھ ایک کر لیتا ہے اور ہر ایک یعنی غیر شعوری طور پہ ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور آگے پھر لکھا ہے آپ نے، کہ عظیم رُوحیں جو ہیں صراطِ مستقیم میں ترقی کر کے آگے بڑھ چکی ہیں، تو جب کہ نفس واحدہ جو ہے امام اور پیغمبر نفس واحدہ ہیں اور سارے نفوس جو ہیں غیر شعوری طور پہ اُن کی تخلیق اور تکمیل میں ساتھ ہوتی ہیں، تو اِس کے بعد پھر عظیم رُوحیں اور آگے بڑھنے کا نفس واحدہ سے اِس کے سلسلے میں۔

جواب: عمدہ سوال ہے اور بہت ہی اچھی طرح سے انہوں نے سوچا ہے اور ایسے سوالات سے فائدے ہوتے ہیں، یہ سب سے پہلے جُز جُز کر کے بات کریں گے یہ کہ یہ جو کہا گیا کہ انبیاء و ائمہ صلوات اللہ علیہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے، ہر ایک اپنے وقت کا نفس واحدہ تھا، اِس کا ریفرینس اس طرح سے عرض کروں گا کہ ایک حدیث ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ وَ الْاَنْبِیَاءُ کَنَفْسٍ وَاحِدَة (کتاب: شہدِ بہشت صفحہ ۱۶۸)، مومنین کی یگانگت و وحدت یہ ہے، کہ وہ بھائی بھائی ہیں اور پیغمبروں کی وحدت یہ ہے کہ وہ ایک نفس واحدہ کی طرح ہیں، ایک جان کی طرح ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السّلام ایک گروپ کی شکل میں موجود ہوتے ہوئے اور ایک ہی زمانے میں ایک ساتھ رہتے ہوئے نفس واحدہ کی طرح ہیں یا یہ کہ اُن کی ذات میں سب انبیاء کے نفوس جمع ہیں، بہت عمدہ سوال ہے یہ۔ اِس کا جواب اِس طرح سے ہونا چاہئے کہ ہر پیغمبر اپنے وقت میں نفس واحدہ تھا اِس معنیٰ میں کہ سب انبیاء علیہم السلام کی ارواح، سب کی رُوحانیت اُس میں جمع تھی اور اِس طرح آنحضرتؐ اپنے وقت میں نفس واحدہ تھے اور اُن کی ذات میں تمام مخلوقات اور جملہ انبیاء جمع تھے، نفس واحدہ اس معنیٰ میں۔ کیونکہ ابھی یہاں نفس واحدہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ نفس واحدہ کا مطلب ہے وہ نفس جو اپنی ذات میں ایک ہے اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ ایک کر سکتا ہے، واحدہ یہ گرامر کے لحاظ سے اِس کا وزن فاعلہ ہے، فاعلہ، فاعل اور فاعلہ میں کوئی فرق نہیں، اِس میں صرف تذکیر و تانیث کا فرق ہے یعنی فاعل کا جو لفظ ہے وہ کام کرنے کے معنیٰ میں ہے، تو نفس واحدہ کا مطلب ہے کہ وہ نفس یعنی وہ رُوح جو اپنی ذات میں ایک

ہے اور دوسرے سب کو بھی اپنی ذات کے ساتھ ایک کرسکتا ہے،اورنفس واحدہ کی رُوحانی ترقّی کے سلسلے میں باقی سب لوگ لاشعوری طور پر ساتھ ہوتے ہیں، کیونکہ قیامت دو قسم کی ہے،ایک غیر شعوری طور پر ہے اور ایک شعوری طور پر ہے اور غیر شعوری کا مطلب یہ کہ کسی کامل انسان کی قیامت برپا ہو جاتی ہے،تو اُس میں سب لوگ ذرّات کی صورت میں ہوتے ہیں، چونکہ قیامت عالمِ ذر میں برپا ہوتی ہے لیکن عالمِ ذر کو پتا نہیں چلتا ہے، عالمِ ذر کا معنیٰ ،مطلب ذرّات کی دنیا اور ذرّات سے لوگوں کی رُوحیں اور تمام چیزوں کی رُوحیں مراد ہیں ۔ اِس لئے نفس واحدہ اس معنیٰ میں تمام لوگوں کو ایک تو ذرّات کی شکل میں اپناتا ہے، اُن کو اپنے ساتھ ایک کرتا ہے اور اِس سوال کے سلسلے میں یہ کہ راستہ ایک ہے، سب لوگ ایک ہی راستے سے آگے بڑھتے ہیں اور اصل سوال پر اب میں آتا ہوں، وہ یہ تھا کہ عظیم رُوحیں آگے بڑھ چکی ہیں، اِس آگے جانے کا مطلب یہ نہیں کہ عظیم رُوحیں انبیاء و ائمہ سے بھی آگے بڑھ چکی ہیں، آگے سے صرف مراد اتنا ہے کہ یہ ناقص سے کامل ہو گئی ہیں، عظیم رُوحیں یعنی اپنے مقام کو پا چکی ہیں، اصل سے واصل ہوگئی ہیں اور جو آخری مقام ہے اُس تک اِن کی رسائی ہو گئی ہے اور جس طرح کچھ دیر پہلے یہ بات ہو چلی تھی، صوفیوں کی مثال دے کر اور اسماعیلیوں کی مثال دے کر ۔ صوفیوں کی یہ مثال دی گئی تھی کہ وہ ناقص انسان اور کامل انسان کا تصور رکھتے ہیں، اسماعیلیوں کی مثال یہ دی گئی تھی کہ اسماعیلیوں میں بھی یہ بات ہے لیکن صرف مثال کا فرق ہے، وہ کامل انسان کو ماں باپ کہتے ہیں ۔

اِس میں جس طرح ایک بچہ ماں باپ کی طرح ہو جاتا ہے یہ مثال ہے، اُس میں جس طرح ایک ناقص کامل ہو جاتا ہے وہ مثال ہے، لیکن دونوں کی رُوح ایک ہے، کوئی فرق نہیں، تو اِس میں جو (relation) ہے، بہت مضبوط ہے، اور شاید یعنی بات میں (force) بھی زیادہ ہے، کہ ایک بچے کو باپ کی طرح جو ہے ہونا لازمی بات ہے، ضروری ہے، صرف ایک اِس میں استثنیٰ ہے یہ کہ اگر فرزند نالائق ہے، تو وہ اپنے ماں باپ کی طرح نہیں بن سکتا۔ اگر فرزند لائق بھی ہے اور فرمانبردار بھی ہے تو یہ لازمی بات ہے کہ بچہ اپنے والدین جیسا ہو سکتا ہے ۔ خیر اِس فرق کو چھوڑیں تو پھر اصل سوال اور اُس کے جواب کی طرف رُجوع کریں یہ کہ عظیم رُوحیں آگے بڑھ چکی ہیں کا مطلب جو صراطِ مستقیم ہے، جو صراطِ مستقیم ہے اسی رستے سے آگے بڑھ چکے ہیں، صراطِ مستقیم کی جو منزل ہے اِس تک اُن کی رسائی ہو چکی ہے، تو میرے خیال میں اِس سوال کا تقاضا اتنا تھا، شکریہ، مہربانی ۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ نظرِ ثانی: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: خدا کی تین کتابیں: قرآن، کائنات اور نفس

کیسٹ نمبر: Q-35-A   تاریخ: ۲۳؍ جون؍ ۱۹۸۳، کراچی

جس زمانے میں قرآنِ مقدس نازل ہو رہا تھا، اُس زمانے میں ارشاد ہوا۔ گویا جو کچھ ارشاد ہوا وہ پیش گوئی کی حیثیت رکھتا ہے اور فرمایا گیا کہ: "سَنُرِيهِمْ اٰيَاتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ" (۴۱: ۵۳) خداوند فرماتا ہے، کہ ہم اُن کو عنقریب یعنی آگے چل کر دکھائیں گے اپنی نشانیاں اِس کائنات کے ظاہر میں اور اُن کے نفوس میں اور یہاں تک دکھاتے رہیں گے، کہ وہ کہنے لگیں گے کہ وہ خدا برحق ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ خداوندِ عالم اُن لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتا ہے جو رُوحانی مشاہدے کے درجے پر نہیں ہیں یا جو انکار کرتے ہیں، تو اُن کو مستقبل میں نشانیاں یا معجزات بتانے کے لئے فرمایا۔ یہ معجزات یا کہ نشانیاں پہلے کائنات میں دکھائی دیں گے اور پھر اُن کے اپنے نفوس میں یعنی اُن کی ذات میں اور اِسی طرح جس حدیث کے بارے میں سوال اُٹھا تھا وہ حدیث یہ ہے: "اِنَّ اللّٰهَ اَسَّسَ دِيْنَهٗ عَلٰى اَمْثَالِ خَلْقِهٖ لِيُسْتَدَلَّ بِخَلْقِهٖ عَلٰى دِيْنِهٖ وَ بِدِيْنِهٖ عَلٰى وَحْدَانِيَّتِهٖ" بے شک خدا نے اپنے دین کی بنیاد اپنی مخلوق پر رکھی یا کہ اپنی مخلوق کی طرح اپنے دین کی بنیاد رکھی، تا کہ مخلوق سے دین کی مثال لی جائے اور دین سے اُس کی توحید کی مثال لی جائے۔ اب توحید کے لئے کوئی مثال ہے تو وہ دین میں ہے اور دین کے لئے کوئی مثال ہے، تو اِس دنیائے ظاہر کی خلقت میں ہے اور اِس میں یہ کہا گیا ہے، کہ قرآن جو دین ہے، کائنات جو خدا کی کھلی کتاب ہے، نفسِ انسانی جو خدا کی رُوحانی کتاب ہے، تو خدا کی اِن تین کتابوں میں خدا کی آیات پائی جاتی ہیں جتنی بھی ہیں۔ اب یہ بات تو ناممکن ہے [کہ] خدا کی اِس ظاہر کتاب میں یعنی قرآن میں کچھ اور رہو اور خدا کی عملی اور کھلی کتاب میں جو کائنات ہے اُس میں کچھ اور رہو اور خدا کی پوشیدہ اور رُوحانی کتاب جو انسان کی ذات ہے اُس میں کچھ اور رہو، یہ تو ناممکن بات ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے اور یہ یقین رکھنا چاہئے کہ اِن تینوں کتابوں کے درمیان ہم آہنگی اور یک جہتی پائی جاتی ہے۔ یاد رکھیے بھولیے نہیں! کہ خدا کی تین کتابیں ہیں، ایک قرآن ہے جس میں سب آسمانی کتابیں جمع ہیں، خواہ توراۃ ہے، انجیل ہے، زبور ہے یا صُحُف تو وہ کاغذ پر ہے۔ دوسری کتابِ کائنات ہے یہ کھلی ہے اور (action) میں ہے، حرکت میں ہے اور ظاہر ہے، یہ اپنے آپ کو پڑھتی ہے۔ ایک وہ کتاب ہے جسے کتابِ نفس کہا جاتا ہے یا کتابِ رُوح کہا جاتا ہے یا کتابِ رُوحانیت کہا

جاتا ہے، تو یہ تین کتابیں ہیں اور اِن کے آپس میں کُلی طور پر ہم آہنگی پائی جاتی ہے یعنی اِن کا قانون، اِن کا اُصول اور اِن کا طریق کار ایک سا ہے۔ اب قرآن میں جس غور وفکر کا ذکر آیا ہے اُس کا تعلق اِن تین کتابوں سے ہے، قرآن سے بھی ہے، صفحۂ کائنات سے بھی ہے اور کتابِ نفس سے بھی ہے۔ اِس لئے کہا گیا کہ اِن آفاق و انفس اور خدا کی آخری کتاب میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اِسی میں اور اِنہی آیات میں غور کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے، تو یہ ہے آپ کے اُس سوال کا جواب جو ایک آیت اور ایک حدیث کے بارے میں کیا تھا، تو غور وفکر آیات میں ہے اور آیات کے تین مقام ہیں: قرآن مِقدّس، کائنات اور انسان کی ذات۔ اب اگر یہاں ترتیب کے بارے میں بھی سوال کرنا ہے کہ پہلے کس مقام کی طرف توجہ دینی چاہیے تو وہ بھی عرض کی جاتی ہے، کہ سب سے پہلے قرآن کو لینا چاہیے پھر اپنی ذات کو اور اُس کے بعد کائنات کو یا یہ ہے، کہ یہ کام بیک وقت کیا جائے کیونکہ یہ تین کتابیں ہیں اور حقیقت میں ایک ہی کتاب کی حیثیت رکھتی ہیں، تو اِس لئے کچھ قرآن میں اور کچھ اپنی ذات میں اور کچھ اِس کائنات میں غور کیا جائے۔

اسلام کے قوانین میں سے ایک قانونِ شہادت ہے یعنی گواہی کا اُصول یا کہ گواہی کا ضابطہ، تو اُس کے بارے میں اکثر معاملات میں دو شہادتوں کی ضرورت ہوتی ہے، دو معتبر شہادتیں چاہئیں کسی واقعے کی دُرستی کے لئے یا کسی واقعے کے ثبوت کے طور پر دو شہادتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کی ہر آیت اور قرآن کی ہر بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق ہے اور اِس میں ذرا بھی شک نہیں لیکن یہ دیکھنے کے لئے کہ آپ کسی حقیقت کو سمجھ رہے ہیں یا نہیں، تو آپ کو دو شہادتوں سے تصدیق کرنی ہوگی یعنی قرآن کی کوئی حقیقت جیسی ہے اگر آپ نے اُس کو صحیح معنوں میں سمجھ لیا ہے، تو اِس حقیقت کا ثبوت ایک تو کائنات سے ملے گا، اور ایک آپ کی اپنی ذات سے ملے گا۔ مثال کے طور پر قرآن میں ہے، کہ خدا کی رسّی مسلسل ہے اور اٹوٹ ہے وہ ہمیشہ دنیا میں پائی جاتی ہے یا یوں کہا جائے کہ خدا کا جو نور ہے وہ کبھی بجھتا نہیں ہے اور دنیا میں ہمیشہ حیّ و حاضر ہے۔ اب اِس نورِ خدا سے ہم امامؑ کی ذات کو مراد لیتے ہیں۔ ہم اِس کی شہادت کائنات سے لینا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی ذات سے بھی لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دین میں جو نور ہے، جس کا ذکر قرآن میں نور کے مضمون میں پایا جاتا ہے، تو دین میں جو نور ہے اُس کی مثال کائنات میں کیا ہے؟ اُس کی شہادت اِس دنیائے ظاہر میں کیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ سورج ہے، ٹھیک! تو صحیح ہے کہ جس طرح قرآن نے کہا کہ نورِ خدا ایک زندہ حقیقت ہے وہ کبھی بجھتا نہیں ہے، تو ہم نے کائنات میں دیکھا تو واقعاً اِس کائنات کے اندر بھی جو نور ہے وہ بھی ہمیشہ دنیا میں موجود ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ غائب ہوا اور مدّتوں کے لئے اور عرصے کے لئے دنیا سے غائب رہے، تو ایک شہادت ہم کو یہاں اِس کائنات سے ملی، صحیح ہے۔

اب دوسری شہادت کے لئے ہم اپنی ذات میں دیکھتے ہیں، کہ اپنی ذات میں وہ کونسی چیز ہے جس کو بہت بڑی

اہمیت حاصل ہے، اتنی اہمیت جتنی کہ اِس کائنات میں سورج کو حاصل ہے اور جتنی کہ دین میں نور کو حاصل ہے، تو ہم اپنی ذات کے اندر عقل کو پاتے ہیں، جو وہ ایک نور کی طرح ہے، تو ہم نے دیکھا کہ عقل کو بھی ہمیشہ قائم رہنا چاہیے کہ اگر انسان کی ذات کے اندر سے عقل غائب ہو جائے، تو ہستی کا نظام درہم برہم ہو جائے اور آدمی پاگل ہو جائے، دیوانہ بن جائے پھر اُس کی زندگی جو ہے مٹّی کے برابر بن جائے گی، تو ٹھیک ہے کہ قرآن نے جو کہا کہ نورِ خدا ہمیشہ دائم و قائم ہے، اور جس سے اسماعیلیوں نے امام کو مراد لیا اور پھر ہم نے دیکھا کہ اِس کی شہادت کائنات سے بھی ملتی ہے اور انسان کی ذات سے بھی ملتی ہے۔ کائنات سے اِس طرح ملتی ہے کہ جو سب سے بڑی طاقت ہے وہ دنیا سے غائب نہیں ہو سکتی ہے، جو سب سے بڑی طاقت ہے روشنی کی طاقت ہے جو قوتوں کا سرچشمہ ہے کہ اگر وہ غائب ہو جائے، تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے اور اِسی طرح انسان کی شخصیت میں بھی ہم نے دیکھا کہ جو سب سے بڑی طاقت ہے وہ عقل ہے، تو اُس کو لازمی طور پر انسان کے اندر ہمیشہ کے لئے جتنے عرصے تک انسان کی زندگی ہے اور جو عمر ہے اُس کے لئے یعنی عمر بھر کے لئے اور زندگی بھر کے لئے اِس قوت کو قائم و دائم رہنا چاہیئے۔ اِسی طرح ہم نے یہ اُصول اور یہ قانون دیکھا کہ ہر قرآنی حقیقت کے لئے دو شہادتیں چاہئیں، تو پھر کوئی مومن یہ سمجھ سکتا ہے کہ جو کچھ وہ سمجھ رہا ہے وہ صحیح ہے، کیونکہ خدا نے قرآن، کائنات اور نفس انسانی ایک ہی قانون کے موافق بنایا ہے تاکہ کوئی دانشمند قرآن کی کسی بات کی شہادت کائنات سے بھی دے اور انسان کی اپنی ذات سے بھی دے، اور اِن دو شہادتوں کے بعد، دو گواہیوں کے بعد اُس کو تسلّی ہونی چاہیئے کہ اُس نے جو کچھ معنی کیے ہیں یا جیسا ترجمہ کیا ہے یا جیسی تاویل ہے وہ بالکل صحیح ہے، تو یہ ہے قانونِ شہادت قرآنی حقائق کے سلسلے میں اور اِس سلسلے میں ایک آیت بھی ہے میں آپ کو بتاؤں گا کہ اُس آیت میں اِسی قانون کا ذکر ہے کہ خدائے جلیل و جبّار کہتا ہے کہ اُس نے ہر حقیقت کی شہادت انسانی نفس سے بھی اور کائنات سے بھی دی ہے (۵۱:۲۰۔۲۱)۔ ایک تو آسمانی کتاب ہے اور وہ دو کتابیں جو ہیں وہ شہادت کے لئے ہیں اور اِسی میں ہم آہنگی کی بات بھی ہوئی اور اِن کے آپس میں یعنی یک جہتی بھی ہوئی، تو اور ہوشمند انسان یہ سمجھ سکتا ہے، کہ قرآن کے ہوتے ہوئے کائنات کی اور نفس انسان کی کیا اہمیت ہے۔

اب اگر کوئی شخص حصولِ معرفت کے سلسلے میں اپنی رُوح کا مشاہدہ کرتا ہے یعنی رُوح کو دیکھ سکتا ہے، رُوح کی حقیقتوں کا مطالعہ کرتا ہے، تو ظاہر بات ہے کہ ایسے شخص کو قرآن کی حکمت اُس کی حقیقت اور تاویل آنے لگے گی۔ اِسی لئے کہا گیا کہ تاویل جو ہے وہ دو درجوں میں ہے، ایک تاویل جو ہے وہ کتابی تاویل ہے اور ایک تاویل عملی ہے، (practical) ہے۔ کتابی تاویل سے کیا مراد ہے؟ آپ اپنے پاک مذہب کی اعلیٰ کتابوں میں جو لکھی ہوئی تاویل پڑھتے ہیں وہ کتابی تاویل ہے، اور اِن شاء اللہ آپ آگے چل کر رُوحانیت کے اعلیٰ مقامات پر فائز ہو جائیں گے اور بلاواسطہ یعنی (directly) تاویلات کو رُوحانیت کے مقام پر دیکھنے لگیں گے، اُن کا مشاہدہ کریں گے تو یہ عملی تاویل ہے

اور اِسی معنیٰ میں کتابی تاویل سے عملی تاویل جو ہے اعلیٰ ہے۔ایک کو(indirect) کہنا اور دوسری کو(direct) کہنا، (indirect) کتابی تاویل ہے جس کو عربی میں بلواسطہ کہتے ہیں کسی چیز کے توسّط سے،اور دوسری جو(direct) ہے اُس کو بلا واسطہ کہنا وہ براہِ راست ہے۔ پھر اُس وقت آپ کائنات کو بھی بڑی آسانی کے ساتھ (study) کرسکیں گے،اِس کائنات کو حسن وخوبی سے (study) کرسکیں گے اور قرآن کی حقیقتوں کو بھی،تو اِس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ قرآن کی حقیقتوں کو سمجھنا جو ہے کتنی مشکل چیز ہے اور قرآن روایات سے نہیں بلکہ براہِ راست اپنی ذات میں جانے سے سمجھا جاسکتا ہے ہاں! یہ بات الگ ہے کہ اگر کتابی علم اعلیٰ ہے اور بزرگانِ دین کی کتابیں ہیں، جن کو امامؑ سے علم ملتا ہے اور علم ایسا ہے،تو آپ کے لئے یہ علم الیقین کا درجہ رکھتا ہے۔علم الیقین اور حق الیقین میں ایک طرح سے فرق نہیں ہے اور ایک طرح سے فرق ہے،فرق نہیں ہے کس طرح؟ کہ اگر کسی پیر نے یا کسی بزرگ نے رُوحانیت کی باتیں بڑی عمدگی سے لکھی ہیں تو وہ عین الیقین کی باتیں ہیں لیکن اِس کے باوجود اِس میں فرق اِس معنیٰ میں ہے،کہ جس نے اپنے دل کی آنکھ سے چیزیں دیکھیں ہیں اور اُن مشاہدات کو تحریر میں لایا ہے،تو اُس نے وہ چیزیں رُوحانیت کے مقام پر دیکھی ہیں ،آپ نے نہیں دیکھی ہیں یہ فرق ہے لیکن معنی کے لحاظ سے فرق نہیں ہے۔دوسری مثال کسی کارخانے میں کوئی چیز بنتی ہے کانچ کی چیزیں بنتی ہیں یا لوہے کی چیزیں بنتی ہیں،تو جس نے کارخانے میں جا کر دیکھا ہے تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جو باٹلی ہے اب سفید ہے یا سبز ہے یا کالا ہے لیکن کارخانے میں باٹلی بنتے ہوئے جس نے دیکھا ہے اُس نے اِس طرح سے دیکھا ہے کہ یہ بالکل سُرخ سُرخ آگ تھی۔اِسی طرح علم الیقین کی باتیں جو آپ کے سامنے ہیں اور جس نے دیکھی ہیں مقامِ رُوحانیت پر وہاں یہ باتیں بولتی تھیں،زندہ تھیں اور روشنی سے بھرپور تھیں۔آگ کی بھٹی سے کسی لوہے کی چیز کو آپ نے نکالا تو چیز وہی ہے، (size) وہی ہے،شکل وہی ہے، پر تھوڑی دیر کے بعد وہ سُرخ سُرخ چیز ٹھنڈی پڑگئی اور سُرخی نہیں رہی،مگر شکل وہی ہے ،چیز وہی ہے،مقصد وہی ہے،کام وہی ہے،تو دین کی جو اعلیٰ کتابوں ہیں اُس میں عین الیقین کی باتیں ہوتی ہیں اور یہ ہے کہ اُس میں حرکت نہیں ہے،آواز نہیں ہے چونکہ وہ تحریر کی شکل میں ہیں،نہیں تو عین الیقین کے مقام پر وہ باتیں زندہ تھیں۔

تیسری مثال ایک مچھلی ہے جو حلال ہے جو کھانے کی چیز ہے، جو لوگ مچھلیوں کو دریا سے حاصل کرتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ مچھلیاں کس طرح پانی میں حرکت کرتی ہیں، تیرتی ہیں،دوڑتی ہیں ٹھہرتی ہیں اور پانی سے نکالنے کے بعد وہ کھانے کے قابل تو ہیں مگر اُن میں حرکت نہیں ہے،تو یہ مثال ہے اور یہ فرق ہے عین الیقین اور علم الیقین کے درمیان۔ اِس سے علم الیقین کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اگر وہ صحیح معنوں میں علم الیقین ہے،تو اِس کی بہت اہمیت بڑھ جاتی ہے اور فکر کے لئے یہی علم الیقین کام آتا ہے۔کیونکہ اگر کوئی ایسا شخص علمی فکر کرنے کے لئے کوشش کرے،جس کی عقل،جس کا دماغ علم میں پروردہ نہیں ہے،علم میں پلا ہوا نہیں ہے،تو وہ فکر کرکے کیا نتیجہ اخذ کرے گا! اُس کو کچھ نہیں ملے گا فکر سے،

اُس کے نتائج سب غلط ہو جائیں گے۔ لہٰذا فکر کے لئے صحیح علم کی ضرورت ہے اور فکر کے لئے صحیح عبادت کی ضرورت ہے یہ آپ کے اِس سوال سے متعلق باتیں ہیں، اب ہم کچھ دوسری باتیں بتائیں گے۔

ایک اور مضمون پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں اِن شاء اللہ وہ آپ کے لئے بڑا مفید رہے گا۔ یہ مضمون ایک مختصر آیت کے تحت آتا ہے اور وہ آیت ہے: ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ''(۲:۲۸۵) مومنین کہا کرتے ہیں کہ ہم خدا کے رسولوں کے درمیان کچھ تفرقہ نہیں ڈالتے ہیں 'لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ''(۲:۲۸۵)۔ حضرت مولانا امام جعفر الصادق صلوات اللہ علیہ کے ایک ارشاد کے بموجب انبیاء کے چار یا پانچ گروپ ہوتے ہیں، مگر اُن میں سے کچھ تو نبی ہوتے ہیں، کچھ رسول ہوتے ہیں، نبی سے رسول کا درجہ بڑا ہے (عنوان: انبیاء، حکمت نمبر: ۱۲۵، کتاب: ہزار حکمت)۔ یہاں ہم نے جو (Topic) شروع کیا ہے اِس میں رسولوں کی بات ہے یعنی خدا کے جتنے رسول ہیں وہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں، اُن کے درمیان ایک اعتبار سے کوئی فرق و تفاوت نہیں پایا جاتا ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ''(۲:۲۸۵) مومنین کہا کرتے ہیں کہ ہم خدا کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے ہیں، تو یہ فرق و امتیاز کیا ہے؟ کس چیز میں ہے؟ کس بارے میں ہے اور اِس سلسلے میں کس طرح سوچنا چاہیئے؟ رسولوں کی جس چیز میں فرق و تفاوت نہیں ہے وہ اُن کی رُوحانیت ہے، وہ اُن کی رُوحانی منزلیں ہیں، وہ اُن کے رُوحانی تجربات ہیں، وہ اُن کا رُوحانی علم ہے، وہ اُن کا نور ہے۔ اب اگر ایسا ہے، تو ہمیں کہنا چاہیئے، کہ رسولوں میں رُوحانیت کے ایسے بہت سے واقعات ہیں جو اُن سب کے درمیان مشترک ہیں، مثلاً وحی مشترک ہے، جبرائیل کا درجہ مشترک ہے اور علمِ لدنّی مشترک ہے، حکمت مشترک ہے اور اِسی طرح کی بہت ساری چیزیں اُن تمام رسولوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت سے ہیں۔

مثال کے طور پر قرآن میں ارشاد ہوا ہے، کہ خداوندِ عالم نے اپنی رُوح آدم میں پھونک دی (۱۵:۲۹) سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ صرف آدم کا خاصا تھا یا کہ یہ بات جملہ رسولوں میں مشترک ہے؟ سو اِس کا جواب یہی ہوگا کہ یہ اعزاز تمام رسولوں میں مشترک ہے۔ اِسی طرح سوال پیدا ہوتا ہے، کہ کیا صرف آدم ہی اپنے وقت میں خلیفۂ خدا تھے یا یہ کہ ہر رسول اپنے وقت میں خدا کا خلیفہ ہوا کرتا ہے؟ اِس کا جواب بھی یہی ہے کہ ہر رسول اپنے زمانے میں خدا کی خلافت کے مرتبے پر فائز ہوا کرتا ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بموجب اِرشادِ قرآن فرشتوں نے آدم کے لئے سجدہ کیا (۱۵:۳۰) کیا یہ بات صرف آدمؑ ہی کے لئے خاص تھی یا کہ تمام رسولوں میں مشترک ہے، تو اِس کا بھی وہی جواب ملتا ہے جیسے اگلے سوالات کا ملا تھا۔ اِسی طرح آدمؑ کے بارے میں جتنے واقعات بیان ہوئے ہیں، اُن کا اطلاق دوسرے رسولوں پر بھی ہوتا ہے۔

اب ہم ادریس علیہ السلام کی زندگی کا جو ذکر ہے اُس کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور وہ واقعہ یوں ہے کہ ادریس علیہ السلام جیتے جی بہشت میں داخل ہو گیا تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ بات صرف ادریسؑ ہی کے لئے خاص تھی یا

کہ ہر پیغمبر یوں ہوا کرتا ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ بہشت سے رُوحانیت مراد ہے اور رُوحانیت میں ہر پیغمبر داخل ہو جاتا ہے، اور زندگی میں جو پیغمبر یا جو ولی یا جو حقیقی مومن مقامِ رُوحانیت پر فائز ہو جاتا ہے، تو وہ بہشت میں داخل ہو جاتا ہے اور جیتے جی بہشت میں ایک بار داخل ہو جانے کے بعد وہ وہاں سے خارج نہیں ہو سکتا، تو یہ بات بھی سب میں مشترک ہے۔ اِسی طرح نوح کے واقعات سے کوئی مثال لی جاتی ہے، چلیے ہم طوفانِ نوح کی مثال لیتے ہیں اور سوال کرتے ہیں، کہ آیا طوفانِ نوح صرف نوح علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا تھا یا کیا؟ تو اِس کا جواب بھی یہی ملتا ہے کہ نوح سے متعلق جس طوفان کا ذکر آیا ہے، وہ اصل میں رُوحانیت کا طوفان تھا اور رُوحانیت کا طوفان ہر پیغمبر کے سامنے پیش آتا ہے اور وہ طوفان ایسا ہے کہ اُس میں مومنین کو نجات ملتی ہے اور جو انکار کرنے والے ہیں وہ سب اُس رُوحانی طوفان میں ڈوب جاتے ہیں اور یہ صرف وہی دیکھتا ہے جو مقامِ رُوحانیت پر فائز ہو جاتا ہے، تو یہ طوفان بھی جو رُوحانیت کا ہے تمام رسولوں میں مشترک ہوتا ہے۔ اِسی طرح کشتی کی بات ہے کہ کشتی سے مراد وہ اعلیٰ عبادت ہے جو زمانے کے ہادی کے توسّط سے مقرر ہوتی ہے، آپ اُسے بول کہہ سکتے ہیں، آپ اُسے اسمِ اعظم کہہ سکتے ہیں، آپ اُسے خاص عبادت کہہ سکتے ہیں، تو اسی عبادت کی کشتی میں فرمانبردار مومنین کو نجات ملتی ہے۔

یہاں پر میں تھوڑی سی تشریح کرنا چاہوں گا کہ رسولِ اکرمؐ نے اہلِ بیتِ اطہارؑ کی مثال کشتیٔ نوح سے دی اور امامِ اقدس و اطہر جماعت خانے کو کشتی بتاتے ہیں اور میں نے عبادت کو کشتی کہا، تو یہ تین، چار باتیں کس طرح آپس میں مل سکتی ہیں: کشتیٔ نوح، اہلِ بیت، جماعت خانہ اور عبادت۔ کشتیٔ نوح، نوح کا امر و فرمان تھی، اہلِ بیت کشتیٔ نوح ہیں اِس معنیٰ میں کہ اُن کی فرمانبرداری میں مومنین کی نجات ہے، جماعت خانہ کشتی ہے اِس معنیٰ میں کہ امام کی فرمانبرداری وہیں پر ہے، عبادت کشتی ہے اِس معنیٰ میں کہ عبادت جماعت خانے میں ہی کرنی ہے، تو سارے مطالب یکجا ہو جاتے ہیں اور الفاظ الگ الگ ہیں، مثالیں جدا جدا ہیں مگر اِن کا مغز یا (essance) یا معنیٰ ایک ہے، تو آپ کہہ سکتے ہیں جماعت خانہ کشتی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ امام کی بتائی ہوئی عبادت کشتی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ بول کشتی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں اہلِ بیت کشتی ہیں، تو اہلِ بیت کسی اور مطلب میں کشتی نہیں ہیں، آپ کو جو فرمان فرمایا جاتا ہے اُسی پر عمل کرنے سے کشتی کی مثال بنتی ہے، تو یہ بات تمام پیغمبروں میں مشترک ہے۔

قرآن میں ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی جودی نام کے ایک پہاڑ پر ٹھہری اور جب طوفان تھم رہا تھا تو خدا نے فرمایا کہ اب برکتوں اور سلامتیوں کے ساتھ اُتر جاؤ (۱۱:۴۸) تو یہ اشارہ تھا کہ رُوحانیت کا طوفان تھم رہا تھا اور اب اِس طوفان کے نتائج و ثمرات کو برکت کا نام دیا کیونکہ رُوحانیت کا طوفان تنزیلی صورت میں ہوتا ہے، وہاں پر بہت ساری چیزیں اخذ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن طوفان کے تھم جانے کے بعد طوفان کی برکتیں اور رحمتیں اُس کے نتائج و ثمرات حاصل ہو سکتے ہیں، اِس

لئے خدا نے کہا کہ اب برکتوں کے ساتھ اور سلامتیوں کے ساتھ اُتر جاؤ، اور اُس طوفان میں نہیں چلنا چاہیئے کسی ایسے مقام پر اُترنا چاہیئے جہاں پرسکون سے اور آرام سے اُس رُوحانی طوفان کا تجزیہ کیا جاسکے، اُس کی (analysis) کی جائے، تحلیل کی جائے اور اُس پر غور و فکر کیا جائے۔ جس طرح آگے مضمون آپ کے سامنے پڑھا گیا جو غور و فکر سے متعلق تھا اور غور و فکر کا اعلیٰ مقام تنزیل کے بعد ہے، تو پھر کوہِ جودی پر نازل ہونا، خداوندِ عالم کسی قصے میں کسی لفظ کو نہیں لیتا ہے جب تک کہ اُس کی تاویل نہ ہو۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ ظاہر میں بھی ایک طوفان ہوا تھا تو اِس ظاہری طوفان کے سلسلے میں خدا کو جودی کے پہاڑ کا نام نہیں لینا چاہیئے جب تک اُس کے پس منظر میں ایک تاویل نہ ہو، یہ خدا کا قانون ہے، تو جودی کے پہاڑ کا مطلب ہے کہ جو دمہربانی کو، عنایت کو کہتے ہیں یعنی عنایات کا یا مہربانیوں کا پہاڑ، تو یہ تنزیل کے بعد تاویل کے مقام کا نام ہے کہ اُس میں عنایات ہوتی ہیں، جس طرح پہاڑ سے چشمے جاری ہوتے ہیں، جنگل ہے جس میں انسانوں کے لئے فائدہ ہے، جانور ہیں جن کا شکار کیا جاتا ہے، معدنیات ہیں اور جڑی بوٹیاں ہیں اور ہمیشہ پہاڑوں سے پانی کا فیض جاری ہوتا ہے پھر کہتے ہیں کہ بھونچال کے خطرے سے بھی پہاڑ ہی بچاتے ہیں تو لاتعداد برکتیں ہیں پہاڑوں میں۔

پھر اِس کے علاوہ ایک اور مثال کہ زمین کاشت سے اور باغ لگانے سے زمین کی قوتیں مرتی ہیں لیکن پہاڑ سے جو پانی آتا ہے وہ اپنے ساتھ نئی اور تازہ زرخیز مٹّی لے آتا ہے اور اُس سے زمینیں نئے سرے سے بنتی ہیں اور زرخیز ہو جاتی ہیں، تو اِسی طرح بہت ساری برکتیں ہیں اور اُس کے لئے وہ علم چاہیئے جو سائنس ہے یا جو زمین سے متعلق ہے یا پہاڑوں کے فائدوں سے متعلق ہے، تو اُس علم کے پڑھنے سے اور زیادہ پہاڑوں کے فائدے ظاہر ہو جاتے ہیں، تو مطلب یہ ہے کہ کوہِ جودی پر کشتی ٹھہری، ذکر کی کشتی، یہ ذکر نہ صرف رُوحانیت کے طوفان کے زمانے میں کام آتا ہے بلکہ بعد میں بھی یہی ذکر کام آتا ہے، کہ اِس ذکر سے تاویل کے خزانے ملتے ہیں اور خزانوں کے راستوں کا پتہ چلتا ہے اور اُن کی کلیدیں ملتی ہیں، تو یہ نوح کا قصہ یا نوح سے متعلق رُوحانیت بھی مشترک ہے۔ اِسی طرح ابراہیمؑ کی ایک مثال لیجئے کہ ابراہیمؑ کے لئے آگ سے گلشن بنایا گیا (۲۱:۶۹) یہ بات بھی تمام رسولوں میں بلکہ خدا کے دوستوں میں مشترک ہے۔ یہاں پر آگ سے مراد دشمن کی بدخواہی اور اُس کا شر اور اذیتیں وغیرہ [ہیں] تو دشمن جو کچھ چاہتا ہے آپ نہ کہنا کہ اُس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ میں تو یہاں تک بتاؤں گا قرآن کی روشنی میں کہ جب کوئی حاسد حسد کرتا ہے تو اُس کا بھی ایک اثر ہوتا ہے۔ آپ معوذتین میں جو قرآن کے آخر میں ہے اُس میں آپ پڑھیں جب ایک حاسد حسد کرتا ہے (۱۱۳:۵) تو اُس میں سے ایک شر برُائی پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ برُائی حملہ آور ہو جاتی ہے اِس طرف آتی ہے، جب تک مومن خدا کی پناہ میں نہ ہو اور خدا کا نام نہ لے اور خدا کی حفاظت کے قلعے میں نہ آئے، تو حاسد کا جو حسد ہے وہ ہم پر اثر انداز ہو جاتا ہے، کسی بھی تکلیف کی صورت میں وہ اثر انداز ہو جاتا ہے۔ یہی ایک حسد نہیں، بہت ساری چیزیں ہیں، دشمن کی بُری تدبیریں ہیں وغیرہ وغیرہ، تو ابراہیمؑ کے لئے

ظاہر میں کوئی آگ بنائی تھی یا نہیں بنائی تھی ہم اُس سے بحث نہیں کرتے ہیں لیکن ہم تاویل کے طور پر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ابراہیمؑ کے لئے جو سب سے بڑی آگ جلائی گئی تھی وہ اُس کے دشمنوں کی بُری نیات اور بُری خواہشوں کا ایک طوفان تھا، کیونکہ خداوندِ عالم کا یہ قانون ہے کہ بُرائی کو بھی ایک رُوح دیتا ہے، اُس کو بھی حرکت دیتا ہے، اُس کو بھی موقع دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو بُرے شخص کو وہیں پر سزا ہوتی پھر قیامت کے دن اُس سے پوچھ گچھ کرنے کی کیا ضرورت۔ شیطان یا اُس جیسے کسی انسان کو اگر پابند کیا جائے، اُس کے ہاتھ، پاؤں، منہ، زبان، تمام قوتیں بند کی جائیں تو یہ بنیاد ہی سے سزا ہوگئی اور پھر آگے حساب کی بھی کیا ضرورت ہے اور سزا کی بھی کیا ضرورت ہے؟ ایسا نہیں ہے! اِس دنیا میں سب کو آزادی ہے، بُرا چاہنے والا بُرا چاہ سکتا ہے، بُرائی کرنے والا بُرائی کر سکتا ہے، ایک بار ہر چیز کو وُجود ملتا ہے پھر آگے چل کر ایک جنگ کی سی صورت پیدا ہوتی ہے اور اِس طرح مومن میں جو قوتیں ہیں اُن کو بھی خداوندِ عالم موقع دیتا ہے، تو رُوحانی طور پر ایک کشمکش سی ہوتی ہے، ایک جنگ سی ہوتی ہے، ایک آگ سی پیدا ہو جاتی ہے یعنی دشمن کی طرف سے ایک آگ جلائی جاتی ہے پھر مومن اپنی قوتوں سے جو خدا کی پناہ میں ہوتا ہے، اُس کو خداوندِ عالم اُس رُوحانی آگ کی شکل کو تبدیل کر کے گلشن یعنی تائید، رُوحانیت بناتا ہے، تو یہ ہوا آگ سے گلشن بنانا اور یہ بات سب پیغمبروں میں مشترک ہے۔

اب یہاں ٹھہر کہ میں ایک اور اُصول کی بات بتاؤں، یہ ضروری نہیں ہے کہ قرآن میں جتنے رسولوں کا ذکر ہے اُس میں ہر بات کو اُجاگر کر دیا جائے اور یہ اعلان کر دیا جائے کہ سب انبیاء کے لئے فرشتوں نے سجدہ کیا، اور یہ کہا جائے کہ تمام پیغمبروں نے معراج حاصل کی، اور یہ فرمایا جائے کہ سب انبیاء سلیمانؑ جیسے بادشاہ تھے۔ لیکن یہ حکمت کا کام ہے، کہ وہی بتاتا ہے کہ سب رسول ایک ہیں کا مطلب کیا؟ اِس کا مطلب یہ کہ سب پر ایک جیسے واقعات گزرتے تھے اور سب کی رُوحانیت ایک جیسی تھی۔ دوسری بات جس سے آپ کو مدد مل سکتی ہے، یہ ہے کہ جتنے انبیاء اور جتنے رسول ہیں، اور جتنے نماسیان ہیں اُن کے لئے صرف ایک ہی رستہ تھا، دو، تین، چار، چھ، دس رستے نہیں تھے۔ اگر جدا جدا رستے ہوتے تو ہر پیغمبر کی رُوحانیت جدا ہوتی، تو رستہ ایک ہی ہے اُس کا نام ہے صراطِ مستقیم۔ منزلیں ایک جیسی ہیں اُسی سے سب گزرتے ہیں اور اِس لئے سب رسولوں پر ایک جیسی رُوحانیت کے واقعات گزرتے ہیں، تو موسیٰؑ کے معجزات کی گہرائی میں جایا جائے، تو وہی باتیں ہیں جو سب پیغمبروں کی باتیں ہیں، مثلاً لاٹھی، تو لاٹھی سے مراد ذکر ہے، اسمِ اعظم ہے، بول ہے۔ یہ اسمِ اعظم ہی کے مختلف نام ہیں، کبھی اسمِ اعظم کو پَر، فرشتوں کے پَروں سے تشبیہہ دی گئی، کبھی اِس کو کشتی کہا گیا، کبھی اِس کو لاٹھی کہا گیا، کبھی اِس کو پاؤں بھی کہا جا سکتا ہے، پاؤں کس (sense) میں؟ رُوحانی طور پر جس چیز سے چلا جاتا ہے وہ ذکر ہے، وہ عبادت ہے اور رُوحانی طور پر جس چیز کا سہارا لیا جاتا ہے وہی ذکر ہے عبادت ہے، تو سہارا لینے کے حساب سے لاٹھی کہا گیا، سکون سے بیٹھنے کے اعتبار سے کشتی کہا گیا اور چلنے کے اعتبار سے پاؤں کہا گیا، اور اُڑنے کے اعتبار سے پَر کہا گیا۔ آپ اِس کو گھوڑا بھی

کہہ سکتے ہیں۔جس چیز سے مسافت طے کی جاتی ہے وہ ایک نہیں ہے،کبھی پاؤں ہیں،کبھی لاٹھی کا سہارا ہے،کبھی کشتی کا سہارا ہے،کبھی گاڑی ہے،کبھی گھوڑا ہے اور اگر پرندے کا ذکر ہے،تو اُس میں پَر ہیں،فرشتے کا ذکر ہے،تو اُس میں پَر ہیں،تو مطلب ذکر کی بہت سی مثالیں ہیں تو موسیٰ علیہ السلام پر آ کر ذکر کو لاٹھی کہا گیا،سلیمان علیہ السلام پر آ کر اِس کو انگوٹھی کہا گیا کیونکہ اِس کی بہت سی مثالیں ہیں اور انگوٹھی کیسی تھی؟ انگوٹھی ایسی تھی کہ اُس کی بدولت جنّ وانس پر حکمرانی کی جاتی تھی اور ہاں! رُوحانیت میں وہ چیز جس کی بدولت کوئی جنّ وانس پر یعنی جنّ وانس کی رُوحوں پر حکومت کرتا ہے وہ بول ہے؟ وہ اسمِ اعظم ہے اور سلیمانؑ کی مملکت سے مراد رُوحانی مملکت ہے جو سلیمانؑ کی مملکت کے مشابہ ہے اور حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا،کہ اسماعیلیت رُوحانیت کا تخت ہے اور رُوحانیت کا تخت وہ ہے جو کبھی سلیمانؑ کے پاس تھا۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ:اکبر علی پروف:نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: خدا کی تین کتابیں: قرآن، کائنات اور نفس

کیسٹ نمبر: Q-35-B   تاریخ: ۲۳ر جون ر ۱۹۸۳، کراچی

۔۔۔اور سلیمانؑ نے یہ دعا بھی کی تھی، کہ خداوندا! اگر مجھے کوئی سلطنت تو عطا کرتا ہے تو ایسی سلطنت دے کہ وہ مجھ سے چھوٹ نہ جائے، وہ میرے ساتھ رہے تو اِس سے مراد ظاہر ہے کہ روحانی سلطنت ہے، تو پھر آئیے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے قصّے کی طرف کہ وہ جنم اندھوں کو بینائی بخشتے تھے اور آپ کو معلوم ہے کہ جنم اندھے کی کیا تاویل ہوتی ہے۔ جنم اندھا وہ ہے جو پیدائشی طور پر حقیقت کو نہیں جانتا یعنی جو لوگ حقیقت سے دُور ہیں اُن کو کبھی حقیقت سے واسطہ نہیں پڑا وہ پیدائشی طور پر اندھے ہیں۔ اب ایسے لوگوں کو حضرت عیسیٰ کس طرح بینائی بخشتے تھے، اُن کو دعوت دیتے تھے، راہِ راست پر لاتے تھے، راہِ راست پر چلاتے تھے اور کچھ منزل آگے بڑھانے کے بعد اُن میں چشمِ بصیرت پیدا ہوجاتی تھی، وہ دل کی آنکھ سے، حقیقت کی آنکھ سے حقائق کو سچّائی کو دیکھتے تھے، یہ ہوا جنم اندھوں کو بینائی بخشنا، تو کیا اِس حقیقت کو یوں سمجھنے کے بعد آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ معجزہ صرف عیسیٰؑ کے لئے خاص تھا یا یہ کہ سب رسولوں میں یہ معجزہ مشترک تھا۔ مردوں کو جِلانا ایک معجزہ یہ تھا مردوں کو جِلانا کس طرح ہے؟ دنیا کے اندر آپ بہت سارے انسانوں کو دیکھتے ہیں، بہت سارے انسانوں کو! کیا آپ ہر کسی کو یہ درجہ دے سکتے ہیں، کہ فلان انسان حقیقی معنوں میں زندہ ہے، جبکہ زندگی کی بہت سی سطحیں ہیں اور جتنے جانور ہیں وہ بھی ایک جیسے نہیں ہیں زندگی میں، اُن کی بھی سطحیں ہیں۔ انسان تو، انسان کی سطحیں تو بہت زیادہ ہیں، کچھ انسان حیوان سے بھی گرے ہوئے ہیں تو آپ اُن کو کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ صحیح معنوں میں زندہ ہیں۔

لہٰذا چلیے ایک بات کرتے ہیں وہ یہ کہ رُوح الایمان کی زندگی جس میں نہ ہو وہ خدا کے حضور میں مردہ شمار ہوتا ہے اب بہت سے لوگ ایسے تھے حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں جاہل تھے، نادان تھے جن میں رُوح الایمان نہیں تھی، تو اِس لئے اُن میں ایمانی زندگی نہیں تھی، تو حضرت عیسیٰؑ نے اپنی مقدّس دعوت سے اپنی نصیحت سے اور علم سے اُن کے اندر رُوح الایمان پھونکی، ایک اضافی رُوح اُن میں آئی، جس کا نام صحیح معنوں میں رُوح الایمان ہے، تو رُوح الایمان سے وہ زندہ ہوگئے اور ایک بار وہ زندہ ہوگئے تو ہمیشہ کے لئے زندہ ہوگئے۔ کیا یہ زندگی اچھی ہے یا کسی بیکار شخص کو جو بوڑھا ہے یا بیمار ہے یا گنہگار ہے وہ مرگیا، اور اِس دنیا کے عذاب سے یا بیماری سے چھُوٹ گیا پھر حضرت عیسیٰؑ کسی (sense) کے

بغیر خواہ مخواہ اُس کو زندہ کرتے اور پھر کتنے برس تک وہ زندہ رہا آخر مر گیا۔ آج نہیں دیکھتے ہیں کہ جن کو عیسیٰ ؑ نے زندہ کیا ہے جسمانی طور پر وہ آج تک زندہ ہو، اگر ایسے ہوتے تو ہم اِس کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتے، یہ بات نہیں ہے۔ جن مردوں کو عیسیٰ ؑ نے زندہ کیا، اُن سے مومنین مراد ہیں، کیا یہ معجزہ صرف عیسیٰ ؑ کے لئے خاص ہوسکتا ہے یا سب رسولوں میں مشترک ہے۔ رسول نہیں صرف بلکہ اُن کے جو اوصیاء ہیں، اُن کے جانشین ہیں یا آپ کے پیر ہیں وہ بھی یہ معجزہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً جن پیروں نے ہمارے آباء واجداد کو دعوت دی تو ہم نہیں کہہ سکتے ہیں ہم شروع سے اِسی راستے پر تھے، تو ہمارے آباء واجداد کو ہمارے پیروں نے، بزرگوں نے زندہ کیا، اُن کو زندہ کیا تو ہم کو زندہ کیا اور کروڑوں، اربوں، کھربوں کے حساب سے رُوحوں کو زندہ کیا، یہ بہت بڑا معجزہ بھی ہے اور بہت بڑا احسان بھی ہے، تو یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے اور اِسی طرح آنحضرتؐ جو سرورِ انبیاء تھے جو تمام رسولوں کے سردار تھے اور نبیوں کے سردار تھے لیکن اِس کے باوجود آپ قرآن کی روشنی میں اچھی طرح سے دیکھیں اور غور سے دیکھیں کہ وہ پیشرو ہیں اور آپ پیرو ہیں۔ پیشرو ایک فارسی لفظ ہے پیشرو، ہدایت کرنے والا آگے چلنے والا، پیرو پیچھے پیچھے چلنے والا۔ دنیا کی کسی راہ کی مثال لیں کہ ایک رہنما ہے یا گائیڈ ہے یا پیرو ہے اور ایک پیشرو ہے تو یہ پیشرو آگے آگے چلتا ہے اور پیرو پیچھے پیچھے چلتا ہے، تو وہ پیشرو اِس پیرو کو کسی مقام تک پہنچا دینا چاہتا ہے اور اِن دونوں کا سفر وہاں جا کر ایک ساتھ ختم ہو جاتا ہے، تو کیا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے، کوئی مومن یہ کہہ سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کی (guidance)، ہدایت آدھے رستے تک تھی، (destination) یعنی جو منزلِ آخرین ہے اُس تک نہیں تھی، کوئی یہ کہہ سکتا ہے۔ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ رسول میں آپ کو اُسوۂ حسنہ ہے، بہترین اسوۂ حسنہ ہے (۲۱:۳۳) اور رسول کی پیروی کے لئے فرمایا جاتا ہے۔

لفظِ ہادی کو لیں اور اِس کا کسی بھی زبان میں ترجمہ کریں، انگریزی میں ترجمہ کریں گے، تو (guide) بن جائے گا اور (guide) کا کام ہے (guidance) اِس کا (sense) کیا؟ کسی کو رستے پر چلانا، عربی میں اِس لفظ کو لیں گے تو ہدایت کا لفظ بنے گا، فارسی میں اِس لفظ کا ترجمہ کریں گے تو رہنمائی، رستہ بتانا اور اُس شخص کا نام رہنما جو اسم فاعل ہے، رہبر اسم فاعل ہے، رہبری صفت ہے اور پیروی کرنے والا یا اطاعت کرنے والا اور پیچھے پیچھے چلنے والا اور آپ اگر صراطِ مستقیم سے مثال لیں تو اِس کا بھی وہی (sense) بنے گا کہ صراطِ مستقیم ہے جو اسلام ہے اور یہ صراطِ مستقیم وہاں جا کر ختم ہو جاتی ہے جہاں پر خدا ملتا ہے، اور اگر ایک منزل کیا دو قدم بھی ادھوری ہدایت ہوتی ہے اور رسول فرماتے ہیں کہ بس دو قدم سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے، تو پھر یہ ساری ہدایت فضول ہوگئی۔ مقصد وہاں پورا ہو جاتا ہے جبکہ منزلِ آخرین مل جاتی ہے یعنی جبکہ اصل سے کوئی واصل ہو جاتا ہے۔ میں اِس گفتگو میں معراج کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ آنحضرتؐ کی سب سے اعلیٰ رُوحانیت معراج ہے، تو معراج تک ممکن ہونا چاہیئے کہ مومنین پہنچیں اور امام کے فیصلے سے بڑھ کر اور کوئی فیصلہ نہیں۔

یہ امام نے ارشاد فرمایا ہے کہ بہت سے مومنین یا بہت سی رُوحیں معراجی درجے کی ہوتی ہیں ۔ اِس کا مفہوم ظاہر ہے کہ بہت سے مومنین رُوحانی طور پر عبادت اور بندگی کے وسیلے سے اور رسول اور امام کی پیروی میں اُس کے بغیر نہیں معراج تک جاسکتے ہیں ۔اب رہی بات کہ یہ تو نبوّت کا دعویٰ نہیں بلکہ پیغمبر اور امام کی بدولت ایک شخص خود کہیں نہیں جاسکتا ہے کسی (guide) کے ساتھ جاسکتا ہے، کسی (guide) کی (guidance) کے ساتھ جاسکتا ہے تو پھر بعد میں وہ شخص کس طرح دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ (guide) ہے ۔ابھی ابھی تو اُس کو (guidance) ملی تھی ایک (guide) کے پیچھے پیچھے وہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ اُس نے کسی کو (guide) کیا، تو رسالت رسالت ہے، نبوّت نبوّت ہے، امامت امامت ہے اور پیروی پیروی ہے، نقشِ قدم پر چلنا، اِس میں بڑا فرق پایا جاتا ہے ۔لیکن مسافت وہی ہے، راستہ وہی ہے، واقعات وہی ہیں اور اگر کسی شخص نے رُوحانیت کا تجربہ کیا ہے پیغمبر اور امام کی ہدایت کی روشنی میں، تو کیا اُس کو نبوت کا دعویٰ کرنا چاہیئے یا امامت کا دعویٰ کرنا چاہیئے، نہیں! ہرگز نہیں!! اُس کو صرف دین کی شناخت کا دعویٰ کرنا چاہیئے اور وہ بھی اِس طرح سے نہیں، ایسے الفاظ سے نہیں بہت محتاط طریقے سے کیونکہ مریدوں کے لئے ادب رکھا گیا ہے، مریدوں کے لئے عاجزی رکھی گئی ہے، اُن کی آبادی اُن کی کامیابی اِسی میں ہے اور کسی چیز کا دعویٰ کرنا خود کو ہلاک کرنا ہے ۔ ہمارے پیروں نے بزرگوں نے دعویٰ سے ممانعت کی ہے اور بہت خطرناک چیز [ہے]، تو اِس لئے بہت سے بزرگوں نے اپنے چشم دید واقعات کو قرآن کے سہارے سے منطق کے سہارے سے، عقلی دلائل کے سہارے سے بیان کیا ہے ۔ یہ بات بہت مشکل ہے اور شاید کوئی خاص مجلس میں کسی لحاظ سے یہ کہہ سکتا ہے مگر عام مجلس میں نہیں کہ میں نے یہ دیکھا، یہ دیکھا، یہ دیکھا ۔اگر محفلِ احباب ہے اور رازداری کی مجلس ہے اور اُس طریقے سے فائدہ ہورہا ہے، تو خیر ہے، نہیں تو عام مجلس میں یہ بڑی مشکل ہوجائے گی اور بہت سے سوالات اُٹھ سکتے ہیں ۔

بات کیا تھی بات دراصل: ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ'' (۲:۲۸۵) رسولوں کے درمیان ہم کچھ تفرقہ نہیں ڈالتے ہیں، اُن کی رُوحانیت ایک جیسی ہے، اُن کے معجزات ایک جیسے ہیں مگر الفاظ ہر وقت بدلتے ہیں، مثال بدلتی رہتی ہے، ایک ہی حقیقت کی کئی کئی مثالیں ہوسکتی ہیں ۔ یہ ابھی آپ نے دیکھا نا کہ ذکر کی مثال، اسمِ اعظم کی مثال، اسمِ اعظم ایک رُوحانی اعلیٰ حقیقت ہے اور بہت ہی اعلیٰ حقیقت ہے، اِس لئے اُس کے لئے ایک مثال کافی نہیں ہے، ایک مثال ہم کو نہیں سمجھا سکتی ہے، اُس کے لئے بہت سی مثالیں چاہئیں، بہت سی مثالیں جمع ہوکر مشکل سے اسمِ اعظم کی وضاحت کرسکتی ہیں، ایک مثال سے نہیں اور ویسے انسان بھی ایک مثال سے نہیں سمجھ سکتا ہے ۔آپ قرآن میں دیکھیں گے تو خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے، کہ اُس نے ایک ہی حقیقت کی مثالیں طرح طرح سے بیان کر دیں ہیں (۱۳:۱۷) تو آج کے اِس موضوع میں ہم نے یہ ایک اُصولی بات پیش کی کہ رسولوں اور انبیاء کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک ہیں، بلکہ کہنا

چاہیئے کہ جو بڑے بڑے پیغمبران ہیں، پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اور نبی کے درمیان کیا فرق ہے اور امام کے فرمان کی روشنی میں دیکھا ہوگا۔ جو رسول ہیں اُن کے رُوحانی معجزات یا واقعات مشترک ہوتے ہیں یہ بات تھی اور اِس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا، اِس سے ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ جب کبھی فرمایا جاتا ہے کہ سلیمانؑ پیغمبر پرندوں کی بولی جانتے تھے (۲۷:۱۶) ایک ناواقف مومن یہی پر دَنگ رہ جاتا ہے، اب اِس چیز سے دوسرے پیغمبروں کو اِس سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے اور امام کو بھی، حالانکہ رُوحانیت کے مقام پر کوئی مومن معرفت کے طور پر جاتا ہے، تو اُس کو پتہ چلتا ہے کہ پرندوں کی بولی سمجھنے کے دو معنی ہیں، ایک معنی یہ ہے کہ واقعاً یہ پرندے ہیں یہ کچھ بولتے ہیں تو اِس سے تلفظ بنتا ہے اور رُوح القدس اپنے معجزے سے اور اِن کی آواز سے کچھ گفتگو بناتی ہے۔ دیکھا آپ نے اور دوسرے معنی پرندوں کی بولی سمجھنے کے یہ ہیں کہ پرندہ جو ہے وہ رُوح کو کہا جاتا ہے اور پرندے ارواح ہیں، ارواح اِس (sense) میں پرندے ہیں کہ ذرّات پر رُوحیں سوار ہوتی ہیں اور ہم نے اپنے اِس (course) کے دوران جو علمی خطوط میں جاری ہے، بارہا ہم نے آپ کو بتایا ہے کہ رُوح جو ابتداءً نظر آتی ہے وہ ایک ذرّے پر سوار نظر آتی ہے، تو وہ ذرّہ اُڑتا چلتا ہے پرندے کی طرح۔ اِس معنیٰ میں پرندوں کی بولی سمجھنے سے مراد ہے رُوحوں کی باتوں کو سمجھنا، جبکہ اِن پرندوں کی بولی بھی سمجھی جاتی ہے۔

لیکن میں عرض کروں کہ یہ پرندے جو کچھ کہتے ہیں وہ محدود اُن کی گفتگو ہے۔ مثلاً مرغا صبح کے وقت جو ککڑوں کوں کرتا ہے اُس میں کوئی گفتگو ہے، کوئی سننے والا جو رُوحانیت سے آگاہ ہے اُس کی آواز کو ایک خاص وقت میں یعنی رُوحانی انقلاب کے زمانے میں اُس کو سنتا ہے اور اِس طرح دوسرے پرندے ہیں۔ بہت سارے اُن کی بولی کو جان سکتا ہے، تو دیکھا کہ سلیمانؑ پیغمبر کے لئے آپ ہم جس بات کو بہت خاص سمجھتے تھے وہ بہت عام ہوگئی، تو علم کی بدولت رحمت عام ہو جاتی ہے اور علم کے نہ ہونے سے انسان کو تعجب ہوتا ہے کہ سلیمانؑ کس طرح پرندوں کی گفتگو کو جانتا ہے اور تختِ سلیمان یعنی سلیمانؑ کا جو تخت تھا وہ ہوا پر جاتا تھا، اِس کے بھی دو معنی ہیں، ایک تو تختِ سلیمان آسٹرل باڈی ہے، جثۂ ابداعیہ جو اِس پوری کائنات میں سیّاحت کرسکتا ہے اور دوسرے تختِ سلیمان کے معنی ہیں کہ آپ رُوحانیت کے اعلیٰ مقامات پر ماشاء اللہ جائیں گے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ خواب میں یا نیم خوابی کی حالت میں آپ کو کوئی طاقت اُٹھائے پھرا کرے گی، آپ کو کوئی طاقت اُٹھائے اُٹھائے پھرا کرے گی، آپ محسوس کریں گے جیسے آپ کسی تخت پر ہیں، تو یہ تختِ سلیمان ہے اور ملکِ سلیمان یعنی سلیمان کی مملکت جو ہے وہ رُوحانیت کی سلطنت ہے۔

اب اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی قربانی کو لینا ہے تو اُس کا بھی تھوڑا سا ذکر کریں گے، کہ حضرت اسماعیل کو ذبیح اللہ کہا جاتا ہے اور اِس کے بارے میں ایک سوال یہ اُٹھتا ہے کہ جبکہ اسماعیل کو ذبح نہیں کیا گیا تھا تو یہ ''ذبیح اللہ'' جو راہِ خدا میں ذبح ہوا ہو، یہ ٹائٹل اُن کو کیسے ملا؟ ایک یہ سوال یا یہ کہ اُن کو ذبح ہونے کا درجہ دیا گیا چونکہ

اُن کا عزم اُن کی نیّت اُن ارادہ ایسا تھا یا یہ کہ واقعاً اُن کو ذبح کیا گیا تھا، دونوں باتیں ممکن ہیں۔لیکن میں اِس دوسری بات کو ترجیح دوں گا کہ اُن کو رُوحانی طور پر ذبح کیا گیا تھا، رُوحانی طور پر اور رُوحانی طور پر ذبح کرنے یا ذبح ہوجانے کی تاویل، ہماری اسماعیلی کتابوں میں آتا ہے وہ ایک مقام ہوتا ہے وہ ایک وقت ہوتا ہے، اُس وقت رُوحانی طور پر مومن کی قربانی ہوجاتی ہے۔ یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے میں کسی اور خصوصی مجلس میں آپ کو بتاؤں گا اور چونکہ میں نے اِس موقع پر اسحٰق علیہ السلام کا بھی نام لیا تھا تو ہاں! دونوں رُوحانی طور پر ذبح ہوئے تھے اور اسحٰق، اسماعیل کی خاطر قربان ہوئے تھے اور اُن سے فدا ہوئے تھے اور فدا رُوحانی طور پر کسی رُوحانی مقصد کے پیشِ نظر رُوحانی طور پر قربان ہوجانا دین سے، جماعت سے، مذہب سے اور امام کی خاطر سے کوئی بھی قربان ہوجاتا ہے، تو یہ سب قربانیاں اُس میں آجاتی ہیں۔وہ دین کی خاطر قربان ہوجاتا ہے، وہ جماعت کی خاطر قربان ہوجاتا ہے، وہ امام کے لئے قربان ہوجاتا ہے، وہ اپنے عزیزوں کی خاطر قربان ہوجاتا ہے، جو بھی قربان ہوجاتا ہے تو اُس میں ساری قربانیاں سموجاتی ہیں، یہ بات۔

اِس کے علاوہ چلیے قربانیٔ سوختنی کی بھی بات کریں، جلنے والی قربانی یا جلانے والی قربانی اِس کو کہا جاتا ہے قربانیٔ سوختنی، کبھی دین میں جلانے والی قربانی تھی، جیسے زمانۂ آدم میں آدمؑ کے دو بیٹوں کے درمیان تنازعہ ہوا، تو انہوں نے اپنے پدر کی شریعت کے بموجب اپنی اپنی قربانی ایک خاص مقام پر رکھ چھوڑی۔اِس لئے کہ آسمان سے ایک آگ اُتر کر کسی ایک کی قربانی یعنی اُسی کی قربانی جو سچائی پر ہو، جلانے والی تھی، تو اِس میں حضرت ہابیلؑ کی قربانی (accepted) ہوئی تھی۔آپ چاہیں گے کہ ہم اِس سوال کو بھی حل کریں یعنی اِس کے تاویلی پس منظر کو بتائیں، ظاہری روایت کے مطابق یہ قربانی ایک وقت تک چلتی رہی اور اُس کے بعد منسوخ ہوگئی لیکن اِس کا باطنی پس منظر یہ ہے کہ یہ اب بھی جاری ہے اور یہ رُوحانی چیز ہے اور وہی رُوحانی قربانی ایک طرح سے آگ ہے، جو رُوحانی طور پر قربان ہوجاتا ہے اُس کی گویا قربانی رُوحانی طور پر قبول ہوتی ہے اور آسمان سے وہ آگ آکر اُس کو جلاتی ہے۔اِس سلسلے میں ایک چھوٹی سی مثال، مومنین میں یا کہ آپ اپنی ذات میں بھی اِس مثال کا مشاہدہ کریں گے کہ کبھی کبھار مومن محبّتِ مولا میں جلتا ہے، اُس کو جلن کا احساس ہوتا ہے، آنسو آتے ہیں اور جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، وہ اپنے دل میں اپنی ہستی میں سوزش یعنی جلن کا احساس کرتا ہے، اُس وقت اُس کا نفس امّارہ موٹا نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ جلتا ہے، آنسو کے بہانے سے کوئی شخص موٹا نہیں ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ اِس کا اثر نفس اِمّارہ پر پڑتا ہے، رُوح الایمان پر نہیں، عقل پر نہیں، وہ تو اور زیادہ کشادہ ہوجاتی ہے اُس کا جوہر کھلتا ہے۔لیکن جس چیز کو آپ محبّتِ مولا کہتے ہیں یا عشقِ مولا کہتے ہیں یا صحیح گریہ وزاری کہتے ہیں اُس کے اندر ایک آگ ہے، وہ آگ آسمان سے ہے، رُوحانیت کے آسمان سے ہے اور وہیں سے اُترتی ہے اور آپ میں سے ایک چھوٹی سی قربانی کو جلاتی ہے۔ یہ ایک مثال ہے اور اعلیٰ رُوحانیت پر اِس کا ایک مکمل

(practice) ہوسکتا ہے۔ اِس سے مومن کو یقین کرنا چاہیئے کہ وہ آسمانی آگ جو کبھی آدمؑ کے زمانے میں تھی اور بعد کے زمانے میں جس کا ذکر موجود ہے وہ اب بھی موجود ہے۔ کوئی مومن چاہے، تو اِس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور مثال کے طور پر ایک ہی مومن کی دو حالتیں مختلف ہوسکتی ہیں کہ کبھی یہ اِس کا احساس کرتا ہے اور کبھی اِس کا احساس نہیں کرتا ہے، یہ فرق بھی اِس لئے ہے کہ وہ سمجھے کہ کب قربانی قبول ہوتی ہے اور کب قربانی قبول نہیں ہوتی ہے۔

اب ہم اِس گفتگو کا خلاصہ کریں گے کہ میرے خیال میں یہ گفتگو بڑی اچھی اُصولی گفتگو ہے یا تھی کہ ہم نے تمام پیغمبروں کے معجزات کو قدرِ مشترک کے طور پر سمجھ لیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اشارہ کیا کہ ممکن ہے کہ بہت سے معجزات مومنین تک پہنچتے ہوں۔ اِس لئے کہ معجزہ دو طرح سے ہے، ایک معجزہ رسولؐ کی رسالت، نبی کی نبوّت، امام کی امامت کے ثبوت کے طور پر ہے اور دوسرا معجزہ شناخت کے طور پر ہے معرفت کے طور پر ہے۔ لیکن مومنین کو معرفت سے حصّہ ملا ہے یا کہ معرفت کو یعنی شناخت کو ممکن بنادی گئی ہے، یہ خداوندِ عالم کی بے پناہ رحمت ہے یعنی جس رستے پر رسول، نبی، امام ہادی کے طور پر چلتے گئے ہیں اُسی رستے سے مومنین کو بھی جانا ہے اور اُن کے تمام واقعات کا مشاہدہ کرکے اِس کے نتیجے سے معرفت کو حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا باور کیا جائے کہ رُوحانیت جو ہے وہ قابلِ دید ہے، دیکھنے کے قابل ہے، اُس کا مشاہدہ ہوسکتا ہے اور دل کی جو آنکھ ہے یہ صرف رسول نبی اور امام کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ اُن کی مہربانی سے، اُن کی پیروی سے، اُن سے محبّت کرنے کے نتیجے میں مومن کو بھی دل کی آنکھ حاصل ہوسکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر عین الیقین کا جو مقام ہے وہ سب مومنین کے لئے ممکن ہے۔ لہٰذا اِس اُمید سے اِس یقین سے عمل کیا جائے کیونکہ اُمید بہت بڑی چیز ہے، یقین بہت بڑی طاقت ہے۔ مایوسی بہت بڑی کمزوری ہے، ناامیدی جو ہے وہ بہت ہی کمزوری ہے لیکن یاد رہے کہ خداوندِ عالم نے مومن کے لئے مایوسی بڑی سختی کے ساتھ منع کیا ہے، فرمایا ہے کہ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا، کبھی مایوس نہیں ہونا (۳۹:۵۳)[اِس] کا مطلب یہ ہوا کہ مومن کو یقین سے اُمید سے کام کرنا چاہیئے اور ایک اور چیز مومن کا نصبُ العین کہاں ہونا چاہیئے؟ نصبُ العین، عین = آنکھ، نصب = گاڑھنا یعنی ہم اپنا کیا پروجیکٹ بناتے ہیں یا کیا منصوبہ بناتے ہیں یا ہم کہاں تک دیکھتے ہیں، ہماری نگاہ کہاں جا کر ٹھہرتی ہے اور اپنے پروگرام میں کتنے کام کو لیتے ہیں، ہمیں کتنی بلندی تک جانا ہے اِس کا تعین ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اپنے نصبُ العین کا تعین نہیں کرتے ہیں، تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ ہم اپنی محدود طاقتوں سے کام لینا چاہتے ہیں، بھرپور طاقتوں سے کام لینا نہیں چاہتے ہیں، تو مومن کی نگاہ بہت بلندی پر ہونی چاہیئے، یہ نصبُ العین کی بات ہے، تو حوصلہ افزا فرامین کو پڑھنا چاہیئے۔ جس کو رُوحانی ترقّی کرنی ہے اُس کو اماموں کے فرامین میں سے (specially) حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ جو علمِ رُوحانیت میں انقلاب لاچکے ہیں، فرامین کا اِس طرح سے (selection) کرنا چاہیئے کہ وہ رُوحانی ترقّی سے متعلق ہوں، اُن کو بار بار پڑھنا چاہیئے تاکہ ہمارے اندر جو حوصلہ

ہے وہ بلند ہو جائے اور ہم اُمید کر سکیں اور اِس لئے بہت ہی ضروری ہے، کہ امام کے اُن فرامین کو بار بار پڑھیں جو رُوحانی ترقّی سے متعلق ہیں، جو انتہائی ترقّی سے متعلق ہیں، جن میں ہر وقت مومن کو حوصلہ دیا گیا ہے، کبھی فرمایا ہے کہ مومن اہلِ بیت کے ساتھ ہے، اہلِ بیت کی طرح ہے اور اِس سے بھی بڑے حوصلہ افزا فرامین ہوئے ہیں ۔ کبھی فرمایا ہے کہ کیا خدا اِس بندے کو ہمیشہ کے لئے غلام رکھنا پسند کرے گا، کیا یہ غلام صرف آقا کے اچھے لباس سے اور اچھی غذا سے خوش ہو جائے گا، وہ فرمان بہت ہی عجیب ہے اور اِس کے علاوہ اور بھی فرامین ہیں اور آپ حقیقیوں کا یہ فرض ہوتا ہے، کہ بہت ہی شوق سے اُن فرامین کو الگ رکھا جائے ۔ الگ سے مراد یہ ہے کہ امامؑ کے اشادات میں بہت سے فرامین ہیں، دنیا سے متعلق ہے، دین سے متعلق ہے، صحت سے متعلق ہے، کاروبار سے متعلق ہے، (education) سے متعلق ہے وہ ٹھیک ہے لیکن آپ کے لئے جو رُوحانی ترقّی کا شوق ہے اِس لئے آپ کو اپنے (topic) کے مطابق فرامین کو ایک دم سے الگ کرنا چاہیئے اور بار بار اُن کو پڑھنا چاہیئے، بار بار اُن کو پڑھنا چاہیئے، یہ مومن کے لئے امام کے فرمان سے بڑھ کر کوئی شئ نہیں ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ ثانوی اور سکینڈری ہے ۔ ہاں! صحیح ہے کہ دین جو اچھی اچھی باتیں ہیں، امام کے فرامین کی تشریحات کی حیثیت سے ہوتی ہیں، تو میں نے آج آپ کو انبیاء، اولیاء علیہم السّلام کے بارے میں اور رسولوں کے بارے میں بتایا اور یہ بتایا کہ رُوحانیت کی بہت سی چیزیں مشترک ہوتی ہیں، نہ صرف رسولوں اور نبیوں اور اماموں میں بلکہ اگلی صف کے مومنین ہیں جو معرفت میں کامیابی حاصل کرتے ہیں وہ بھی اُن تک پہنچتے ہیں اور نہ پہنچتے تو پھر معرفت جو ہے وہ ممکن نہ ہوتی، تو معرفت کا مطلب شناخت، شناخت سے مراد ہے کہ رُوحانی آنکھ سے جو کچھ آپ دیکھیں گے اُس کے نتائج، معرفت ہے، شناخت ۔ جس طرح ظاہر میں آپ کسی کو جب تک نہیں دیکھتے ہیں، تو اُس کے پہچاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے ہیں، دیکھتے ہیں تو تب پہچانتے ہیں، اِس طرح معرفت دیکھنے کے نتیجے کا نام ہے اور اِس دیکھنے سے رُوحانی مشاہدہ مراد ہے اور وہ معجزات ہیں اور احوال ہیں ۔

ایک بات میں آپ کو آخر میں بتاؤں گا، آپ کا کیا گمان ہے، ہم نے تو دیکھنے کے بارے میں بہت ساری باتیں بتائیں کہ کیا چیز دیکھیں گے ۔ دیکھیں کہ ایک چیز ہے، رُوحانیت جو ہوتی ہے، وہ زمان و مکان دونوں سے برتر ہوتی ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا رُوحانیت کے واقعات (past) میں یعنی ماضی میں نہیں چلے جاتے ہیں، کیا بتایا میں نے، رُوحانیت کے واقعات ظاہری واقعات کی طرح (past) میں نہیں جاتے ہیں، وہ حال ہی کی طرح رہتے ہیں ۔ اِس معنیٰ میں کہا گیا کہ رُوحانیت زمان اور مکان کی قید سے بالاتر ہے ۔ (history) کی کوئی بات ہے کوئی بادشاہ تھا یا کوئی سُورما تھا بہادر تھا اُس کے واقعات اب ماضی میں چلے گئے، رُوحانیت کے واقعات کس طرح ماضی میں نہیں جاتے ہیں، اُس کی ایک مثال ہم سائنس کا سہارا لے کر دیتے ہیں ۔ آج کل جو مادّی علم و ہنر کا زمانہ ہے بہت سی چیزوں کو فلم کے اندر ریکارڈ

کرتے ہیں۔مثلاً آپ نے کبھی یہ دیکھا کہ محمد علی جناح صاحب نظر آتے ہیں، حالانکہ اُس زمانے میں شاید فلم کی کمزوری تھی، اگر آج کی طرح فلم ترقّی پر ہوتی تو بہت کچھ محمد علی جناح کے بارے میں ریکارڈ کرتے،تو جب اِس جیسی کوئی چیز آپ فلم میں دیکھتے ہیں،تو آپ ہی بتائیں کہ وہ آپ کس طرح دیکھتے ہیں، حال کے طور پر دیکھتے ہیں نا، (present) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اِسی طرح رُوحانیت کے واقعات جو پیغمبروں پر گزرے تھے وہ محفوظ ہیں، وہ بالکل اِسی طرح سے محفوظ ہیں ایک بات، اور دوسری مثال اس کی یہ ہے کہ جب آپ رُوحانیت میں چلے جائیں گے تو ہر چیز کا (demonstration) ہوگا یہ بھی سن رکھیں۔ کیوں ہوگا؟ پہچان کس چیز کی کریں گے آپ! خدا کی صفات کی تجلیات کی تو خدا کی صفات (action) میں ہیں، زندہ ہیں، اُن کی تجلیات میں سب کچھ ہے، ساری چیزیں ہیں۔ بہرحال اتنا کچھ کہنا کافی ہے اور پھر ترتیب سے جب کوئی سوال اُٹھے گا یا جب وقت آئے گا تو اِس سلسلے میں آپ کو تفصیلات سے آگاہ کریں گے، شکریہ۔ اگر کوئی سوال ہے،تو آپ آرام سے پوچھیں اور اِن شاءاللہ ہم آرام سے جواب دینے کے لئے کوشش کریں گے، آپ کی دعا سے اور خداوند کی یاری سے۔ یا علی مدد، شکریہ۔

رسول جو ہوتا ہے صاحبِ شریعت ہوتا ہے اور بعض دفعہ صاحبِ کتاب بھی ہوتا ہے اور نبی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے بلکہ وہ کسی رسول کی شریعت کے تحت یا کسی رسول کی کتاب کے تحت اُسی کے دین کو سہارا دیتے ہوئے کام کرتا ہے۔ کیونکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر جو آئے، تو اِس میں رسول، نبی اور سب شامل ہیں اور جہاں سے زمانۂ آدم کا تعیّن ہوتا ہے وہاں سے لے کر اب تک اتنا زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اِس میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر ایک سلسلے میں آجائیں کہ ایک کے بعد ایک آئیں، یہ تو سلسلہ بہت لمبا ہو جاتا ہے اور وہ جو ٹائم ہے (short) ہے، تو اِس لئے بیک وقت بہت سے پیغمبروں کا تصور ملتا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ اِس سیّارۂ زمین پر جب بیک وقت کئی پیغمبر ہوں گے، تو اُن کا کوئی مرکز ہونا چاہیئے خدائے واحد کے قانون کے مطابق کیونکہ خدا ایک ہوتا ہے، تو اِس لئے پیغمبروں میں بڑا پیغمبر بھی ایک ہونا چاہیئے اور اگر دو اماموں کا فرض کیا جائے، تو اُس میں بھی ایک مستقر ہوگا اور ایک مستودع ہوگا۔ وہی بات بنی اگر اِس سیّارۂ زمین پر بیک وقت کئی کئی پیغمبر ہوں تو اُن سب کے درمیان کوئی ایک مرکز ہوگا، اِس مرکز سے رُوحانی طور پر نظامِ ہدایت دوسروں کو چلاتا ہو۔ اِس کے علاوہ بہت جلد شریعت کو تبدیل نہیں کرنا چاہیئے اور شریعت کے لئے ایک دَور خاص ہونا چاہیئے اور ایک کافی عرصے تک لوگوں کو موقع دینا چاہیئے، لہٰذا بڑے رسول، رسولوں میں جو ناطق ہیں وہ چھ ہیں، اُن کے علاوہ بھی البتہ رسول ہیں پھر اُن کے بعد نبیوں کا درجہ آتا ہے، تو میں نے یہ بات رسولوں سے متعلق اِس لئے کی کہ آیت کا جو لفظ ہے: ''لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ''(۲:۲۸۵) ہے۔ اُس میں نبی کا لفظ نہیں ہے اور ویسے بھی شریعت میں اور علماء کے نزدیک اور قرآن میں بھی رسول میں اور نبی میں فرق ہے، تو اور آنحضرتؐ کو نبی بھی کہا ہے اور رسول بھی کہا

ہے یہ بات بھی ہے، دونوں ٹائٹل حضورؐ کو دیئے ہوئے ہیں۔ یہ ہے آپ کے سوال کا جواب۔

اُنہوں نے سوال کیا ہے کہ اِس کی کیا وجہ ہے کہ قرآنی سورتوں میں سے بعض کے نام رسولوں اور نبیوں کے نام پر ہیں اور اِس میں سب پیغمبروں کے لئے ایسا نہیں ہے اِس میں کچھ ہیں، تو میرے خیال میں یہ ہوسکتا ہے خدائی نظام ہو یا اصحاب نے اِس طرح سے سوچا ہو۔ اِس لئے کہ اِس طرح نام کے آنے میں کوئی خاص فضیلت نظر نہیں آتی ہے، اِس لئے کہ ہم اِن رسولوں کے علاوہ بعض سورتوں کو ایسا بھی پاتے ہیں کہ وہ جانوروں کے نام سے بھی پکاری جاتی ہیں۔ جیسے سورۂ بقرہ جو گائے کے نام پر ہے، عنکبوت مکڑی کے نام پر ہے اور نحل شہد کی مکھی کے نام پر ہے، کافرون، کافروں کے نام پر ہے اور الناس لوگوں کے نام پر ہے، علیٰ ھٰذا القیاس، تو اِس لئے یہ یا تو اُس سورے میں نام آیا اور اتفاق سے اُس کا نام رکھا یہ تو علماء کا کام ہے اور کچھ اِس میں خدائی نظام نہیں لگتا ہے۔ اِس کی مثال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ بہت سی سورتیں ستاروں کے نام پر ہے، سورج کے نام پر ہے، چاند کے نام پر ہے اور دیگر جانوروں کے نام پر بھی ہیں، تو یہ میرے خیال میں آپ کے سوال کا مناسب جواب ہے۔

اُنہوں نے قانون شہادت کے بارے میں جو کچھ یہاں کہا گیا تھا، اُس کے حوالے سے کہا کہ یہاں اسلام میں کسی واقعے کی شہادت کے لئے ضرورت پیش آتی ہے، تو اُس میں دو مردوں کی شہادت ہونی چاہیئے اور اگر ایک مرد ہوتا ہے اور دوسرا مرد نہیں ملتا ہے، تو اُس کی جگہ پر دو عورتیں ملتی ہیں، تو اُن دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر سمجھتے ہوئے اُن کی شہادت قبول کی جاتی ہے، تو اِس کی تاویل اور اِس واقعے کے ساتھ اِس کی کیا مطابقت ہے۔ یہ سوال کرتے ہیں، تو اِس کے لئے عرض یوں ہے کہ سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ اِس مرد سے اور اِس عورت سے کیا مراد ہے، مرد سے دین کا وہ درجہ مراد ہے جو جاننے والا ہے اور عورت سے دین کا وہ درجہ مراد ہے جو کمتر ہے علم کے لحاظ سے۔ مثلاً حقیقت میں او ر دین میں دنیا کے معاملے میں نہیں، دین میں، علم میں اور رُوحانیت میں ایک عورت ہے وہ حدودِ دین کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے، تو وہ رُوحانیت کی زبان میں مرد کہلائے گی اور ایک مرد ہے جو رُوحانیت میں اُس عورت سے کمتر ہے، تو اِس کی جسمانیت سے قطع نظر یہ دین کی عورت کہلائے گا۔

اب دوسری بات کہ اگر آفاق و انفس سے ایک شہادت مکمل ملتی ہے اور دوسری شہادت اُس کے برابر نہیں ملتی ہے تو کم درجے کی چھوٹی دو مثالیں چاہئیں تا کہ اُن دو کمتر مثالوں کو ملا کر اِس اعلیٰ مثال کے ساتھ برابر کر کے مجموعاً دو مثالیں شمار کی جائیں۔ جس طرح کہ جہاں دو مرد نہیں ہوتے ہیں ایک مرد ہوتا ہے اور دوسرا نہیں ہوتا ہے، تو اُس دوسرے مرد کی جگہ پر دو عورتوں کو لے کر دونوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اِس طرح آفاق و انفس کی شہادتوں میں اگر فی الحال ذہنی طور پر ایک شہادت آفاق سے یا انفس سے اچھی ملتی ہے، اعلیٰ ملتی ہے اور دوسری اچھی

اعلیٰ اور (perfect) شہادت نہیں ملتی ہے مگر کمزور مثالیں ملتی ہے، تو اُس میں بجائے دو کے تین شہادتیں، ایک (perfect) اور دو کمزور سی تو پھر اُس کو قبول کرنا پڑے گا یہ اِس کی تاویل بنتی ہے۔ آپ کے سوال کا جواب مہیا ہو گیا۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی قس کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ دھر

کیسٹ نمبر: Q-36-A تاریخ: ۶/اپریل/۱۹۸۴ء کراچی

Click here for Audio

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عالی قدر مومنین! آپ چند بار صلوات پڑھ لیجیئے تاکہ صلوات کے طفیل سے ہمیں اور آپ کو مدد ملے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وآلِ مُحَمَّدٍ (چند بار)۔ امامِ عالی مقامؑ کے جتنے مرید اِس سیارۂ زمین پر بستے ہیں، اُن کے صدقے ہم چاہتے ہیں، کہ امامؑ اپنی جماعت کی خیرات ہمیں عنایت کریں اور جماعت کی بندگی اور خدمت کی حرمت سے ہمیں توفیق عنایت ہو۔

آج خواہش یہ ہے، کہ سورۂ دھر (۷۶) کے بارے میں کچھ عرض کریں گے، کیونکہ سورۂ دھر ایک عظیم الشّان سورہ ہے اور اِس کی حکمتیں عجیب وغریب ہیں، ساتھ ہی ساتھ اِس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے، کہ یہ اہلِ بیتِ اطہارؑ کی شان میں نازل ہوا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اِس میں انسان کی حقیقت کا ذکر ہے، کہ انسان کب سے ہے اور اِس سے پہلے کیا تھا اور کس طرح دنیا میں آیا اور واپس کیسے لوٹے گا، اِس قسم کی حقیقتیں یہاں درج ہیں۔ اِس کے لئے مولا سے یاری چاہتے ہوئے اور آپ کی دُعا چاہتے ہوئے میں اِس کا آغاز کرتا ہوں۔ سب سے پہلے ارشاد ہے کہ: "هَلۡ اَتٰى عَلَى الۡاِنۡسَانِ حِيۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ يَكُنۡ شَيۡـًٔا مَّذۡكُوۡرًا" (۷۶:۱) کیا انسان پر دھر میں سے ایک وہ وقت آیا ہے جس میں، کہ انسان کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا۔ یہ ہے اِس آیۂ کریمہ کا مختصر ترجمہ مگر اِس میں بہت عظیم حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اِن حکمتوں کی وضاحت اِس طرح سے ہے، کہ انسان اِس دُنیا میں آنے سے قبل بھی ایک طرح سے موجود تھا لیکن اُس نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا تھا یعنی اُس کے پاس جو علم تھا وہ آخر کو پہنچا تھا، اور اِس کے سامنے علمی تحلیل کے لئے کوئی چیز نہیں تھی علمی تحلیل کے لئے کوئی چیز نہیں تھی، تو کس طرح! اِس سلسلے میں ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ علم کیا ہے۔ علم کسی چیز کے تجزیہ کرنے کا نام ہے، کسی چیز کی حالت وکیفیت کو جاننے کا نام علم ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم کا مآخذ کیا ہے؟ (source) کیا ہے؟ کہاں ہے؟ اور وہ کون سی چیز ہے جس کے تجزیہ کرنے سے علم ملتا ہے؟ تو اِس کے لئے یہ کائنات ہے، اِس کائنات کا نام عربی میں عالَم ہے

اِس کائنات کا نام عالَم ہونے کا ایک سبب ہے، وہ علمی سبب ہے، کہ علم اِسی کائنات میں ہے، کائنات میں سے کسی چیز کو آپ اُٹھائیں، اُس کا تجزیہ کریں، اُس کا (analysis) کریں، تو اُس میں سے آپ کو ایک علم ملے گا۔ اُس کے وُجود میں سے، اُس کے باطن میں سے، اُس کے ظاہر میں سے، اُس کی حالت میں سے، اُس کی حرکت میں سے، اُس کے فعل سے، آپ کو علم ملے گا۔ ایک تو ہے عالِم اور ایک ہے عالَم، اِن دونوں کے آپس میں جو رشتہ ہے وہ علم کا ہے۔ عالَم اِس لئے عالَم ہے اور اِس معنیٰ میں عالَم ہے، کہ یہ علم کے لئے آلہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ گرامر کے لحاظ سے ایک اسمِ آلہ ہوتا ہے، کسی اوزار کا نام اسمِ آلہ کہلاتا ہے، تو یہ عالَم علم کے لئے آلہ ہے کہ علم اِسی میں سے پایا جاتا ہے، حتیٰ کہ آسمانی کتاب بھی اِسی کائنات میں سے ہے۔ جیسے حروفِ مقطعات کے سلسلے میں اور قرآن کے آغاز میں آیا ہے کہ: ''الٓمٓ'' الف = طول، لام = عرض، میم = عمق یعنی لمبائی، چوڑائی، گہرائی، تو یہ اشارہ ہے اِس کائنات کی طرف اور اِن حروفِ مقطعات کی تاویلات میں سے ایک تاویل یہ ہے کہ ''الٓمٓ'' سے کائنات مراد ہے۔

''ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ'' (۲:۲) وہ کتاب، یہ کتاب نہیں! ھٰذا = یہ، ذالک = وہ۔ اشارۂ بعید، اشارۂ قریب، لیکن بہت سے علماء نے قرآن کو قیاس کرتے ہوئے اور یہ مانتے ہوئے، کہ یہ قرآن کے بارے میں ہے جس میں کہ کوئی شک نہیں ہے، تو اِس کا ترجمہ ''یہ کتاب'' کر دیا، بجائے اِس کے کہ ''وہ کتاب'' ترجمہ کریں۔ حالانکہ قرآن ہی کے اندر قرآن کے لئے ھٰذا القرآن آیا ہے، ھٰذا کی ضمیر آئی ہے، قرآن کے لئے ذالک کی ضمیر نہیں آئی ہے۔ جیسے آپ انگریزی میں جو چیز سامنے ہے اِس کو (this) کہیں گے، (that) نہیں کہیں گے۔ اُردو میں آپ ''یہ'' کہیں گے، جو چیز سامنے ہے ''وہ'' نہیں کہیں گے، تو خداوندِ عالم کی ہر ہر بات عدل اور انصاف سے اور حکمت سے پُر ہے، اور کوئی منطق اُس میں سے کوئی کمی یا کوئی غلطی نہیں نکال سکتی ہے، تو یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ قرآن کے لئے خدا نے ذالک کہا ہو، جو مسلمانوں کے سامنے ہے، پیغمبرؐ کے سامنے ہے، سب کے سامنے ہے، تو یہ کائنات کے لئے ہے ''الٓمٓ'' اور جس میں کہ کوئی شک نہیں ہے، اِس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے سب کے سامنے ہے یعنی کائنات میں جو کچھ ہے وہ زبانِ حکمت میں ہے، زبانِ قدرت میں ہے، وہ ایک ایسی زبان ہے کہ کسی علاقے کی زبان نہیں ہے وہ کسی ملک کی زبان نہیں ہے، وہ نیچرل ہے یعنی حکمتی زبان ہے، اِس کو ہر شخص اپنے فہم کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً سورج کو پڑھ سکتا ہے، چاند کو پڑھ سکتا ہے، ستاروں کو، ہوا کو، بارش کو اور اِس کائنات میں سے جو کوئی مردِ حکیم ہو، دانا ہو، دانشمند ہو، جاننے والا ہو، اِس کائنات کی حکمتوں کو، اِس کے قوانین کو، اِس کے نظام کو سمجھ سکتا ہے، لیکن جو رُوحانیت کے اعلیٰ مقامات کو پہنچتا ہے وہ اِس سے بہت کچھ سمجھ سکتا ہے، اور بزرگانِ دین کا یہ قول ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اِس کائنات کو پڑھا اور خدا کی تحریریں تھیں اِس میں، تو میں اِس بات کی وضاحت کر رہا ہوں کہ عالَم کا نام کیوں عالَم رکھا گیا، اِس لئے کہ یہ اسمِ آلہ ہے اور علم اِسی میں ہے۔

اب اگر آپ کو کروڑوں سال کی عمر دی جائے اور آپ اِس کائنات کا تجزیہ کریں اور کائنات میں جو کچھ علم ہے، اُس کو آپ ختم کر بیٹھیں تو کیا ہوگا؟ آپ پھر عقلی طور پر، علمی طور پر مزید حرکت نہیں کر سکیں گے، کیونکہ آپ کے سامنے جو علم تھا وہ انتہا کو پہنچا۔ یہاں رہتے ہوئے اِس سوال کا جواب بھی مہیّا کریں کہ کوئی پوچھتا ہے کہ علم کبھی ختم ہوتا ہے؟ میرا جواب ہوگا کہ ہاں! ایک طرح سے ختم ہوتا ہے اور پھر دوسری طرح سے ختم نہیں ہوتا ہے، میں اِس کا جواب اِس طرح سے دوں گا۔ کیوں؟ سب لوگ سمجھتے ہیں کہ علم کبھی ختم نہیں ہوتا ہے، یہ یک طرفہ جواب صحیح نہیں ہے۔ میں تو کہوں گا کہ علم ختم ہوتا ہے ایک اعتبار سے پھر دوسرے اعتبار سے کبھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ میں اِس کے مقابلے میں مثال کے طور پر دوسرا سوال پیش کروں گا، میں پوچھوں گا وقت ختم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے؟ کوئی کہے گا کہ وقت کبھی ختم نہیں ہوتا، میں کہوں گا کہ وقت ختم ہوتا[ہے]اور نہیں ہوتا ہے، اور وقت کے ختم ہونے کا ثبوت میں یہ پیش کروں گا کہ تقریباً بارہ گھنٹے کی رات ہوتی ہے اور تقریباً بارہ گھنٹے کا دن ہوتا ہے، تو ہم ہر بار اِس وقت کے سرمائے کو ختم ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، اور جہاں وقت ختم نہیں ہوتا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ اِسی (repetition) سے، اِسی تکرار سے وقت ختم نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا علم ایک بار ختم ہوتا ہے لیکن علم کو پھر دوسری دفعہ استعمال کریں، پھر تیسری دفعہ کو استعمال کریں تو پھر کبھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ جیسے سمندر کے بارے میں اِس کی مثال دیں گے، سمندر سے اِس کی تشبیہہ دیں گے یہ کہ سمندر کبھی ختم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے؟ تو سمندر کبھی ختم نہیں ہوتا ہے اور ختم ہوتا ہے۔ اگر آپ کو جہاز پر سمندر کی سطح سے گزرنا ہے تو سمندر ختم ہو گیا، اگر آپ نے اِس سمندر کا تجزیہ کرنا ہے، اِس کو تولنا ہے، اِس کو ماپنا ہے اور اِسی میں رہنا ہے، تو سمندر ختم نہیں ہوتا ہے، تو جو اُونچی حقیقتیں ہیں وہ نفی اور اثبات کا تقاضا کرتی ہیں اور اُن کا مکمل جواب اِسی طرح سے مہیّا ہو جاتا ہے۔ میں واپس لوٹتا ہوں کہ ''الٓمٓ'' کی تاویل کتابِ کائنات ہے، صحیفۂ کائنات ہے اور پھر اِسی سے آسمانی کتاب ہمیشہ بنائی جاتی ہے کیونکہ خداوندِ عالم نے اِس کائنات کو بنایا ہے، جب بھی بنایا ہے، تو اِس کو علم سے حکمت سے پُر کر دیا ہے۔ علم کے خمیر سے اِس کو بنایا ہے، کائنات کو، اِس کی ہر چیز میں علم ہے، اِس کی ہر چیز میں حکمت ہے۔ لہٰذا میں نے ایک طرح سے عالَم کی توجیہہ کی، تو ایک طرف عالَم ہے اور دوسری طرف عالِم اور اِن دونوں کے درمیان جو رشتہ ہے وہ علم ہے۔ عالِم اِس لئے ہے کہ وہ جاننے والا ہے اور عالَم اِس لئے ہے کہ وہ اسمِ آلہ ہے، جاننے کا ذریعہ ہے، جس سے علم جانا جاتا ہے۔

اب اصل بات کی طرف لوٹتے ہیں وہ یہ کہ انسان جب اِس کائنات کو کروڑوں برس بعد مطالعہ کر چکا ہوتا ہے، اِس کا تجزیہ کر چکا ہوتا ہے، تو پھر انسان مرتا نہیں ہے، زندہ رہتا ہے لیکن اُس میں بے کیفی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے یعنی مثلاً مزہ نہیں آتا ہے، [وہ] جتنے (stages) ہیں، جتنے مراحل ہیں اُن کو طے کر چکا ہوتا ہے پھر خدا کے قانون کے مطابق ایک چیز کی ضرورت ہوتی ہے یہ کہ تمام چیزوں کو بھول جائیں اور پھر نئے سرے سے ایک زندگی کا آغاز کریں۔ وہ کس طرح

نئے سرے سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اُس میں کافی وضاحت کی ضرورت ہے۔کسی نمائندے کے ذریعے سے، کسی مظہر کے ذریعے سے، کسی سائے کے ذریعے سے۔ جو رُوح موجود ہے، جو رُوح قدیم ہے، جو رُوح ہمیشہ سے ہے وہ ایک دوسری رُوح کے ساتھ یا کسی سائے کے ساتھ رابطہ قائم رکھتی ہے اور پھر ایک نئی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

یہاں سورۂ دھر کے شروع میں اِسی کا ذکر ملتا ہے، اور اِس سلسلے میں ہمیں ایک اور حقیقت کا جاننا از حد ضروری ہے وہ ہے دھر۔ دھر اُس ٹائم کو کہتے ہیں جو اٹل ہے، جو ٹلتا نہیں ہے، ٹھہرا ہوا ہے، گزرتا نہیں ہے یعنی وقت کے دو تصور ہیں، ایک وقت وہ ہے جو بڑی جلدی کے ساتھ گزرتا جاتا ہے، ایک وقت وہ ہے جو ٹھہرا ہوا ہے، ساکن ہے وہ نہیں گزرتا ہے۔ یہ دونوں وقت کس طرح سے ہیں؟ جو وقت اِس کائنات کے گھیرے میں آچکا ہے یہ گزرتا ہے، آسمان کی گردش سے، سورج کے طلوع وغروب سے، اور چاند کے بڑھنے سے اور گھٹنے سے اور ستاروں کے چمکنے سے، اور سیارۂ زمین اور دیگر سیاروں کی گردش سے جو ٹائم جو وقت یا جو زمان اِس کائنات کے گھیرے میں آچکا ہے یہ بہت جلدی سے گزرتا ہے۔ دوسرا وہ وقت ہے جو اِس کائنات سے بالاتر ہے، اُس وقت کا مفہوم یا تصور اِس طرح سے ملتا ہے، کہ آپ بفرضِ محال اِس کائنات کو مٹائیں یا آپ اِس سے (free) ہو جائیں، اِس سے بالاتر ہو جائیں، تو آپ کو ایک ایسے وقت کا تصور ملے گا کہ وہاں پر نہ سورج طلوع ہوتا ہے، نہ غروب ہوتا ہے، نہ آسمان گردش کرتا ہے، نہ زمین گھومتی ہے، نہ موسموں کی کوئی تبدیلی ہے، بس خاموش، کوئی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے ٹائم حرکت میں آئے، وہ ٹھہرا ہوا وقت ہے، اُس کو کہتے ہیں دھر، یہ دھر ہے، اِس کو فارسی میں کہتے ہیں زمانِ ناگزرندہ، ٹھہرا ہوا وقت۔

پھر سے اِس کی ہم وضاحت کرتے ہیں، آپ ٹائم کو جس طرح تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں کہتے ہیں (past)، کہتے ہیں (present)، کہتے ہیں (future) اور اُردو میں یا عربی میں کہتے ہیں ماضی، حال اور مستقبل۔ ماضی اِس لئے کہ وہ گزر چکا ہے، حال اِس لئے کہ وہ گزرتا ہے بڑی جلدی کے ساتھ، حال بھی کچھ ٹھہرا ہوا نہیں ہے، اور مستقبل اِس معنیٰ میں کہ وہ آپ کی طرف آرہا ہے، تو یہ اِس دُنیا کا وقت ہے لیکن اِس دُنیا سے باہر، اِس کائنات سے بالاتر جو وقت ہے وہ دھر ہے۔ اب ہم نے دھر کے بارے میں کچھ وضاحت کی، تو خداوندِ عالم کہتا ہے کہ اُس بے پایان اور اٹل وقت میں سے انسان پر اُس بے پایان ٹائم میں سے، اُس بے پایان اور ساکن ٹھہرے ہوئے زمان میں سے ایک وقت انسان پر آیا تھا وہ پھر دوبارہ آیا ہے۔ اِس سے یہ اشارہ یہ ملتا ہے کہ انسان بہت پہلے موجود تھا لیکن عرصۂ دراز تک زندہ رہنے اور علم کے مراحل سے آگے سے آگے گزرنے کے بعد تقاضا یہ ہوا کہ نئے سرے سے ایک زندگی کا آغاز کریں اور انسان کے متعلق یہ تصور کبھی نہیں ہوسکتا ہے، کہ انسان کبھی نہیں تھا، انسان تھا مگر علم کی جو کیفیت ہے وہ ہر وقت بدلتی رہتی ہے، کہ انسان کبھی علم کے ابتدائی مراحل میں ہوتا ہے، کبھی عروج پر ہوتا ہے، کبھی انتہاء کو پہنچتا ہے، تو انتہاء کو جب پہنچتا ہے، تو اُس میں مسئلہ پیدا ہوتا

ہے کہ اُس کے سامنے تجزیہ کے لئے کوئی چیز نہیں ۔مثال کے طور پر ایک قصے کی کتاب ہے یا کہانی کی کتاب ہے یا فلسفے کی کتاب ہے یا کوئی مذہبی کتاب ہے اُس میں اچھی اچھی باتیں ہیں ۔ایک ہوشمند اُس کو شروع کرتا ہے اور آخر کو پہنچ جاتا ہے تو اگر بفرضِ محال اُس کے پاس یہی ایک کتاب ہو تو وہ کیا کرے گا پھر، اُس نے تو ایک طرح سے اُس کتاب کو ختم کیا، جو مزہ اُس کو آرہا تھا نئی نئی چیزوں کے دیکھنے سے، سننے سے، سمجھنے سے اب اُس کے سامنے کوئی ایسی نئی چیز نہیں ہے ۔جیسے خدا کی مثال ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ خدا غور وفکر کرتا ہے، خدا کسی چیز کا تجزیہ کرتا ہے جس طرح انسان کرتا ہے اور ہر روز انسان ایک نئی چیز کے سمجھنے سے، جاننے سے، سننے سے خوش ہوتا ہے، تو کیا خدا کے لئے کوئی نئی چیز ہے، ایسی کوئی چیز جس کو اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھی، یہ بات نہیں ہے، تو خدا کے سامنے غور وفکر کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں ہے اور خدا کے سامنے کوئی نیا کام نہیں ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے ۔ اِسی طرح اگر انسان بھی بہت ہی اعلیٰ مراتب کو پاتا ہے، اعلیٰ درجے کو پہنچتا ہے، تو تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایک بار آنکھ بند کریں اور پھر فراموشی کے دریا میں غوطہ لگائیں اور نئے سرے سے اِس کا ایک ظہور ہو، نئے سرے سے اِس کا ایک ظہور ہو، یہ تناسخ کی طرح نہیں ہے ۔تناسخ بہت کم تر چیز ہے، اِس کو کہتے ہیں ظہورات، اِس کو کہتے ہیں جلوے، جلوہ نمائی، جیسے خدا کے متعلق یہ تصور ہے کہ: ''كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ ''(۲۹:۵۵)، ہر روز اِس کی ایک شان ہے، تو خدا کی اپنی نسبت سے ہر روز کوئی نئی شان نہیں ہے، بندوں کی نسبت سے، بندوں کے اوصاف کو خدا سے منسوب کرتے ہوئے، اپناتے ہوئے خدا کے لئے کوئی نئی چیز ہو سکتی ہے، انسانوں کی وجہ سے، خدا کی اپنی وجہ سے کوئی چیز نئی نہیں ہے ۔لہٰذا جہاں ہم مظہریت کا تصور رکھتے ہیں، اور مظہریت کے لئے یہ ہے کہ ہر زمانے میں ایک نیا لباس ہو، تو یہ نیا لباس خدا کے لئے نیا ہے اور نئی چیز ہے، یہ نہ ہو تو خدا کے ظہورات کے کچھ معنی نہیں بنیں گے، جو ذات ہے اُس میں گوناگونی نہیں ہے، جو ظاہر ہے، جو مظہریت ہے، جو مظہر ہے، جو لباس ہے اُس میں گوناگونی ہے، تو اِسی کی بدولت اِس میں ہر روز ایک نئی شان ہو سکتی ہے، تو انسان ہمیشہ سے ہے لیکن بہت بلندی پر جانے کے بعد پھر تقاضا یہ پیدا ہوتا ہے، کہ وہ پھر ''اَسْفَلَ سَافِلِيْن ''(۵:۹۵) کی طرف آئے: ''ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ''(۵:۹۵) خدا ہی فرماتا ہے اور اِسی میں حکمت ہے ۔

اب اِس مقام پر آتے ہوئے ایک اور مثال پیش کریں گے یہ کہ آدمؑ کے متعلق آپ کا کیا تصور ہے؟ کیا کسی کو اِس میں شک ہے کہ آدمؑ بہشت سے دنیا میں نہیں آیا ۔آدمؑ بہشت سے آیا لیکن سوال یہ ہے کہ بہشت کے کتنے درجے ہیں؟ آٹھ ہیں یا بارہ ہیں اِس میں تو ہر حالت میں وہ جو درجات ہیں (limited) ہیں ۔اگر بہشت ایک بے پایان چیز ہوتی، اُس کے درجات نہیں ہوتے، اُس میں شمار نہ ہوتا، اُس میں عدد نہیں ہوتا ہے، تو بات کچھ اور بن جاتی ۔جب اُس کے درجات ہو گئے، مثلاً آٹھ درجات ہو گئے، تو پھر آپ اِس کو کس طرح سے سمجھیں گے ۔اگر آٹھ درجات ہیں تو ایک دوسرے کے اُوپر

ہیں، ایک نیچے ہے اور ایک اُوپر ہے اور ایک اُس سے بھی اُوپر ہے۔ اب یہ درجات ہیں تو تقاضا یہ ہے کہ نیچے سے اُوپر کو جائیں، ایسا ہوگا، ضرور ایسا ہوگا اِس کی منطق یہ ہے۔ اچھا! تو بہشت میں کوئی بندہ داخل ہوتا ہے، تو سب سے اُوپر جانا چاہیئے یا سب سے نچلے درجے میں جانا چاہیئے۔ آپ کہیں گے کہ اُصول تو یہ ہے کہ وہ جو ابتدائی درجہ ہے اُس میں جائے گا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُسی ابتدائی درجے میں رہے گا یا دوسرے درجے میں چڑھے گا۔ اِس کا جواب ملے گا کہ نہیں لازمی ہے کہ وہ دوسرے درجے میں جائے گا اور پھر اُصول یہ سامنے آیا کہ پھر درجہ بدرجہ وہ اُوپر کو جائے گا، چلو اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا۔ اب وہ پھر اپنے وقت کو ہمیشہ رکھنے کے لئے اور ہمیشہ لذّتوں میں رہنے کے لئے اُس کو کیا کرنا چاہیئے؟ میں یہ آپ سے پوچھتا ہوں کیا اُس کو پھر نیچے سے نیچے اُن مراتب میں، اُن درجات میں نیچے سے نیچے آنا چاہیئے یا اُس سب سے اُوپر کے درجے میں رہنا چاہیئے یا پھر دوبارہ جانے کے لئے دنیا میں آنا چاہیئے اور آدمؑ نے کیا کیا؟ نیز سوال یہ بھی ہے کہ آدمؑ جو بہشت سے دنیا میں آیا، ابتدائی بہشت سے آیا، درمیانی بہشت سے آیا یا انتہائی بہشت سے آیا؟ عقل تو یہ کہتی ہے کہ یہ اُصول نہیں ہے کہ ابتدائی بہشت سے ایک دم سے لوٹ جائیں۔ قانون اور قاعدہ یہ ہونا چاہیئے، کہ وہ انتہائی بہشت سے دنیا میں آیا یعنی سب سے (top) پر جو بہشت ہے اُس میں سے آیا، بجائے اِس کے کہ وہ بہشت میں ہمیشہ رہنے کے لئے پھر بہشت کی سیڑھیوں سے اُتریں اور نیچے نیچے آئیں، تو بہشت کی دائمیت کو برقرار رکھنے کے لئے اُس نے ایک قدم دنیا میں رکھا تا کہ اِس گولائی میں پھر اِس کو شروع کرے ابتدائی بہشت کو۔ کیونکہ ''كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ ''(۲۱:۳۳) قرآن یہ کلیّہ دیتا ہے کہ ہر چیز گولائی میں گھومتی ہے، گولائی میں گھومتی ہے، اور خدا جہاں کہتا ہے کہ: ''هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ''(۲۳:۱۱) وہ بہشت میں ہمیشہ ہیں تو اِس گھومنے کو کہتا ہے، دیکھیں کہ دنیا کا وقت تھوڑا ہے، آپ قرآن کو پڑھیں گے تو دنیا کا وقت بالکل ایک خواب کی طرح ہے اور بہشت کی زندگی بہت لمبی ہے، تو اِس گھومنے میں زیادہ وقت بہشت میں لگتا ہے، تو اِسی (sense) میں (on the whole) بہشت میں ہمیشہ رہنے کے معنی بنتے ہیں۔

اچھا! ایک مثال اِس سلسلے میں آپ نے کبھی ایک کھیل ہے نہیں کھیلا ہوگا کسی لکڑی کے سرے کو تھوڑا سا آگ لگا لیتے ہیں اِس پر ایک چنگاری یا ایک انگارہ سا بیٹھ جاتا ہے اور پھر بچے اِس کو گھماتے ہیں، تو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے آگ کا ایک (ring) ہے۔ حالانکہ یہ گھمانے کی بات ہے لیکن جلدی جلدی گھمانے کے نتیجے میں وہ ایک (ring) سا نظر آتا ہے، تو وہ (ring) ایک (ring) ہی ہے حالانکہ (ring) نہیں ہے وہ پوائنٹ ہے، نکتہ ہے۔ یہ ایک قریبی مثال ہے، (correct) مثال نہیں ہے، تو اِسی طرح بندۂ مومن زیادہ سے زیادہ عرصہ بہشت میں رہتا ہے اور بہت کم عرصے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ نیز اِس میں ایک یہ بھی ہے کہ کُلی طور پر بہشت سے نہیں آتا ہے، ہم اِس پر بارہا لیکچر دے چکے ہیں کہ بہشت سے (cut off) ہو کر نہیں آتا ہے، اپنے (shadow) کو بھیجتا ہے اور اِس کی بہت سے سی مثالیں ہیں۔ دنیا میں

آپ دیکھتے ہیں کہ ٹی۔وی سے کوئی (picture) آتی ہے آپ کے سیٹ پر تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسٹیشن سے (cut off) ہو کر یہ چیز یہاں آتی ہے بلکہ اسٹیشن پر قائم ہے لیکن رَسائی کے طور پر اور (approach) کے طور پر اور (shadow) کو بھیجنے کے طور پر وہ چیز یہاں آتی ہے۔ جب مادّی چیزوں میں اِس قسم کی مثالیں ملتی ہیں، کہ چیز ایک لحاظ سے آتی ہے اور دُوسرے لحاظ سے نہیں آتی ہے، تو اِس سے بڑھ کر رُوح ہے جو بسیط ہے، جو ہر جا ہے، جو (omnipresent) ہے تو لہٰذا اِس معنی میں بھی رُوح بہشت میں ہے یعنی رُوح کا وہ سرا بہشت میں ہے۔ مثلاً دیکھیں کہ بادل سے بارش کے قطرے ٹپکتے ہیں، برستے ہیں وہ تو (cut off) ہو کر برستے ہیں لیکن سورج کی روشنی اِس طرح سے نہیں آتی ہے گو کہ اُس میں بھی ذرّات ہیں، تو اگر ہم اُن ذرّات کو ایک رسّی کی طرح مانیں، ایک تار کی طرح مانیں، تو اِس اعتبار سے روشنی جو سورج سے سطحِ زمین تک پہنچتی ہے، وہ (cut off) ہو کر نہیں پہنچتی ہے۔ اِس معنیٰ میں روشنی کا ایک سرا اُس کے سرچشمہ میں ہے اور دوسرا سرا سطحِ زمین پر۔ اِس طرح رُوح اپنے بالائی سرے سے سرچشمے میں ہے اور اِس کا جو زیرین سرا ہے، نچلا جو سرا ہے اِسکے اعتبار سے اِس شخصیت کو رُوح کا سرا چھو رہا ہے، جیسے ہی یہ سرا چھو رہا ہے اِسی سے ایک احساس، ایک شعور، ایک انا یہاں بنتی ہے، تو انسان کی دو انائیں ہیں ایک انائے علوی ہے جو سرچشمہ میں ہے جو خدا کے ساتھ ہے، اور ایک انا یہ ہے اور آنے جانے کی بات اِسی سے متعلق ہے، اُس کے لئے آنے جانے کی [بات] نہیں ہے، اور علم جو ختم ہوتا ہے اِسی کی نسبت سے علم ختم ہوتا ہے اور اِسی کے لئے ہر بار ایک نیا ظہور چاہیئے، ایک نئی شان چاہیئے، لہٰذا یہاں اِس سورہ میں انسان کا ذکر ہے، کہ انسان سے مراد یہ انسان، انسان سے مراد یہ انا، تو اِس سے پہلے بھی تھی لیکن اِس پر فراموشی کا عالم گزرا اور یہ اپنے آپ کو اور ہر چیز کو بھول گیا، جیسے یقیناً ہم پہلے تھے لیکن اب ہم کو یاد نہیں ہے، اِس لئے کہ ہم بھول گئے ہیں اور اِس بھولنے میں مصلحت ہے۔ جس طرح دن کے ساتھ ساتھ رات کے ہونے میں حکمت اور مصلحت ہے، اِسی طرح یاد داشت کے ساتھ ساتھ بھول جانے یعنی فراموش کر دینے میں بھی بڑی حکمت ہے۔

اب ذرا تبصرہ بھول جانے پر کرنا چاہیئے کہ اِس میں کیا حکمت ہے، اِس کی قیمت یا اِس کی قدر بھی اتنی [ہی] ہے جتنی کہ یاد کرنے کی۔ قرآن کہتا ہے کہ آپ جب ترازو سے چیزوں کو تولتے ہیں، تو انصاف سے تولیں (۹:۵۵) یعنی حقائق کو جب آپ تولتے ہیں، تو دونوں پلڑوں کا خیال رکھیں اور دونوں کو اہمیت دیں۔ مثلاً دن کے ساتھ آپ رات کو تولتے ہیں، تو یہ نہ کہیں کہ بس ہم کو دن چاہیئے اور رات نہ ہو، تو دن سے کیا ہو سکتا ہے، رات کے ساتھ ساتھ دن کا ہونا لازمی ہے اور دن کی جتنی اہمیت ہے رات کی بھی اُتنی اہمیت ہے۔ اِس لحاظ سے انسان میں جتنی متضاد صفات ہیں مثلاً یاد کرنا اور بھول جانا، بھول جانے میں بھی اتنی بڑی حکمت ہے اگر ہم اگلی زندگی کو فراموش کر بیٹھے ہیں تو اِسی میں حکمت ہے اِسی کی بدولت ہم کو ہر چیز نئی لگتی ہے، ایک نئی زندگی کا ہم کو احساس ہے اور ہم خوش ہیں، اگر ہم کو ماضی کی چیزیں یاد ہوتیں، تو وہ یادیں ہم کو شاید

ستاتیں، شاید ماضی میں ہماری حالت اچھی نہیں ہوتی یا اگر اچھی ہوتی، تو بھی موجودہ زندگی کے مقابلے میں ہم کو یہ زندگی اچھی نہیں لگتی، لہٰذا یہ اچھا ہوا کہ ہم اگلی زندگی کو فراموش کر بیٹھے۔ اِس کے علاوہ اِس زندگی سے بھی ہم (example) لے سکتے ہیں کہ بھول جانے میں کیا فائدہ ہے، مثلاً دن کو ہمارا دل دُکھایا جاتا ہے کسی بات سے ہم آزردہ خاطر ہو جاتے ہیں، ہم کو رنج پہنچتا ہے، غمگین ہو جاتے ہیں، جب ہم سو جاتے ہیں، تو ہمارا غم و غصّہ چلا جاتا ہے اور اِس سونے کی بدولت جس میں ایک فراموشی کارفرما ہے، جس میں بھول ہے، اور یہ سونا موت کی طرح ہے، اِس کی بدولت ہم بہت ساری چیزیں بھول جاتے ہیں، غم بھی بھول جاتے ہیں اور غصّہ بھی بھول جاتے ہیں اور ایسی بہت سی باتیں بھول کر صبح نئے سرے سے تازہ ہو جاتے ہیں، یہ تو چھوٹی مثال ہے اور ہماری یہ جو نئی زندگی ہے یہ بڑی مثال ہے اور یہ جس طرح ہم اپنی اگلی زندگی کو فراموش کر بیٹھے ہیں اِس میں رحمت ہے۔ اِسی سے لاانتہائی بن جاتی ہے، اِسی سے ہم ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں اور حرکت کر سکتے ہیں اور اگر ہمارے ذہن میں، ہماری یادداشت میں اگلی چیزیں موجود ہوتیں، تو پھر ہم حرکت نہیں کرتے اور ہم خوش نہیں ہوتے اور ہم ایک نئی چیز کی تلاش میں لگے نہیں رہتے۔ بہرحال اِس قرآنی ارشاد کے مطابق انسان ہمیشہ سے ہے اور تھا لیکن اِس پر ایک کیفیت گزری عرصۂ دراز کے بعد، پھر اِس کے نتیجے میں پھر دوبارہ وہ حرکت، وہ حالت آئے گی، وہ کیفیت گزرے گی یعنی اِس آیت کا یہ مطلب ہے۔ ''شَيْئًا مَّذْكُورًا'' (۷۶:۱) یعنی شئ مذکور کا مطلب ہے، کہ انسان کا سارا علم آخر کو پہنچا اور لہٰذا خداوندِ عالم کی حکمت کے بموجب وہ تمام چیزیں فراموش کر بیٹھا۔ اِس مقام پر میں صوفیائے کرام سے ایک مثال دینا چاہتا ہوں وہ مولائے روم کے کچھ اشعار ہیں، یہ کہ کہتے ہیں کہ:

من آن روز بودم که اسما نه بود　　نشان از وجودِ مسمّا نه بود

مولائے روم کہتے ہیں کہ میں اُس دن تھا یعنی اُس وقت بھی موجود تھا جبکہ نام نہیں تھے، اسماء نہیں تھے اور مسمّیٰ بھی نہیں تھے۔ آپ جیسا کہ جانتے ہیں دو چیزیں ہوتی ہیں موجودات میں سے ایک چیز ہوتی ہے مسمّیٰ یعنی جس چیز کا کوئی نام ہو، جس چیز کا کوئی نام ہونا چاہیئے یا جس چیز کا کوئی نام ہے تو وہ مسمّیٰ ہے۔ ایک چیز ہوتی ہے اسم، اسم ایک لفظ ہوا کرتا ہے جو مسمّیٰ سے الگ ہو سکتا ہے، پہلے وہ چیز ہوتی ہے اُس کے بعد اُس کا نام ہوتا ہے، تو دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ مولائے روم کہتے ہیں کہ میں اُس وقت میں، اور اُس حالت میں بھی موجود تھا جبکہ کوئی مسمّیٰ بھی نہیں تھا اور کوئی اسم بھی نہیں تھا۔ ز ما شد مسمّا و اسما پدید = ہم سے وہ چیزیں بھی پیدا ہوئیں جن کے نام ہونے چاہئیں اور ہم سے وہ نام بھی ہو گئے جو چیزوں کے لئے دینے چاہئیں۔ اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولائے روم اپنی اُس کیفیت کو بیان کرنا چاہتا ہے جو خدا سے مل کر ہونے کی ہوتی ہے یعنی وہ کیفیت جس میں کہ انسان کی رُوح خدا کے ساتھ مل کر ہوتی ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کیفیت پھر کبھی خدا سے الگ ہو جاتی ہے بلکہ اِس کو ہم اِس طرح سے مانیں گے کہ یہ کیفیت جس کے بارے میں

مولائے روم کچھ کہنا چاہتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں، اب بھی ہے کہ خدا کے نور سے کسی چیز کو باہر نہیں آنا ہے اور صرف ایک (shadow) کو بھیجنا ہے، ایک سائے کو بھیجنا ہے۔

یہاں پر پھر اِس بات کی ضرورت پیش آئی کہ انسان کس طرح پھر دنیا میں آیا، یہ انسان، یہ ہستی، انائے سفلی۔ یہ اِس طرح سے آئی جس طرح آپ کسی آدمی کی تصویر لیتے ہیں، آدمی سے آپ تصویر لیتے ہیں، مکان سے لیتے ہیں، درخت سے لیتے ہیں کسی منظر سے لیتے ہیں، تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ منظر کو اُس میں قید کرتے ہیں اور منظر سے کوئی چیز الگ ہو جاتی ہے یا آدمی سے کوئی چیز کم ہو جاتی ہے یا اُس کا کوئی ٹکڑا یا اُس کا کوئی جزو آپ کے کیمرے میں پڑتا ہے ایسا نہیں ہوتا ہے۔ ایک شبیہہ ایک مثال کو آپ قید کرتے ہیں اور اِس سے بڑھ کر آپ کسی کی فلم لیتے ہیں، تو اُس میں آواز بھی ہوتی ہے حرکت بھی ہوتی ہے، سب کچھ ہے، بغیر اِس کے کہ اُس کی حرکتوں میں سے کوئی کمی ہو، اُس کی شکل سے کوئی کمی ہو، یہ آنے کی مثال ہوئی، اور اِس ہستی کے وہاں واپس جانے کی مثال یہ ہے کہ آپ اِس کو ختم کر و بس، یہ چیز گئی، ایسا نہیں کہ آپ اِس تصویر کو آدمی کے ساتھ چسپاں کرنے کے لئے کوشش کریں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہے، تو انسان کے یہاں آنے اور جانے کی قطعی مثال یہ ہے اور بہت بہترین مثال ہے، بہترین مثال ہے۔ ہم جائیں گے وہاں اپنی انائے علوی میں جہاں پر اب بھی ہم ہیں، تو اِس کو نظر انداز کریں گے، اِس سے چھٹکارا پائیں گے تو ہم اپنے آپ کو وہاں پائیں گے۔

دوسری مثال آئینہ سے دے سکتے ہیں، ایک (mirror) کو، ایک آئینے کو دن کے وقت سورج کی طرف کر کے دیکھیں اِس میں سورج نظر آ رہا ہے (reflection)، تو کیا آپ نے اِس طریقے سے سورج کو آسمان سے اُتار کر آئینے میں قید کر لیا۔ نہیں تو، یہ ایک فریبِ نظر ہے۔ یہ کس طرح فریبِ نظر ہے آپ اِس کو سمجھ سکتے ہیں، اِس پر بارہا بات چیت ہوئی ہے اب آپ اِس (reflection) کو یا اِس عکس کو سورج کی طرف واپس کرنا چاہتے ہیں، تو اُس کا کیا طریقہ ہونا چاہیئے۔ کیا یہ (pass) کریں گے، کیا یہ عکس سورج کے ساتھ چپکائیں گے، چسپاں کریں گے یا پھینکیں گے، نہیں کچھ بھی نہیں! یہ ہے کہ آپ صرف اِس کو اُلٹائیں، یہ فریبِ نظر تھا اِس کو ختم کریں گے اور فریبِ نظر اِس معنی میں کہ آئینے کا کام صرف اتنا تھا کہ آپ کی نگاہ کو آسمان کی طرف (throw) کر رہا تھا۔ آپ سمجھتے تھے کہ سورج اُتر گیا حالانکہ کوئی سورج نہیں اُترا۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ آپ کی نگاہ آئینے سے ٹکرا کر آسمان میں سورج دیکھ رہی تھی نہ کہ آئینے میں۔ آپ خود سوچیں، آئینے کے اندر نہیں، آئینے کی سطح پر نہیں، کہیں بھی نہیں، آپ سورج کو جس طرح دیکھتے ہیں بس آسمان میں دیکھتے ہیں۔ یہ آپ کو دھوکہ ہو رہا ہے، آئینے کا اتنا کام ہے، صرف اتنا کام ہے کہ آپ کی نگاہ کو آسمان کی طرف (throw) کر رہا ہے۔ اگر سورج کو سیدھا براہِ راست دیکھیں تو آپ سورج کو دیکھ سکتے ہیں اور آئینے کے ذریعے دیکھنا چاہیں، تو آپ آئینے کے ذریعے سے (indirect) دیکھتے ہیں، (indirect) کا مطلب کیا کہ آپ کی نگاہ کا (angle) بن رہا ہے، زاویہ بن رہا ہے۔ اگر آئینے کے پیچھے مسالا

نہیں ہوتا، سندور وغیرہ تو آپ کی نگاہ آئینے کو (cross) کر کے آگے جاتی، جس طرح عام حالت میں یہ نگاہ کا تیر آگے جاتا ہے لیکن آئینہ کے پیچھے چونکہ (darkness) ہے، مسالا ہے، لہٰذا آپ کی نگاہ کو اِس عمل نے آسمان کی طرف لوٹا دیا، تو آپ سورج کو آسمان میں دیکھ رہے ہیں۔ آسمان بھی ہے، کچھ بادل بھی ہیں، جیسی کیفیت ہے، جیسی حالت ہے اُس کے مطابق آپ سورج کو دیکھ رہے ہیں، تو یہ ہستی، دل، دماغ، جسم اور دیگر اعضاء مجموعی طور پر ایک آئینے کا کام دے رہے ہیں اور ایک خفیف سی جھلک ہم اپنی رُوح کی دیکھ رہے ہیں۔ اگر اِس آئینے کو صاف کریں، پاک کریں اور بہت کوشش کریں تو ہم اپنی رُوح کی اصل کیفیت کو دیکھنے لگیں گے، کہ خدا سے مل کر، مونور یا لزم کی کیفیت میں ہماری رُوح کیا ہے اور منصورِ حلاج نے اِس میں کافی کامیابی حاصل کی۔ اُس نے اپنی ہستی کے آئینے کو اتنا صاف اور پاک کیا کہ پھر آسمانِ رُوحانیت میں اُس نے اپنی انا کو اور رُوحوں کے سورج کو دیکھا، اور اُس سورج کے ساتھ مل کر اِس کی انا موجود تھی تو تب اِس نے اناالحق کہا، اِس میں منصور اکیلا نہیں ہے۔ آپ تصوف کی کتابیں پڑھیں گے، تو آپ کو پتہ چلے گا بہت سارے ہیں بہت سارے ہیں، میں صرف گروہِ صوفیہ کی بات کرتا ہوں۔ مثال کے طور پر سلطان بایزید بُسطامی نے: ''سبحانی ما اعظم الشانی'' کہا، میں کتنا پاک ہوں اور میری شان کس قدر عظیم ہے۔ ایسا کہا اور شیخ عطار نے:

من خدایم من خدایم من خدا　　فارغم از کبر وکینه وزریا[هوا]

میں خدا ہوں، میں خدا ہوں میں خدا، میں کفر سے، کینہ سے اور ریا سے پاک ہوں یعنی یہ جو بات کرتا ہوں اِس کے تحت نہیں ہے، کہ کفر سے یہ کہتا ہوں، اِس کے تحت نہیں ہے، کہ کسی سے کینہ رکھتا ہوں، یہ بھی نہیں ہے کہ میں دکھاوے کے طور پر کہتا ہوں، اِس سے پاک ہوں اور میں خدا ہوں، تو یہ مثال کے طور پر ہے ایسے کتنے ہیں صوفیائے کرام جنہوں نے خود کو خدا کہا، ایک بات، لیکن آپ پوچھیں کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شخص اِس بھید کو جانتا ہے تو خود کو خدا قرار دے۔ کتنے ایسے ہوں گے جنہوں نے اِس بھید کو جان لیا، انبیاء اور آئمہ کے بعد بزرگانِ دین میں سے۔ بہت سارے ہیں لیکن عقل جانتی ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر کوئی جو اِس بھید کو جانتا ہے اناالحق کہے۔ اِس کی ضرورت نہیں ہے اور جنہوں نے اِس کا دعویٰ کیا تو اپنے لئے بہت بڑے بڑے مسائل پیدا کر دیئے۔ کیا منصور نے اپنے لئے بہت بڑا مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا، یہ قانون ہے آپ یا میں یا اور کوئی بڑے بڑے بھیدوں کو ظاہر کرتا ہے، تو اپنے لئے (problems) کو (create) کرتا ہے، اپنے لئے مسائل کو پیدا کوتا ہے، یہ تو اُصول ہے، یہ تو انسان کی فطرت ہے کہ ہر شخص اپنے معیار سے پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا آپ اگر کوئی خاص علم کو پیش کریں گے، تو ظاہر بات ہے کہ لوگ آپ کی مخالفت کریں گے، یہ تو (nature) ہے، تو میں یہ حقیقت بتا رہا تھا کہ انسان کی ایک حقیقت ہے جو خدا سے مل کر ہے، ہمارا تصور ہے، ہماری اصطلاح ہے کہ اصل سے واصل ہو جائیں، ٹھیک بات! لیکن اگر اِس کی ذرا گہرائی میں جائیں، تو پتہ چلے گا کہ اصل سے واصل

پہلے سے ہیں۔ اصل سے واصل پہلے سے ہیں کیونکہ جو نور کا سرچشمہ ہے جو خدا کا تصور ہے وہ مقام ایسا نہیں ہے، کہ اُس میں (increase) اور (decrease) ہو یعنی اُس میں اضافہ ہو اور اُس میں کمی ہو، کمی ہو اور بیشی ہو، کبھی ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ خدا سے کوئی چیز باہر آئے خلا پیدا ہو جائے اور ایک زمانے کے بعد وہ خلا پُر ہو جائے۔ نہیں، یہ نہیں، ایسا نہیں، تو جو حقیقت ہے وہ اِس قدر (solid) ہے، کہ اُس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے، تو خدا کے متعلق بنیادی تصور یہ ہے کہ وہ ایک ہی شان سے ہے، گھٹتا بڑھتا نہیں ہے وہ دنیا کی کوئی چیز نہیں ہے، کہ کبھی بڑھے اور کبھی گھٹے۔ اِس لئے خدا کے مرتبے سے کوئی چیز باہر نہیں آتی ہے، لہٰذا انسانوں کی ایک حقیقت جو بے مثال ہے، وہ خدا کے ساتھ ہمیشہ سے ہے۔

یہ جو فرمایا جاتا ہے کہ: ''یَابْنِیْ اٰدَمَ اَطِعْنِیْ اَجْعَلْکَ مِثْلِیْ حَیًّا لَا تَمُوْتُ وَ عَزِیْزًا لَا تَذِلُّ وَ غَنِیًّا لَا تَفْتَقِرُ''۔ اے ابن آدم! میری اطاعت کرتا کہ میں تجھ کو اپنی مانند بناؤں گا، یہ خدا کا اعلان ہے۔ اِس میں اطاعت یعنی فرمانبرداری شرط ہے لیکن آپ کو ایک راز کی بات اور بتاؤں، یا ابن آدم! یہ خطاب کس سے ہے؟ ویسے تو ایک لحاظ سے دیکھا جائے، تو سب ابن آدم ہیں، آدم کی اولاد ہیں، نہیں! ابن آدم صحیح معنوں میں سب سے پہلے انبیاء ہیں، پھر اولیاء ہیں یعنی ائمہ، پھر بزرگانِ دین ہیں، پھر سچے مومنین ابن آدم ہیں۔ ابن آدم، یہاں پر آدم کی فضیلتوں کی طرف اشارہ ہے، آدم کے علم کی طرف اشارہ ہے، اور جس انسان میں آدم کی کوئی بھی خاصیت نہ ہو، تو وہ کس طرح خدا کے نزدیک ابن آدم یا بنی آدم کہلا سکتا ہے اور قرآن ہی نے ہم کو ثابت کر دیا کہ نوح علیہ السلام کا ایک فرزند تھا اُس نے نافرمانی کی اور جس طرح قرآن ذکر فرماتا ہے کہ جب طوفان اُٹھا اور بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے، تو نوح علیہ السلام نے نافرمان ہونے کے باوجود اپنے اُس بیٹے کو یاد کرتے ہوئے خدا سے عرض کی، الٰہی وہ میرا بیٹا تھا اُس کی نجات کے لئے، تو خدا نے نوح علیہ السلام کی اِس درخواست کو رَد کرتے ہوئے فرمایا: نہیں! نوح! یہ آپ کا فرزند نہیں تھا، اِس لئے کہ وہ نافرمان تھا (۱۱:۴۱۔۴۸) تو دیکھا کہ خدا کا قانون کس طرح کسی فرد کو نافرمانی کی بنا پر خاندان سے خارج کرتا ہے۔ اِس لئے یہاں پر جو فرمایا گیا ہے کہ یا بنی آدم! اِس سے سب سے پہلے انبیاءؑ مراد ہیں کیونکہ آدم کی خصوصیات اُن میں ہیں سب سے پہلے، پھر ائمہ ہیں، پھر بزرگانِ دین ہیں اور پھر سچے مومنین ہیں تو یہ خطاب اُن سے ہے۔

اب اِس خدائی اعلان کے بموجب جن جن لوگوں نے خوش نصیبی سے خدا کی اطاعت کی، تو اُن کو خدا نے اِس اعلان کے بموجب اپنی ذات سے واصل کیا یا نہیں کیا؟ میں پوچھتا ہوں، آپ بولیں گے ہاں! پھر میں پوچھتا ہوں کہ اگر ہم اِس طرح مانیں، کہ خدا نے اِن انسانوں کی اناؤں کو اپنی ذات سے واصل کر لیا، چسپان کر لیا، تو اِس طرح خدا میں اضافہ ہو گیا اور جیسی جیسی رُوحیں اِس درجے پر فائز ہوتی چلی جائیں گی، تو خدا کے نور میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، کیا یہ تصور ہے؟ نہیں! اور پھر کیسا؟ اِس کے علاوہ اگر یہ خدا جو اُس خدا نے اِس کو بنایا الگ ہے تو پھر دو خدا ہو گئے، ایک وہ خدا جو ہمیشہ سے ہے، ایک

یہ خدا جو ذیلی ہے، جو ابھی ابھی بنا ہے، یہ تصور، نہیں اور پھر کیا؟ اِس کے لئے کیا کریں؟ یہ تو حدیثِ قدسی ہے، سب اِس کو تسلیم کرتے ہیں، ہم اِس کو کس طرح سمجھیں؟ بس سمجھنا یہ ہے کہ انسان کی حقیقت ازلی۔۔۔

ٹرانسکرائب: امین رحمانی ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیرالدین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ دھر

کیسٹ نمبر: Q-36-B   تاریخ: ۶/اپریل/۱۹۸۴ء کراچی

Click here for Audio

انسان کی حقیقت ازلی/ابدی طور پر مونوریالزم کے مقام پر یعنی خدا کے ساتھ ایک ہے، وہ حقیقت کبھی الگ نہیں ہوئی، جدا نہیں ہوئی، نہیں ہوسکتی ہے، ناممکن ہے۔ پھر اس کے معنی یہ ہوں گے، کہ خدا یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اے ابن آدم! تو میری اطاعت کر تاکہ میں وہ پردہ اُٹھاؤں جس سے تم کو وہ راز معلوم ہوجائے، کہ میرے ساتھ تیرا اور تیرے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے، ہم کس طرح ایک ہیں، کب سے ہیں، کیسے ہیں، یہ راز میں تجھ پر فاش کروں گا۔ اِس کے لئے شرط اطاعت، فرمانبرداری [ہے]، تو خداوندِ عالم ایک راز کو ظاہر کرنا چاہتا ہے، نہ کہ اِس بندے کو اُٹھا کر اپنی ذات سے چسپاں کرنا چاہتا ہے، ایسا نہیں، یہ بات ناممکن ہے، تو ہمیں سمجھنا چاہیئے اور علم کا سہارا لے کر ایسی اُونچی حقیقتوں کو جو انسان کی حقیقتیں ہیں، جن سے خدا اور اُس کے بندے کے درمیان رشتے کا پتہ چلتا ہے تو یہ جاننا چاہیئے۔ اِس سلسلے میں پیر ناصرِ خسرو ؒ کا ارشاد ہے وہ بھی میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں کہ:

زنورِ اُوتو ہستی ہمچو پَرتَو   حجاب از پیش بردار و تو اُوشَو

تُو خدا کے نور سے ایک (reflection) ہے لیکن درمیان میں لاعلمی کا پردہ ہے، علم کے ذریعے سے اِس لاعلمی کے پردے کو ہٹاؤ اور تو وہ ہوجا یعنی درمیان میں جو پردہ حائل ہے لاعلمی کا، جہالت کا، اور کہنا چاہیئے کسی جھجک کے بغیر نادانی کا، تو اِس پردے کو جب آپ ہٹائیں گے تو پتہ چلے گا کہ آپ کا رشتہ خدا کے ساتھ کیا ہے اور کس طرح آپ کی انائے علوی، آپ کی رُوح کا وہ سرا کس طرح نور کے سرچشمے سے وابستہ ہے، جس کی مثال ہم نے سورج سے دی تھی کہ سورج کی کرنوں کو دیکھیں، سورج کی روشنی کو دیکھیں کہ وہ روشنی دو طرح سے ہے، ایک روشنی مجتمع ہے، ایک روشنی منتشر ہے۔ مجتمع کا مطلب کہ سورج کے (source) میں جو کچھ روشنی ہے وہ مجتمع ہے اور بکھری ہوئی جو روشنی ہے اِس کا بھی اُس کے ساتھ لگاؤ ہے۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ بکھری ہوئی روشنی کا وہ سرا جو اُوپر کی طرف ہے وہ سورج میں ہے لیکن یہ تو مادّی چیز ہے، ایک مادّی چیز ایک رُوحانی چیز کی کُلی طور سے مثال پیش نہیں کرسکتی، ہماری بہت مدد کرتی ہے اور ہمیں بہت قریب لے جاتی ہے یہ تو صحیح ہے لیکن کُلی طور پر حقیقت کو پیش نہیں کرسکتی ہے۔ اِس لئے کہ یہ تو مادّی چیز ہے وہ رُوحانی حقیقت ہے اور اِس

لئے تاہم بہت سی چیزیں ہیں جو ہمیں مدد دیتی ہیں، کہ کس طرح درخت کا سایہ ہے کہ اُس کے دو سِرے ہیں، سائے کا ایک سرا درخت کے ساتھ لگا ہوا ہے، سائے کا دوسرا سِرا گھومتا ہے اور بڑھتا ہے اور گھٹتا ہے مگر جو سرا درخت کے ساتھ وابستہ ہے وہ وابستہ ہی ہے۔ گھڑی کی سوئی کو دیکھیں کہ مرکز پر اُس کا ایک سرا ہے اور دوسرا سِرا اڈائل میں گھومتا ہے، مگر جو سرا مرکز میں ہے، درمیان میں ہے وہ تو اپنی جگہ پر ہے، تو اِس لحاظ سے گھڑی کی سوئی کی دو باتیں بنتی ہیں یہ کہ سوئی گردش کرتی ہے اور نہیں کرتی ہے، مرکز پر ہے، اور اِسی طرح رُوح دنیا میں آتی ہے اور نہیں آتی ہے۔ رُوح دنیا میں آتی ہے اِس سِرے کے اعتبار سے ہے اور دنیا میں نہیں آتی ہے اُس سِرے کے اعتبار سے ہے، تو اُونچی حقیقتیں ایسی ہیں کہ آپ اُن کو ایک ہی بات میں محدود نہیں کر سکتے ہیں۔ اُن کے پہلو ہوتے ہیں تو اُن پہلوؤں کے متعلق ایک نفی کا پہلو ہے، ایک اثبات کا پہلو ہے یعنی ایک تو (negative) ہے اور ایک (positive) ہے۔ اِسی طرح انسان کی حقیقت ہمیشہ سے ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی حقیقت قدیم ہے، قدیم فلسفے میں اُس چیز کا نام ہے جس کے کبھی نہ ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ جیسے خدا کی ذات کے متعلق کہ خدا کب سے ہے؟ یہ سوال غلط ہے، کب تک ہوگا؟ یہ سوال بھی غلط ہے۔ ایسا سوال خدا کی ذات کے بارے میں نہیں اُٹھنا چاہیئے کیونکہ ''سے'' اور ''تک'' خدا کی ہستی یا خدا کے تصور کے لئے مناسب نہیں ہے، تو خدا ہمیشہ سے ہے لیکن یہ بھی کافی نہیں ہے، خدا کے لئے یہ کہنا کہ خدا قدیم ہے کافی نہیں ہے، اِس لئے کہ قدیم اور حادث فلسفے کی دو اصطلاحیں ہیں، حادث وہ چیز جو کبھی نہیں تھی اور ابھی وُجود میں آئی وہ حادث کہلاتی ہے۔ قدیم وہ چیز ہے جو ہمیشہ سے ہے اور جس کے نہ ہونے کا سوال ہی نہیں ہے، تو یہ دو صفتیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں، جس طرح تاریکی اور روشنی آمنے سامنے ہوتی ہے۔ اگر آپ خدا کو ایک ایسی صفت میں مانتے ہیں کہ اُس صفت کی ایک (opposite) بھی ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کے لئے کوئی ضد ہے، حالانکہ خدا کے لئے کوئی ضد نہیں ہے، اُس کا کوئی (oponent) نہیں ہے، تو آپ کس طرح خدا کو نور کہہ سکتے ہیں کیونکہ نور کا تقاضا یہ ہے کہ ظلمت ہو تو نور ہو اور ظلمت کو (remove) کریں/مٹائیں تو نور کی صفت بن جائے اور نور نمایاں ہو جائے۔

آپ خدا کو کس طرح عادل کہہ سکتے ہیں، ظالم ہو تو عادل ہوگا اور ظلم کو ہٹانے کا نام عدل ہے۔ لہٰذا یہ جو صفات ہیں یہ بہت نیچے ہیں، خدا ہر صفت سے بالا ہے، برتر ہے اور رُوح جو ہے وہ قدیم ہے اور وہ حادث ہے، رُوح جسم کے اعتبار سے حادث ہے اور اپنی ذات سے رُوح قدیم ہے۔ لہٰذا رُوح تھی: ''وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا'' (۱۷:۸۵) یہ اُن سوالات میں سے ہے جو یہودیوں نے سوچ سوچ کر بنایا تھا۔ یہودیوں کو یہ گمان تھا کہ آنحضرتؐ نے کچھ آسمانی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور کچھ درس و تدریس کی ہے اور اِسی بنا پر وہ بولتا ہے۔ لہٰذا اُنہوں نے آسمانی کتابوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسے سوال کو مرتّب کیا کہ اُس سوال کا ذکر آسمانی کتابوں

میں نہیں تھا، توراۃ میں اِس کا ذکر نہیں تھا، انجیل میں اِس کا ذکر نہیں تھا لہٰذا اُنہوں نے سوچ سوچ کہ اُن کے علماء نے رُوح کے متعلق سوال کو تیار کیا اور پوچھا کہ آپ بتائیں کہ رُوح کیا ہے؟ تو ابھی آپ کس طرح سوچتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو اِس بات کے ڈر سے کہ کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ محمدؐ نہیں جانتا ہے تو کیا رُوح کے سارے بھیدوں کو ظاہر کرنا چاہئے تھا؟ نہیں! اگر بات ایسی ہوتی تو سارا علم کفّار کی طرف جاتا جنہوں نے کلمہ بھی نہیں کہا، اُمت میں بھی داخل نہیں ہوئے تو پھر وہ زور اور زبردستی سے ڈرا کے دھمکا کے علم کو لینا چاہتے ہیں یہ بات نہیں تھی، خدا اور رسول کا ایک بہت منظّم قانون ہے، تو اُن کو اِس طرح سے جواب دیا گیا کہ ایک طرح سے جواب دیا گیا پھر بھی اُس کے علم کو پوشیدہ رکھا اور اِس پر اُن پر طنز یہ کیا کہ تم کو کیا معلوم، تمہارا کوئی (background) ہوتا تو میں رُوح کی بات بتاتا۔ ''وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا'' اِس میں اُن پر طنز ہے اور جاننے والوں کے لئے اِس میں جواب ہے اور نہ جاننے والوں کے لئے ایک طرح سے ایسا جواب ہے، کہ اُن کو مجبور کیا اور اُن پر طنز کیا کہ تمہارے پاس (background) ہی کیا ہے کہ تم کو رُوح کی بات بتائیں، ''يَسْاَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ''۔ آپ سے وہ پوچھتے ہیں کہ رُوح کیا ہے؟ رُوح کے بارے میں پوچھتے ہیں ''قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ'' کہئے کہ رُوح میرے پروردگار کے امر سے ہے۔ ''وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا'' اور تمہیں رُوح کی باتیں جاننے کے لئے کچھ علم ہونا چاہیئے تھا، تمہارے پاس یہ نہیں ہے تو کس طرح رُوح کے بھیدوں کو تم پر ظاہر کیا جائے۔ اِس میں جواب ہے کہ: ''قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ'' کہئے کہ رُوح میرے پروردگار کے امر سے ہے۔

اِس میں کئی معنی ہیں، ایک معنی تو یہ ہے کہ رُوح میرے پروردگار کے عالمِ امر سے ہے، اِس میں مکمل جواب ہے۔ ایک یہ کہ رُوح میرے پروردگار کے کلمۂ کُن سے ہے، اِس کا لگاؤ کُن کے ساتھ ہے، ابھی پتہ چلا کہ رُوح کیا ہے اور کہاں سے ہے۔ جو چیز کُن کے ساتھ وابستہ ہو اور جو چیز عالمِ امر میں ہو وہ کوئی نئی چیز نہیں ہو سکتی ہے اور اُس کے کبھی نہ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ مطالعہ کر سکتے ہیں کہ عالمِ امر کیا ہے، آپ جان سکتے ہیں کہ کلمۂ کُن کیا ہے، کیا وہ ایک نئی چیز ہے، کیا وہ حادث ہے؟ تو عالمِ امر، عالمِ خلق کے برعکس ہے، عالمِ خلق حادث ہے، عالمِ امر قدیم ہے، جب رُوح عالمِ امر سے ہے تو لازمی طور پر یہ قدیم ہے لیکن عالمِ امر کی کوئی چیز کس طرح ہوتی ہے، وہ تو غائب رہتی ہے۔ اُس کا ظہور صرف کُن کے ساتھ ہے، کُن فرمایا تو اُس کا ظہور ہوا، ہے تو اپنی جگہ پر، اپنی کیفیت میں، اپنی حالت میں موجود ہے مگر اُس کے ظہور کے لئے کُن فرمانا چاہیئے۔ جیسے ہی کُن فرمایا گیا تو اُس کا ایک ظہور ہوا، سامنے آئی اور اُس کا تعلق ہو گیا اِس عالمِ خلق کے ساتھ، تو یہاں پر ایک جسمانی ظہور ہو گیا اُس کا۔ نہیں تو اپنے طور سے رُوح عالمِ امر میں ہمیشہ سے موجود ہے، امری کیفیت میں ہے، خلقی کیفیت میں نہیں، تو پھر رُوح کے عالمِ امر سے ہونے سے اِس آیت کی روشنی میں پتہ چلا کہ رُوح ہمیشہ سے ہے، قدیم ہے، ایک لطیف چیز ہے اور اُسے ایک اعتبار سے نیستی کہا جاتا ہے کہ اُس میں مادّہ نہیں ہے، اُس میں کوئی رنگ نہیں ہے،

اُس میں کوئی کیفیت نہیں ہے اور وہ ایک بے مثال شئ ہے۔

لہٰذا رُوح عالمِ امر سے ہے، قدیم ہے اور آنے جانے کا جو ذکر بنتا ہے وہ اِس جسم کی وجہ سے بنتا ہے، تو کوئی بھی مسئلہ جب مسئلہ ہوتا ہے تو خدا کی صفات کی روشنی میں یا خدا کے تصور کی روشنی میں اُس مسئلے کا ہمیں جواب ملتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو یہ جواب بہت ہی پختہ جواب بن جاتا ہے۔ مثلاً انا کے لئے سوچیئے کہ جس چیز کو ''خود'' کہنا چاہیئے اور جس چیز کو ''میں'' کہنا چاہیئے وہ کیا چیز ہے؟ عقل ہے، نہیں! رُوح ہے، نہیں! جسم ہے، نہیں پھر کیا چیز ہے؟ ہمارے اندر ایک چیز ہے اُس کے ساتھ ہم اپنی تمام قوتوں کو منسوب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میری رُوح، کہتے ہیں میری عقل، کہتے ہیں میرا جسم، جب ہم کہتے ہیں میری کتاب تو یہ دو چیزیں ہیں ایک تو کتاب ہے، ایک وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ہم 'میری' کہتے ہیں۔ وہ انا ہے تو یہ رُوح انا نہیں ہے، ایک لحاظ سے عقل انا نہیں ہے، جسم انا نہیں ہے وہ (unity) ہے۔ ہمارے اندر جو وحدت ہے اِس وحدت نے تمام چیزوں کو اپنے آپ سے منسلک کرلیا ہے وہ بے مثال چیز ہے۔ ہمیں کہنا چاہیئے کہ وہ خدا کی طرح ہے اور وحدت، وحدت کے ساتھ ایک ہوجائے اِس میں ذرا بھی تاخیر نہیں ہوتی ہے، اِسی وحدت میں ہم خدا کے ساتھ ایک ہیں۔ خدا کے ساتھ کسی چیز میں ایک نہیں ہیں، صرف وحدت میں ایک ہیں اور یہ وحدت حقیقت میں وہاں ہے، اُس کا ایک تصور ہے، اُس کا ایک (shadow) ہے یہاں۔ پھر باری آتی ہے حکماء کے اِس قول کو پیش کرنے کی: ''لایُولدالوحدۃ اِلّا الوحدۃ''[کتاب میوۂ بہشت، صفحہ نمبر: ۱۷۴]۔ یہ حکماء کا ایک قول ہے اور اِس کو ہمارے بزرگانِ دین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ وحدت سوائے وحدت کے کسی اور چیز کو جنم نہیں دیتی ہے، وحدت سے کثرت پیدا ہو یہ ناممکن بات ہے۔ پیر ناصر خسرو قدس کہتے ہیں کہ:

مکن در صنع مصنوعات رہ گم ز جو جو روید و گندم ز گندم

مخلوقات، موجودات کی پہچان میں رستے کو نہیں بھولنا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جَو سے جَو اُگتا ہے اور گندم سے گندم۔ تو پھر کس طرح وحدت سے کثرت پیدا ہوگئی یعنی وحدت سے مراد خدا، کثرت سے مراد مخلوق، تو خدا جس کی ذات میں وحدانیت ہے، جس کا قانون واحد ہے، تو اُس سے یہ کیسے ہوا کہ وحدت سے اِس کثرت کا وجود بن گیا، یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اِس سوال کے لئے کوئی جواب نہیں ہے مگر یہ ہے کہ جب تک ہم اِس کو یہ نہیں مانیں کہ یہ وحدتِ کثرت نما ہے، یہ اندر اندر سے وحدت ہے اور باہر سے کثرت ہے، یہ اصطلاح ہے اِس کو (catch) کیجئے۔ وحدتِ کثرت نما، ہے تو وحدت لیکن نظر آتی ہے کثرت، تو اِن تمام انسانوں میں، انسانیت میں ایک وحدت ہے وہ اپنی جگہ پر ہے تو اِسی وحدت میں انسان خدا کے ساتھ ایک ہے۔ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے اپنے ایک ایسے قول، میں ایک ایسے ارشاد میں جو (International level) پر فرمایا گیا ہے یعنی ''آپ بیتی'' کی کتاب، وہ جماعتی فرامین میں سے نہیں ہے،

(International level) پر کہی ہوئی بات ہے۔ اُس میں فرمایا کہ ’’خدا کا تصور یہودیوں کی طرح یک الٰہیت کا نہیں ہے بلکہ یک حقیقت کا تصور ہے‘‘[اسلام میرے مورثوں کا مذہب، صفحہ:۱۵]۔ یہ اُس قول کا اُردو ترجمہ ہے اور ماشاءاللہ یہاں پر آپ حضرات انگریزی جاننے والے ہیں، آپ نے پڑھا ہوگا، (monotheism) نہیں ہے، مونو ریالزم ہے اور اب تک بہت سے لوگ اور ہم خود بھی عرصۂ دراز تک یہ مانتے رہے ہیں یعنی یک الٰہیت کو مانتے رہے ہیں، بہت سارے موجودات کو، بہت ساری حقیقتوں کو نظر انداز کر کے ایک ہستی کو خدا ماننا، اِس تصور کو امامؑ یہود سے منسوب کرتے ہیں، یہودیوں کو دیتے ہیں اور مسلمانوں کو جو دیتے ہیں یا جو تصور مسلمانوں کو اپنانا چاہیئے وہ ہے مونو ریالزم۔

اِس مونو ریالزم میں ہمارے سارے سوالات کا جواب ملتا ہے، یہ نہ ہو تو پھر بہت سارے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً آدمؑ سے متعلق، ابلیس سے متعلق، بہشت کے بارے میں، انسان کے دنیا میں آنے کے بارے میں بہت سے سوالات ایسے اُبھرتے ہیں کہ جن کا کوئی جواب نہیں ہے لیکن جب مونو ریالزم کا تصور اپناتے ہیں اور اُس کو سمجھتے ہیں تو کوئی سوال نہیں ہے، سارے سوالات ختم ہو جاتے ہیں، تو ’’کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ‘‘ اِس حدیث کا کیا خلاصہ ہونا چاہیئے؟ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں ایک گنجِ مخفی تھا، میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں یعنی میری شناخت ہو، مجھ کو پہچانا جائے، اِس کے لئے میں نے انسانوں کو پیدا کیا۔ لیکن پیدا کیا اِن سب انسانوں کو، یہ مرحلۂ اوّل ہے، پیدا کرنے کا دوسرا مرحلہ رُوحانی تخلیق ہے، رُوحانی تکمیل ہے یعنی میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خدا نے اگر انسانوں کو اُس کی پہچان کے لئے پیدا کیا ہے تو کیا یہ سب انسان خدا کو پہچانتے ہیں؟ آپ کہیں گے کہ نہیں۔ پھر تو یہ کیسے ہوا کہ خدا نے تو یہ فرمایا تھا کہ میں نے اپنی پہچان کے لئے لوگوں کو پیدا کیا۔ اِس کے لئے شاید آپ یہ کہیں گے نہیں پہچانا تو خدا کا منشاء ہی پورا نہیں ہوا، اصل بات یہ ہے کہ تخلیق جا کر کہاں مکمل ہو جاتی ہے، رُوحانیت میں، جیسے پیغمبروں کا، اماموں کا، پیروں کا تصور ہے تو اُن کو خدا نے پیدا کیا۔ اِس پیدائش سے مراد ایک مکمل تخلیق ہے، تو تب خدا کو پہچانا جاتا ہے، خدا کو جب پہچانا جاتا ہے تو اُس کے نتیجے میں اِس حدیث کے بموجب کیا انعام ملتا ہے؟ آپ بتائیں؟ کیا انعام ملتا ہے؟ اِس حدیث کے فلسفے کے مطابق، اِس حدیث کی حکمت کے بموجب خدا ملتا ہے۔ کس طرح ملتا ہے؟ ایک خزانے کی صورت میں ملتا ہے، ایک بڑے خزانے کی صورت [میں] ملتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں اور اِس بات کے دُہرانے میں مزہ آئے گا کہ خدا کے بہت سے نام ہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، خدا ماسٹر بھی ہے، مالک بھی ہے، بادشاہ بھی ہے، قہار بھی ہے، جبّار بھی ہے، دوست بھی ہے، ایک مہربان باپ کی طرح بھی ہے لیکن رحمت کی انتہا وہاں ہو جاتی ہے جب کہتا ہے کہ میں ایک خزانہ ہوں۔ خدا کا سب سے پیارا نام اور سب سے پُرحکمت نام جس میں بھرپور رحمت ہے انسان کے لئے وہ ہے کہ وہ ایک خزانے کی حیثیت میں ملتا ہے اور یہ ہے خزانے کی حیثیت میں ملنا کہ ہم اُس کو اِس طرح مانیں کہ

ہمارا اور اُس کا رشتہ وحدت ہے اور ہماری رُوح کا بالائی سرا ہمیشہ سے ہمیشہ سے خدا کی ذات میں ہے۔ یہ ہوا اُس خزانے کو حاصل کرنے کا ایک عمل یا ایک کوشش اور اگر ہم عملاً اِس مقام کو پائیں اور خود کو اِس قابل بنائیں تو واقعاً وہ ہمارے لئے ایک خزانے کی صورت میں ملے گا۔

اِن جیسی حدیثوں سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کا بندے سے کیا رشتہ ہے، ایک اور مثال میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ایک اور حدیث قدسی ہے، اُس کو حدیث نوافل کا نام دینا چاہیئے۔ خدا فرماتا ہے کہ جب بندۂ مومن مزید عبادت سے آرام نہیں لیتا ہے اور شب و روز عبادت کرتا ہے، بندگی کرتا ہے، فرض کی عبادت کے علاوہ عبادت کرتا چلا جاتا ہے، تو میں اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ مجھ سے دیکھتا ہے، میں اُس کے کان بن جاتا ہوں وہ مجھ سے سُنتا ہے، میں اُس کی زبان بن جاتا ہوں وہ مجھ سے بولتا ہے، میں اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں وہ مجھ سے پکڑتا ہے، میں اُس کے پاؤں بن جاتا ہوں وہ مجھ سے چلتا ہے۔ اِس میں ذرا سوچیئے، ذرا سوچیئے کہ بندۂ مومن کا خدا سے کیا رشتہ ہونا چاہیئے، تو یہ ہے انسان کی حقیقت کے بارے میں چند باتیں جو میرے نزدیک بڑی اہم باتیں ہیں۔ اِن پر غور کرنا چاہیئے اور اگر اِس سلسلے میں کوئی سوال بھی ہو تو سوال کو بھی درمیان میں لائیں، کوئی عیب نہیں ہے، کوشش کریں گے اُس کے لئے کوئی مناسب جواب مہیّا کرنے کے لئے، اور میرے خیال میں یہ چند باتیں کافی ہیں اور سورۂ دھر کے آغاز میں جو انسان کے بارے میں ارشاد ہوا ہے اُسی سے بات شروع ہوئی اور اِس جیسے اور بھی ارشادات ہیں جن کی روشنی میں انسان اپنی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ جیسے مولا علیؑ کا ارشاد ہے کہ: ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ''۔ اِس میں بھی گہری حکمتیں ہیں اور اُن حکمتوں کی طرف جانا اِس طرح سے ہے، کہ انسان اپنی رُوح کی شناخت کے نتیجے میں کس طرح خدا کو پہچان سکتا ہے، حالانکہ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ انسان مخلوق ہے اور انسان کی رُوح کو خدا نے بنایا ہے۔ ایک کرسی کو دیکھتے ہوئے کارپینٹر کی شناخت کس طرح ہو سکتی ہے، تو کچھ لوگوں کا یہ سوال ہے اور یہ سوال اُس وقت صحیح ہوتا جب کہ رُوح میں کوئی بزرگی، کوئی عظمت، کوئی حکمت نہیں ہوتی اور رُوح کا وہ سرا خدا کے نور میں ہمیشہ کے لئے موجود نہ ہوتا، تو لوگوں کا یہ سوال جائز تھا اور یہ منطق بھی صحیح تھی کہ اُستاد کو دیکھتے ہوئے اُس کی بنائی ہوئی مصنوع، مثلاً ایک کارپینٹر ایک کرسی کو بناتا ہے، کرسی کو دیکھتے دیکھتے کس طرح کارپینٹر کی قابلیت، اُس کی صلاحیت و ہنر یا شکل و شباہت اور خاندان ہر لحاظ سے اُس کی شناخت کس طرح ہو سکتی ہے، تو یہ منطق اُن کی صحیح ہوتی لیکن یہ مثال نہیں ہے۔

رُوح جو ہے وہ بہت بڑی چیز ہے رُوح کو رُوح کے سلسلے پر اور رُوح کی سیڑھی چڑھتے چڑھتے اِس کے آخری سرے پر خدا کا درجہ آتا ہے اور اِس بام پر، اِس چھت پر یعنی عرش اعلیٰ پر خدا کا مرتبہ ہے اور جہاں پر انسان کی حقیقت بھی ہے۔ اِس لئے مولا علیؑ نے ارشاد فرمایا کہ جو اپنے آپ کو پہچانے وہ بے شک اپنے معبود کو پہچان سکتا ہے۔ لیکن یہاں پر

ایک سوال یہ بھی ہے کہ خدا کے بہت سارے نام ہیں اُن ناموں میں سے یہاں جو لگایا وہ ربّ ہے،''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ'' یہاں پر ربّ کے نام کو، ربّ کے اسم کو کیوں لایا گیا؟ آخر وجہ ہے کوئی، اللہ کیوں نہیں کہا؟ خالق کیوں نہیں کہا اور رازق کیوں نہیں کہا؟ ربّ کا اسم اِس لئے یہاں لایا گیا کہ رُبوبیت یعنی پرورش لگی ہوئی ہے انسان کی ذات میں۔ اِس کو دیکھتے دیکھتے اِن نہروں پر چلتے چلتے ندّی اور پہاڑ اور سرچشمہ مل جاتا ہے یعنی رُبوبیت کی جو نورانی لہریں آتی ہیں، جو (waves) آتی ہیں جو نہریں آتی ہیں اِن کو دیکھتے دیکھتے نشانِ راہ مل جاتا ہے اور سرچشمہ ملتا ہے اور ربّ میں بہت معنی ہیں۔ ربّ میں ہماری تمام ضرورتوں کا ذکر ہے، عقلی ضرورتیں، علمی ضرورتیں، رُوحانی ضرورتیں اور جسمانی ضرورتیں بعد میں ہیں ادنیٰ ہیں، کمتر ہیں یعنی ہم رُوحانی، علمی اور عقلی طور پر خدا تک (approach) کر سکتے ہیں اپنی ذات کے اندر، اپنی ذات کے اندر بہت کچھ نہیں ہوتا، تو یہ نہیں فرمایا جاتا۔ اگر انسان کی ذات ایک کتاب نہ ہوتی اور بولنے والی کتاب نہ ہوتی، اِس میں روشنی نہ ہوتی، اِس میں قرآن نہ ہوتا، اِس میں نور نہ ہوتا، اِس میں بھید نہ ہوتے، اِس میں ازل نہ ہوتا، ابد نہ ہوتا، عرش نہ ہوتا، کرسی نہ ہوتی، قلم نہ ہوتا، لوح نہ ہوتی اور خدا کے بہت سارے بھید اِس میں نہ ہوتے تو پھر شناخت کیسے؟ تو مولا علیؑ نے جو کچھ فرمایا وہیں سے تصوف کی بنیاد پڑی۔

اِس جیسے ارشادات سے مولا علیؑ نے جو رسولؐ کے برحق وصی تھے، جانشین تھے، شریعت کے بعد سب سے پہلے مولا علیؑ نے تصوف کا آغاز کیا۔ شریعت کے بعد ایک دم سے حقیقت، یہ ممکن نہیں ہے، شریعت کے بعد طریقت کا آغاز کیا، جو آج اہلِ طریقت یعنی صوفیائے کرام اِس کو مانتے ہیں کہ اُن کا مرشد، اوّلین مرشد مولا علیؑ ہیں، لہٰذا یہ تصوف کی بنیاد پر ہے، لوگوں کو توجہ دلائی اپنی ذات کی طرف۔ ایک طرف سے وہاں سے تاویلات کا آغاز ہوا کہ وہ موّل تھے تاویل کرنے والے، دوسری طرف سے تصوف کا آغاز ہوا اور تیسری طرف سے حقیقت کا آغاز ہوا، تو مولا علیؑ نے ایسے مکتب قائم کئے، وہ سلمان کو جو کچھ کہتے تھے وہ اندرونی طور پر کہتے تھے اور دوسروں کو جو کچھ کہتے تھے وہ ظاہری طور پر کہتے تھے، تو اُنہوں نے درس کا آغاز کیا مگر تصوف سے پھر حقیقت، پھر معرفت وہاں سے اِن چیزوں کا آغاز ہوا۔ تاریخی طور پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اصحابِ صفہ اِس بات کا ثبوت ہیں کہ وہاں پر آنحضرتؐ اور مولا علیؑ تصوف کا درس دیتے تھے اور جس زمانے میں عالمِ اسلام کے اندر صوفیائے کرام اُبھرے وہ تاریخی ثبوت ہے کہ وہ زمانہ طریقت تھا اور جس زمانے میں مولا نے قیامت کے بھید کو ظاہر کیا اور کہا کہ قیامت ایک رُوحانی ترقّی کا نام ہے، فرمایا کہ قیامت رُوحانی طور پر ہے، اور فرمایا کہ دنیا قدیم ہے، اِس سے امامؑ کی مراد کائنات ہو سکتی ہے یا خدا کی بادشاہی ہو سکتی ہے۔ ایسے بھیدوں کا جب آغاز کیا تو وہ دَورِ حقیقت کا آغاز تھا، تو یہی چار منزلیں ہیں اسلام میں شریعت کے بعد طریقت، طریقت کے بعد حقیقت، اور اُس کے بعد معرفت، اور لوگ پھیلے ہوئے ہیں اِن مراحل میں۔ شریعت میں بہت زیادہ ہیں، طریقت میں اُس سے کم ہیں، حقیقت میں اُس سے بھی کم ہیں،

معرفت میں اُس سے بھی بہت کم ہیں، تو یہ ایک دوڑ ہے جو سب اہلِ اسلام کو (starting point) پر کھڑا کیا گیا ہے، اور اُن کو کہا گیا کہ (go)۔ اب لازمی بات ہے کہ جو آگے بڑھنے والے ہیں وہ بہت کم ہوں گے، یہ فطرت ہے اور اِس کے علاوہ آپ دیکھتے ہیں اِس کائنات کے اندر جو اصل چیز ہے وہ بہت کم ہے۔ خدا کے مقرّب فرشتے بہت تھوڑے ہیں، بڑے فرشتے زیادہ ہیں، انبیاءؑ لوگوں سے بہت کم ہیں، اولیاءؑ پیغمبروں سے زیادہ ہیں، مومنین اُن سے زیادہ ہیں، مسلمان اُن سے زیادہ ہیں، کسی بھی دین کے ماننے والے جو لوگ ہیں وہ اُن سے زیادہ ہیں، اور جو کفّار ہیں اُن سے بھی زیادہ ہیں۔ تو جمادات بہت زیادہ ہیں، نباتات اُن سے کم ہیں، حیوانات اُن سے کم ہیں، انسان اُن سے کم ہیں اور صحیح معنوں میں جو انسان ہیں وہ اُن سے بھی کم ہیں یہ بات ہے، تو یہ چند باتیں ہیں جو جاننا چاہئیں ور اِسی طرح میرے خیال میں وقت کے لحاظ سے اِس گفتگو کو ختم کرنا چاہیئے، اور ہاں! بے شک اگر کسی صاحب کا کوئی سوال ہو تو کوشش کی جائے گی۔ شکریہ، یا علی مدد۔

سوال: [سر! دنیا میں بہت سے لوگوں نے اپنی حقیقت کو پہچان لیا، مگر عطّار، شمس اور منصور نے خدائی کا دعوی کیا، اِس میں کوئی مصلحت تھی؟]

جواب: اِنہوں نے جو سوال کیا آپ حضرات نے سن لیا، بڑا مفید اور عمدہ سوال ہے اور یہ علم کو گھیر سکتا ہے، دلچسپ بھی ہے یہ کہ کچھ حضرات نے اپنی انا کی شناخت کر لی اور اپنی بلندی کو عملاً پایا اور اِس کے نتیجے میں اُنہوں نے خدائی کا اعلان کیا۔ اِس اعلان میں ذاتی اعلان کی بات ہے اور اِسی کے سائیڈ میں یہ بھی ہے کہ کچھ دوسرے لوگوں نے خود کو خدا نہیں کہا بلکہ بعض مرشدوں کو خدا مانا، جیسے مولائے رُوم ایک اعتبار سے شمس کو کہتے ہیں "شمسِ من و خدائے من" وغیرہ، تو مطلب ایک ہی ہے، کہ کچھ کامل انسانوں نے اپنی خدائی کا اعلان کر دیا۔ اِس کے برعکس قیاس یہ ہے اور صحیح قیاس ہے کہ دوسرے بہت سے حضرات نے بھی اِس حقیقت کو پالیا لیکن اُنہوں نے اِس دعویٰ کے برعکس خاموشی اختیار کی، تو یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے خلاف ہیں حالانکہ دونوں قسم کے حضرات ایک جیسے ہیں، مرتبے کے لحاظ سے، بلندی کے لحاظ سے، رسائی کے لحاظ سے، معرفت کے لحاظ سے، لیکن یہ دو گروہ کیوں ہوئے یہ سوال ہے۔

میرے نزدیک اِن دو گروہ ہونے میں انسانوں کے لئے واضح مثال ہے، اور اِس میں انسانوں کے لئے فائدہ ہے کہ اگر جنہوں نے خاموشی اختیار کی وہ بھی اُن کے ساتھ مل کر ببانگِ دُھل اعلان کرتے تو اِس میں انسانوں کا فائدہ محدود ہوتا اور وہ جنہوں نے ببانگِ دُھل اعلان کیا وہ بھی اِن خاموشیوں کی طرح خاموش ہو جاتے، تو اُس صورت میں بھی انسانوں کا فائدہ محدود ہوتا، لہٰذا (example) کے طور پر دونوں امکانیتیں اور دونوں سائیڈ، دونوں مثالیں واضح ہو گئیں تا کہ انسان دونوں سے نتیجے کو اخذ کرے، وہ اِس طرح کہ جنہوں نے دعویٰ کیا اُس کے مطابق یہ باور کرے اور جنہوں نے خاموشی اختیار کی اِن کے مطابق یہ خاموشی اختیار کرے تو اِسی میں سارے فائدے انسان کے لئے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ

بہت عمدہ سوال تھا اور اِس میں بہت عمدہ جواب پوشیدہ ہے، وہ یہ کہ آج بہت سے مومن ہیں جو اِن دونوں چیزوں کو سمجھتے ہیں اور گو کہ منصور کی بات کو تو مانتے ہیں اور مثال بھی دیتے ہیں لیکن منصور کی طرح دعویٰ نہیں کرتے ہیں بلکہ اُن بزرگانِ دین کی طرح خاموشی اختیار کرتے ہیں اور اُن کو داد دیتے ہیں جنہوں نے خاموشی اختیار کی اور اُن کو بھی داد دیتے ہیں جنہوں نے قربانی پیش کی، تو (example) جو ہوتی ہے اپنے دونوں پہلوؤں کو رکھتی ہے اور اِس میں انسانوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کیوں آئے؟ ایک پیغمبر کیوں نہیں آیا؟ ایک پیغمبر آتا اور زمانہ آدم سے لے کر آنحضرتؐ کے زمانے تک وہی ایک پیغمبر زندہ رہتا، تو اِس میں ہدایت محدود ہوتی انسان بہت سی نصیحتوں کے لئے، بہت سی مثالوں کے لئے محتاج ہیں اور بہت سی مثالیں الگ الگ اور جدا جدا شخصیتوں کے ذریعے سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا بہت سارے پیغمبر ہوئے اور اِسی طرح امامؑ بھی بہت آئے تاکہ اُس میں صبر کی مثال، شہادت کی مثال، قناعت کی مثال، تقیہ کی مثال، جہاد کی مثال اور مختلف قسم کی ایسی مثالیں پیش کی جاسکیں۔ حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ دونوں کی مثال لیجئے، حالانکہ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک امامؑ نے جہاد کو اختیار کیا اور دوسرے امامؑ نے خاموشی اختیار کی اگر ہم کہیں کہ حضرت حسنؑ کمزور تھے، تو یہ کفر کے مترادف ہوگا اور اہلِ بیت کی محبّت سے ہم کو جو کچھ ملنا چاہیئے اُس میں ہمارا خسارہ ہوگا۔ کیونکہ یہ بھی خدائی مصلحت کے بموجب تھی کہ اُنہوں نے خاموشی اختیار کی اور جنگ سے گریز کیا اور حضرت حسینؑ نے ایک پہلو کو پیش کیا اور حضرت حسنؑ نے ایک پہلو کو پیش کیا، دونوں پہلو ہمارے سامنے ہیں لیکن ہم وقت کو دیکھیں گے کہ کیا کرنا چاہیئے، دونوں جائز ہیں ہم وقت کے مطابق مصلحت کے مطابق دونوں مثالوں میں سے ایک کو اپنائیں گے یا یہ کہ حضرت حسنؑ کی طرح تقیہ اختیار کریں گے اور مصلحتاً سازگاری پیدا کریں گے اور خاموشی اختیار کریں گے یا یہ کہ حضرت حسینؑ کی طرح علمِ جہاد کو بلند کریں گے، یہ تو وقت بتائے گا اور زمانہ بتائے گا اور مصلحت کو دیکھیں گے وغیرہ۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کچھ حضرات نے اپنے خدا ہونے کا اعلان کیا اور دوسرے حضرات نے اِس راز کو ظاہر نہیں کیا اور خاموشی اختیار کی، دونوں برابر ہیں اور دونوں کا پلّہ برابر ہے تاکہ اِس سے ہمارے لئے ہدایت ہو، مثال ہو اور ہم کبھی تو رازداری سے کام لیں اور کبھی اپنے آپ میں اِس قسم کی گفتگو کو کریں۔ مثلاً آج ہم نے یہ جو باتیں کیں تو بہت ممکن ہے کہ ہم کسی بڑے اجتماع میں یا کسی معاشرے میں یا کسی سوسائٹی میں یہ بات نہیں کرسکیں گے، لیکن دونوں سے ہم نے فائدہ اُٹھانا ہے۔ اگر ایک ہی راستہ اختیار کریں تو ہم محدود ہو جائیں گے اور اِن بھیدوں سے ہم محروم ہو جائیں گے اور ہمیشہ یہ بات کرتے چلے جائیں تو پھر بھی ہمارے لئے نقصان ہے، دونوں کے درمیان درمیان توازن کو برقرار رکھنا ہے، اِس لئے وہ دو قسم کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ اِن کے بہت اچھے سوال کے لئے یہی مناسب جواب تھا۔

ٹرانسکرائب: امین رحمانی ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: قرآن میں ولایتِ امامؑ کا ذکر

کیسٹ نمبر: Q-37　　　تاریخ: ۱۴رجون ر ۱۹۸۴ء کراچی

Click here for Audio

عزیزانِ من! یا علی مدد۔

آج آپ کو اِس حقیقت کے بارے میں بتائیں گے، کہ کس طرح قرآنِ حکیم کی تمام تر حکمتوں کا رُخ ولایتِ علیؑ کی طرف ہے یعنی کس طرح یہ ثبوت ملتا ہے، کہ علیؑ کی ولایت برحق ہے۔ چونکہ حدیثِ شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: "اَلْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِيٍّ وَ عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ" قرآنِ مقدّس علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ قرآن کے ساتھ ہے۔ اِس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آیاتِ کریمہ کی حکمتوں میں علیؑ کے جانشینِ رسولؐ ہونے اور برحق امام ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ اِس کے مختلف طریقے ہیں اور اُن میں سے ایک طریقہ یہ ہے، کہ انبیائے کرامؑ کے جتنے قصے ہیں، اُنکی حکمت کا رُخ امامؑ کی طرف ہے، اور یہ بہت اہم بات ہے جو میں نے کہا کہ انبیائے قرآن کے قصوں کی حکمتوں کا رُخ مولا علیؑ کی طرف ہے، یہ بہت اہم بات ہے اور بڑی کلیدی بات ہے۔ اِس کی ایک مثال حضرتِ نوح علیہ السلام سے پیش کرتے ہیں، کہ حضرت نوح علیہ السلام کا جیسا قصہ ہے وہ آپ نے سُنا ہے۔ اِس قصے کا مرکز کشتیٔ نوح ہے، اور کشتیٔ نوح کی تاویل بموجبِ حدیث، اہلِ بیتِ رسول ہیں یعنی امامِ زمانؑ۔ اِس کے یہ معنی ہوئے، کہ نوحؑ کے زمانے میں ایک نہیں دو طوفان ہوئے تھے۔ ایک ظاہری طوفان تھا، جس سے بچاؤ کے لئے کشتی، لکڑی کی تھی، دوسرا رُوحانی طوفان تھا، جس سے نجات کا وسیلہ امامِ عالی مقامؑ ہی تھے اور یہ مطلب اِسی حدیث میں ہے جو ارشاد ہوا ہے کہ: "مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ فِيْكُمْ كَمَثَلِ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا هَلَكَ" میرے اہل بیت کی مثال کشتیٔ نوح کی طرح ہے، جو اُس میں سوار ہوا اُس کو نجات ملی اور جس نے اُس سے مخالفت کی وہ ڈوب گیا۔ قانونِ دین ہمیشہ سے ایک جیسا ہوتا ہے ایسا نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اِس طرف دین کا یہ قانون اور نظام ہے، یہ بات نہیں ہے، بلکہ یہ قانون روزِ اوّل سے ہے، اِس لئے کہ خداوندِ عالم کا ارشاد ہے، کہ اُس کی سنّت میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے (۳۳:۶۲) یعنی قانونِ خدا ہمیشہ ایک جیسا رہتا ہے، اِس سے ظاہر ہوا کہ نوح علیہ السلام کے ساتھ امام تھے، نوح علیہ السلام کے ساتھ امام تھے اور اِس سے آگے نہیں تھے یہ بات نہیں ہے، امام تو ہمیشہ سے موجود ہوتے ہیں اور اگر آدم علیہ السلام کے بارے میں سوال کرنا ہے، تو اُس کے لئے بھی جواب عرض کرتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے درمیان جس بات سے جھگڑا ہوا تھا وہ امرِ امامت تھا یعنی آدم علیہ السلام نے اپنے فرزند مولانا ہابیلؑ لئے امامت کی وصیت کی، اِس پر

قابیل ناراض ہوا اور اُس نے اپنے بھائی سے دشمنی شروع کی، اور جس کے نتیجے میں قابیل نے مولانا ہابیلؑ کو شہید کر دیا قصہ ذرا لمبا ہے، ہم اِس کو مختصر طور سے پیش کرتے ہیں یہ کہ جب اِسی طرح قابیل نے مولانا ہابیل کو جب شہید کیا تو پھر حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے دوسرے فرزند مولانا شیث علیہ السلام کو اپنا وصی اور جانشین بنایا، تو اِس سے ظاہر ہے کہ زمانہ آدم میں بھی امامت تھی، امام تھا، بلکہ امامت اِس سے پہلے بھی تھی، اور اِس کے لئے جو اسماعیلی مذہب کی عظیم کتابیں ہیں ،بنیادی کتابیں جو (source- books) ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے اور قرآن سے اِس پر روشنی پڑتی ہے، تو آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کی بات ہوئی۔

اب مختصراً آگے بڑھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں امامت کس طرح سے تھی۔ آپ کو آج کے (lesson) کا آغاز کس طرح ہوا یاد ہوگا، ہم نے کہا ہے، کہ تمام پیغمبروں کے جو قصے ہیں، اُن کی حکمتوں کا رُخ امامؑ کی طرف ہے، یہ ہمارا موضوع ہے، تو اِس سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں آتے ہیں کہ اِس قصے کی حکمتوں کا رُخ کس طرح امامؑ کی طرف ہے۔ خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے کہ اُس نے ابراہیمؑ کو چند کلمات میں آزمایا اور جب اُن کلمات کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکمل کیا تو خدا نے اعلان فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا امام بناتا ہوں، اِس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی کہ یا خداوند! یہ منصب میری ذرّیت میں بھی رہنا چاہیئے، تو خداوند نے اشارہ فرمایا کہ ہاں! یہ منصب تمہاری نسل میں برقرار رہے گا مگر جو عادل ہیں اُن میں رہے گا اور جو ظالم ہیں اُن کو یہ نہیں ملے گا (۲:۱۲۴)۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ امامت جہاں ہوگی وہاں عدل ہوگا، انصاف ہوگا اور جو اِس کے برخلاف اپنی طرف سے دعویٰ کریں گے، اُن کو یہ امامت نہیں ملا کرے گی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاملے میں امامت کا اعلان ہوتا ہے اور لفظِ امام کا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اطلاق ہوتا ہے۔

اِس میں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ آیا حضرت ابراہیم علیہ السلام پیغمبر تھے یا امام؟ تو جواب یوں عرض ہے کہ نبوت اور امامت بہت سی مثالوں میں یکجا بھی ہو جاتی ہے، جیسے آدمؑ میں، نوحؑ میں اور حضرت ابراہیمؑ میں۔ کیونکہ نبوت اور امامت کا ایک ہی مقصد ہے اور ایک ہی نور ہے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد امامت کی دو شاخیں بیک وقت چلنے لگیں اور اِس سلسلے میں بعض ہمارے بھائیوں کو جن کو تاریخ سے خوب واقفیت نہیں ہے اور (source books) جنہوں نے نہیں پڑھی ہو تو اُن کو اِس سے تعجب ہوتا ہے، کہ بیک وقت امامت کی دو (branches) کیسے؟ آپ بزرگانِ دین کی کتابوں کو پڑھ سکتے ہیں، جیسے قاضی نعمان بہت مشہور سیدنا ہوئے ہیں، بہت بڑے عالمِ دین اور قاضی ہوئے ہیں، جنہوں نے امامت کی تین شخصیتوں میں علمِ دین کا کام کیا اور مولا کے در کی خدمت کی اور اُن کی بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو فرزند ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام یہ دونوں فرزند حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ امامِ مستقر اور امامِ مستودع قرار پائے۔ امامِ مستقر وہ ہوتا ہے جو خود امام ہوتا ہے اور اُس کی نسل سے بھی ائمہ ہوتے ہیں، امامِ

مستودع وہ ہوتا ہے جو خود امام ہوتا ہے، اور اُس کی نسل سے چند امام ہوتے ہیں یا نہیں بھی ہوتے ہیں، صرف ایک امام ہوتا ہے یا چند امام ہوتے ہیں۔ پھر وہ امامت لوٹ کر امامِ مستقر میں آجاتی ہے، یہ بات ہے۔ اِس میں بہت بڑی حکمت ہے، اِس کی گہرائی میں، اِس کی تہہ میں عظیم حکمتیں پوشیدہ ہیں یعنی یہ سوال الگ ہونا چاہیئے کبھی کہ کیوں امامِ مستقر کے ہوتے ہوئے ایک امامِ مستودع کا بھی ہونا ضروری ہوتا ہے؟ یہ سوال الگ ہونا چاہیئے، تو ہماری اصل گفتگو یہ ہے کہ کس طرح پیغمبروں ؑ کے واقعات کی حکمتیں لوٹ کر امامؑ کی طرف آتی ہیں۔ جب آپ قرآن کو اُٹھا کر دیکھیں گے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کو پڑھیں گے تو اُس میں جگہ جگہ امامؑ ہی کا ذکر آتا ہے یعنی زبانِ حکمت میں امامؑ ہی کا ذکر ملتا ہے۔ جیسے ارشاد ہے کہ: ''فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرَاهِيْمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنَاهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا'' (۴:۵۴) ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب دی اور حکمت دی اور عظیم بادشاہی دی۔ کتاب سے نبوت مراد ہے، حکمت سے امامت مراد ہے اور ملکِ عظیم رُوحانی سلطنت ہے اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں امامت کا ذکر ملتا ہے۔

اِس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ آتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ آتا ہے تو اُس میں برملا یعنی ظاہراً امامت کا ذکر ملتا ہے یعنی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ جو حضرت ہارونؑ تھے وہ امام تھے۔ اب آپ سوچیں کہ خدا کی عادت جہاں بدلتی نہیں ہے، وہاں بیک وقت دو کامل انسان کیوں مقرر ہوئے؟ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اور اِن واقعات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے خدا فرماتا ہے، آنحضرتؐ کے زمانے میں کہ میری سنّت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے (۳۳:۶۲)۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانے میں بھی نبوت کے ساتھ ساتھ امامت بھی موجود تھی یعنی پیغمبرؐ کے ساتھ ساتھ امامؑ بھی تھے۔ اِس کے علاوہ عالم شیعیت میں ایک حدیث مشہور ہے اور اُس حدیث کا ایک الگ ٹائٹل ہے اور وہ ہے حدیثِ مماثلتِ ہارونی۔ وہ حدیث جس میں مولا علیؑ کی تمثیل مولانا ہارونؑ سے دی گئی ہے اور وہ حدیث یہ ہے: ''يَا عَلِيُّ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى''۔ اے علیؑ! آپ مجھ سے اُس مرتبت پر ہیں جس مرتبت پر ہارونؑ موسیٰ سے تھے، منزلت، مرتبت کو کہتے ہیں ''يَا عَلِيُّ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى''۔ یا علیؑ! میرے ساتھ آپ کا وہ مرتبہ ہے، جیسے موسیٰ کے ساتھ ہارون کا تھا۔ اِس پر ہمیں قرآن کھول کر دیکھنا چاہیئے کہ موسیٰؑ سے ہارونؑ کا کیا رشتہ تھا، رُوحانیت کے معنوں میں یا مذہبی طور پر، جسمانی طور پر بھی اور ہر لحاظ سے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ہارونؑ موسیٰؑ کے برادر تھے اور حضرت موسیٰؑ کے وزیر تھے، نیز وصی تھے، نیز جو کتاب موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی، اُس کی رُوحانیت سے، اُس کی رُوح سے، اُس کے نزول سے، اُس کی حکمتوں سے، اُس کی ہر چیز سے حضرت ہارونؑ باخبر تھے، تو یہی ہے کہ امامؑ اور پیغمبروں کے واقعات کے درمیان پُل باندھے ہوئے ہیں۔

حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت صلوات اللہ علیہم کے تمام

واقعات اور امامؑ کی ذات کے درمیان پُل باندھے ہوئے ہیں، اور ساری حکمتیں لوٹ کر امامؑ کی طرف آجاتی ہیں اور کسی خاص پیغمبر سے متعلق نہیں بلکہ تمام انبیاءؑ کے جیسے تذکرے ہیں قرآن میں، اُن تمام تذکروں کی حکمتوں کو امامؑ کی امامت کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ جیسے اِس ارشادِ نبوی سے ظاہر ہے کہ: یا علی! آپ کو مجھ سے وہی دینی رشتہ ہے جو موسیٰ سے ہارون کو حاصل تھا یا کہ آپ کو مجھ سے وہ درجہ حاصل ہے جو موسیٰ سے ہارون کو حاصل تھا۔ اب اِس ریفرینس کے بعد ہمیں قرآن سے رُجوع کر کے یہ دیکھنا چاہیئے، ایک ایک کر کے تمام باتوں کو دیکھنا چاہیئے کہ ہارونؑ موسیٰؑ کے زمانے میں کیا کیا کام کیا کرتے تھے تا کہ اُس کی روشنی میں ہم امامؑ کو پہچانیں، کیونکہ امامؑ کے بارے میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ صرف اور صرف حکمت کی زبان میں ہے، تنزیل کی زبان میں نہیں ہے۔ تنزیل کی زبان میں جو کچھ ہے وہ بہت قلیل ہے اور حکمت کی زبان میں امامؑ کے بارے میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ بہت کچھ ہے۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں امامت کا تذکرہ نہیں، یہ تاویل کی بات ہے، حکمت کی بات ہے۔ میں نے کبھی اپنے عزیزوں سے کہا تھا کہ قرآن کی دو زبانیں ہیں، ایک زبان اِس کی عربی ہے اور دوسری زبان حکمت ہے اور جو خوش نصیب حضرات قرآن کی حکمت کی زبان کو جانتے ہیں وہ بہت کچھ جانتے ہیں، اور اُن کے پاس بہت کچھ علمی اور عرفانی دولت ہو سکتی ہے۔

اب حضرت ہارون علیہ السلام کی مثال میں امام کا جو تذکرہ ملتا ہے، اُس کے لئے قرآن میں تقریباً بیس مقامات ہیں یعنی قرآن میں بیس دفعہ حضرت ہارون علیہ السلام کا نام لیا گیا ہے۔ اب ہمیں اُن آیتوں میں دیکھنا ہوگا کہ ہارونؑ کے بارے میں کیا ارشاد ہوا ہے، ہر آیت کے ماحول کو دیکھنا ہوگا، ہر آیت میں یہ دیکھنا ہوگا اور اُس سے اگلی آیت کو دیکھنا ہوگا اور اُس کے بعد کی آیت میں دیکھنا ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک آیت میں یہ ارشاد ہے، کہ جب موسیٰؑ کارِ نبوت پر مامور ہو جاتے ہیں کارِ رسالت پر مامور ہو جاتے ہیں یعنی جب اُن کو پیغمبر بنایا جاتا ہے، تو اُس وقت وہ خداوندِ عالمین کے حضور سے درخواست کرتے ہیں کہ اِس امرِ عظیم میں اُن کے بھائی کو بھی اُن کے ساتھ شریک کر دیا جائے تا کہ دین کا کام اُستوار ہو جائے۔ یعنی اِس مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنے وزیر بنانے کی درخواست کی تو خداوندِ عالم نے اِس درخواست کو قبول کر لیا۔ اب یہ بات قابلِ غور ہے کہ کس طرح ایک رسول اور نبی کا کوئی وزیر ہوتا ہے اور اِس وزیر کے کیا معنی ہیں۔ لفظی اور تاویلی دونوں اعتبار سے اِس کا کیا مطلب ہے۔ سب سے پہلے وزیر ایک عربی لفظ ہے اور اِس کی (root) یعنی مادہ وِزر ہے، جو بوجھ کو کہتے ہیں اور وزیر بروزنِ فعیل اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو امورِ سلطنت میں بادشاہ کا ہاتھ بٹاتا ہے، بادشاہ کا بوجھ بٹاتا ہے، گویا نظامِ سلطنت کا سارا بوجھ وہی اُٹھاتا ہے اور بادشاہ کو ایک طرح سے بہت بڑی حد تک مدد دیتا ہے، تو ہارونؑ موسیٰؑ کے وزیر تھے۔ صحیح روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی قصے کے طور پر کہ ہارونؑ موسیٰؑ کے وزیر تھے، تو اِسی مقام پر اور اِسی وقت آنحضرتؐ نے بھی خداوندِ عالم سے درخواست کی، یا خداوندِ عالمین جس طرح میرے بھائی

موسیٰ نے اپنے لئے ایک وزیر کی درخواست کی تھی میں بھی اِس مقام پر درخواست کرتا ہوں کہ میرا بھائی علی میرا وزیر ہو، تو خداوندِ عالم نے منظور فرمایا اور مولا علیؑ آنحضرتؐ کے وزیر مقرر ہوئے۔ ویسے بھی قرآن کی اُس آیت میں جو خدا ارشاد فرماتا ہے کہ میری سنّت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے (۳۳:۶۲) تو اِس میں یہ ذکر بھی ہے اور یہ فرمانا بھی مقصود ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پیغمبرؑ کے ساتھ ساتھ وزیر کی حیثیت سے ایک امامؑ تھا تو اِسی طرح آنحضرتؐ کے زمانے میں رسولِ اکرمؐ کے ساتھ ساتھ ایک امامؑ ہے، یہ اِس آیت کا معنوی اعلان ہے، جب خدا فرماتا ہے کہ میری عادت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے۔ خدا کی عادت میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے، تو کسی ایک بات کی بات نہیں ہے، کسی ایک چیز کا ذکر نہیں ہے، یہ تمام بنیادی امور کا ذکر ہے، تمام اُصولی باتوں کا ذکر ہے۔ نبوت اور رسالت دین میں سب سے بڑی چیز ہے، تو جب خدا کہتا ہے کہ اُس کی عادت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے، تو اِس کا اشارہ سب سے پہلے نبوت کی طرف ہے کہ نبوت جس طرح موسیٰؑ کے زمانے میں تھی، اِس طرح اب بھی ہے اور موسیٰؑ کے زمانے میں اِس طرح سے تھی کہ نبی اور رسول کے ساتھ ساتھ ایک امام بھی تھے۔

اب اِس آیت سے یہ حدیث مضبوط ہو جاتی ہے، جس میں مولا علیؑ کے ہارونؑ کی طرح ہونے کا ذکر ہے اور اِس حدیث سے، اُس آیت کی وضاحت ہو جاتی ہے کیونکہ کسی حدیث کے صحیح اور مستند ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ حدیث کسی آیت کو بیان کرے، کسی آیت کی وضاحت کرے، کسی آیت کی ترجمانی کرے اور کسی حدیث کے موضوع یعنی بناوٹی ہونے کی یہ نشانی ہے کہ اُس کے مطابق کوئی آیت نہ ملے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری حدیثیں، میرے اقوال آیات کی ترجمانی کرتے ہیں، تو ویسے بھی ظاہر ہے قرآن میں کہ زمانۂ موسیٰ میں ہارونؑ بھی تھے، اگرچہ ہارونؑ رسالت اور نبوت کے عنوان سے ہیں، ظاہراً حضرت ہارونؑ کے ساتھ لفظِ امام نہیں ہے لیکن حکمت میں لفظِ امام ہے اور دانشمند جانتے ہیں، کہ جب وہ دورِ نبوت کا تھا تو کوئی بھی امام نبوت کے عنوان سے کام کر سکتا ہے، جب نبوت کا دور ختم ہو گیا تو امام، امامت کے عنوان سے کام کرتا ہے، نبوت اور رسالت کے عنوان سے نہیں۔ ہم آپ کو بہت سارے اماموں کے نام بتا سکتے ہیں جو آنحضرتؐ سے قبل تھے جو امام ہونے کے علاوہ نبی بھی تھے، رسول بھی تھے۔ جیسے داودؑ، آپ تو اب تک داودؑ کو نبوت کے عنوان سے جانتے ہیں، اور سلیمانؑ جس کو سب لوگ نبی مانتے ہیں، یعقوبؑ، یوسفؑ اور بھی بہت سارے پیغمبر [ہیں] کیونکہ امامت کسی قدر پوشیدہ تھی، نبوت ظاہر تھی۔ جیسے ایک حدیث سے یہ بات عیان ہو جاتی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''یَا عَلِیُّ کُنْتَ مَعَ الْاَنْبِیَاءِ سِرًّا وَ مَعِیَ جَھْرًا''۔ اے علی! آپ تمام پیغمبروں کے ساتھ پوشیدہ پوشیدہ چلتے آئے تھے اور میرے ساتھ آپ ظاہر ہیں، تو پوشیدہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کبھی تو وصی کے عنوان سے کام کیا، کبھی وزیر کے عنوان سے کام کیا، کبھی نبی اور رسول کے ٹائٹل سے کام کیا یہ پوشیدگی ہوئی، اور حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے جو لفظِ امام آیا

ہے وہ اِس طرح سے آیا ہے کہ اُس صورت میں حضرت ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کی کتاب قرار دیا گیا ہے۔ ''وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا''(۱۲:۴۶) اور اِس رسول سے پیشتر موسیٰ کی کتاب امام تھی، تو کیا یہی تورات جو آج ہے امامت کرتی تھی، نہیں! تو امام ہی کو کتاب کہا گیا ہے کیونکہ امام کا ایک نام کتاب ہے اور اِس لئے کہ جہاں پر، جس مقامِ رُوحانیت پر آسمانی کتاب ہوتی ہے اور جس مقامِ رُوحانیت پر امامؑ کا نور ہوتا ہے وہ دونوں چیزیں ایک ہوتی ہیں یعنی آسمانی کتاب کا نور اور امامؑ کا نور۔ چونکہ رُوحانیت ایک ایسی چیز ہے کہ وہاں پر (unity) ہے، جب یہ باور کیا جاتا ہے کہ مقامِ رُوحانیت پر تمام رُوحیں بھی ایک ہوتی ہیں، تو اُس میں امامؑ کے نور کے اور آسمانی کتاب کے ایک ہونے میں کیا تعجب ہوسکتا ہے، کوئی تعجب نہیں۔ اِس لئے مقامِ رُوحانیت پر کتاب کو امام اور امام کو کتاب کہنے میں کوئی تعجب نہیں ہے۔ اِس مثال میں حضرت ہارون علیہ السلام کو امام کہا گیا ہے، کتاب کہا گیا ہے اور پھر امام کہا گیا ہے یا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب امام تھی یہ ہارون علیہ السلام کے لئے ہے۔

آج کی ہماری گفتگو اِس سلسلے میں ہے کہ ہم تمام پیغمبروں کے واقعات کو دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کس طرح امام سے ملے ہوئے ہیں اور ہر قصے میں کس طرح امام کا تاویلی تذکرہ ملتا ہے اور یہ بتایا گیا کہ قرآنِ مقدّس میں بیس (۲۰) جگہوں میں حضرت ہارون علیہ السلام کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ بیس (۲۰) جگہیں ایسی ہیں کہ اِس اُصول کے تحت اِن میں نورِ امامت کا ذکر ملتا ہے۔ ہمارے بزرگانِ دین نے امام کو ہارونِ زمان کہا، زمانے کا ہارون اِس (sense) میں، اِس معنیٰ میں آپ سوچیں! اچھی طرح سے سوچیں، کہ اِس کا کیا مطلب، یوں کہنے کا کیا مطلب؟ ہارونِ زمان کہنے کا مطلب اور بے شک ہارونِ زمان کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہارونؑ کے بارے میں ذکر فرمایا گیا ہے اُس میں اِسی زمانے کے امام کا ذکر ہے۔ یہی نہیں آپ کہہ سکتے ہیں کہ زمانے کا سلیمان یعنی سلیمانِ زمان، اِس لئے کہ سلیمان کا جو تذکرہ ہے قرآن میں وہ امامؑ کا تذکرہ ہے کیونکہ سلیمانؑ امامِ مستودع تھے، تو قرآنِ مقدّس میں جتنے کامل انسانوں کا ذکر ہے یعنی حضراتِ انبیاء کا جس طرح سے ذکر فرمایا گیا ہے اُن تمام تذکروں میں نورِ امامت کا ذکر ہے۔ قرآن کی حکمتوں کا امام سے تعلق ہونے اور اُن کو پانے کے بہت سے اُصولات ہیں، اُن میں سے صرف ایک اُصول کا آج ذکر ہو رہا ہے اور وہ یہ [ہے] کہ آدمؑ کے زمانے میں نوحؑ کے زمانے میں، ابراہیمؑ کے زمانے میں، موسیٰ کے زمانے میں، عیسیٰؑ کے زمانے میں اور آنحضرتؐ کے زمانے میں جس طرح امامت موجود تھی اور ہر نبی اور ہر رسول کے زمانے میں امامت موجود تھی اور پوشیدگی سے کام کرتی تھی اور ہر عظیم پیغمبر کے قصے کے (link) کو امامؑ سے ملایا گیا ہے۔ آج یہی موضوع چل رہا ہے اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں ہے جس کے قصے میں امامؑ کا ذکر نہ ہو۔ جیسے ایک ارشاد میں مولا علیؑ نے فرمایا کہ قرآن چار چوتھائیوں میں نازل ہوا ہے، اُس میں ایک چوتھائی ایسی ہے کہ اُس میں براہِ راست تذکرہ ہے، امامؑ کی تعریف و توصیف ہے، دوسری چوتھائی میں امامؑ کے

دشمنوں کا ذکر ہے تو یہ بھی بالواسطہ (indirect) یہ حصہ بھی مولا علیؑ سے متعلق ہو جاتا ہے، تیسری چوتھائی میں مثالیں ہیں، اُن مثالوں میں بھی امامت کا ذکر ہے [نَزَلَ الْقُرْاٰنُ اَرْبَعَۃَ اَرْبَاعٍ فَرُبُعٌ فِیْنَا وَرُبُعٌ فِیْ عَدُوِّنَا وَرُبُعٌ سِیَرٌ وَاَمْثَالٌ وَرُبُعٌ فَرَائِضُ وَاَحْکَامُ شَرِیْعَۃٍ وَلَنَا کَرَائِمُ الْقُرْاٰنِ]۔ جیسے خدا کی رسّی ایک مثال ہے جو امامؑ کے لئے ہے (۳:۱۰۳)، جیسے ایک ایسا درخت کہ وہ ہمیشہ صدابہار رہتا ہے اور وہ ہر موسم میں پھل دیتا ہے (۱۴:۲۴۔۲۵)، یہ بھی امامؑ کے لئے ہے اور اِس قسم کی بہت ساری مثالیں اور آخری چوتھائی اوامر و نواہی پر مشتمل ہے کہ اُس میں احکام ہیں دین کے، تو یہ بھی صاحبِ امر سے متعلق ہو جاتی ہے کیونکہ صاحبِ امر امامؑ ہیں کہ خدا اور رسولؐ کے اوامر، صاحبِ امر کے توسط سے مومنین تک پہنچتے ہیں۔ ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' (۴:۵۹) اِس میں ذرا غور کیجئے اِس میں بہت ساری حکمتیں ہیں، اُن حکمتوں میں سے ایک حکمت میں بیان کرنا چاہتا ہوں، اے اہلِ ایمان! خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو جو ہر زمانے میں تمہارے درمیان رہتے ہیں۔ اِس حکم میں خداوندِ عالم نے تمام زمانوں کے مومنین کو سامنے رکھا ہے اور فرمایا ہے کہ اے مختلف زمانے کے مومنوں! امام تمہارے درمیان ہوگا اور تم اپنے وقت کے امام کی اطاعت کرو اور خدا کی اطاعت بھی رسولؐ کے توسط سے ہے اور رسولؐ کی اطاعت امامؑ کے توسط سے ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے زمانۂ نبوت میں خدا کا کوئی حکم کسی گھر میں نازل نہیں ہوتا تھا، رسولؐ کے ہاں نازل ہوتا تھا تو خدا کا حکم رسولؐ کے توسط سے مانا جاتا تھا، یہ بات ہے یا نہیں ہے؟

سب سے پہلے ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ'' (۴:۵۹) اِس کا تجزیہ کریں گے، اے ایمان والوں! خدا کی اطاعت کرو۔ اب خدا کی اطاعت کس طرح سے کی جائے؟ خدا کی کوئی اطاعت ہے کسی پیغمبر کے بغیر؟ یہ کلیہ ایسا ہے کہ دین کا سارا قانون اِس میں سمٹا ہوا ہے۔ خدا کی اطاعت کرو مگر رسولؐ کے توسط سے، سب سے پہلے یہ بات بنتی ہے یا نہیں بنتی ہے؟ اُس کے بعد ''وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ''۔ رسولؐ کی اطاعت کرو۔ کس کے ذریعے سے؟ خدا کے ذریعے سے نہیں! خدا کی تو اپنی اطاعت رسولؐ کے بغیر پوری نہیں ہوتی ہے، تو کیا یہ صحیح ہے ہم کہیں گے کہ رسولؐ کی اطاعت رسولؐ کے توسط سے کرو، نہیں! اگرچہ بظاہر زمانۂ نبوت کے اعتبار سے یہ بات صحیح ہوتی ہے لیکن بعد کے زمانے میں یہ بات صحیح نہیں ہوتی ہے۔ جب بعد کے زمانے میں یہ بات صحیح نہیں ہوتی ہے تو اِس منطق سے زمانۂ نبوت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ گویا اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمانۂ نبوت میں بھی صحیح طریقہ یہی تھا کہ امامؑ کے توسط سے رسولؐ کی اطاعت کی جائے اور ایسا ہوا اور اِس کے بہت سے ثبوت ملتے ہیں۔ اگرچہ لوگ اِس کو فوری طور پر قبول نہیں کریں گے اور یہ کہنے لگیں کہ رسولؐ کے زمانے میں رسولؐ لوگوں کے سامنے تھے، رسولؐ خود حکم فرماتے تھے لوگ مانتے تھے اور کسی تیسری شخصیت کی کوئی

ضرورت نہیں تھی ۔لیکن آپ کو اِس میں بہت سی مثالیں ایسی ملیں گی کہ لوگوں کو غلطی ہوئی براہِ راست اطاعت کرنے کے اِس (concept)) کی وجہ سے اور جن لوگوں نے رسولؐ کے وصی کو دیکھا اُنہوں نے رسولؐ کی صحیح اطاعت کی، تو میرے پاس اِس کا کوئی ثبوت ہونا چاہیئے یا کوئی کتاب کا ریفرینس آپ کو دینا چاہیئے، میں ایک ریفرینس بھی دیتا ہوں اور (logically)) بھی آپ کو اِس کا پروف کرتا ہوں ۔

زمانۂ نبوت میں کچھ مومنین تھے جن کو علم تھا کہ علیؑ نبیؐ کے گیٹ ہیں ۔مکّہ میں رسولؐ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے تھے، مدینہ میں آئے تو ہاتھ کو چھوڑا اور مولا علیؑ نے رسولؐ کو دیکھتے ، ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھی اور جو خاص مومنین ہیں وہ علیؑ کی طرف دیکھتے تھے، اُنہوں نے بھی ایسا کیا اور بہت دور کے لوگ تھے یا اُس مقام کے لوگ تھے اُنہوں نے اِس بات کو نہیں سمجھا، ایک بار اِس کی اشاعت ہوئی تھی کہ ہاتھ باندھنا ہے اِس پر کوئی ایسا (circullar) ایسی کوئی چیز نہیں ہوئی، چونکہ رسولؐ نے بہت سی چیزیں اِس طرح سے نہیں کیں کہ وہ کہیں کہ اب یہ حکم آیا ہے اور یہ ۔رسولؐ کو علیؑ دیکھتے تھے جو وصی تھے، اساس تھے اور امام تھے اور مومنین علیؑ کو دیکھتے تھے، آپ اِس نکتۂ نظر سے وجہ دین کو دیکھیں تو آپ کو اِس قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی ،ٹھیک !اور علیؑ اِس لئے تھے کہ مومنین کی رہنمائی کریں اور رسولؐ کی صحیح صحیح اطاعت کرائیں ۔کیونکہ آپ دیکھتے ہیں کہ خدا کی اطاعت توسط کے بغیر، وسیلے کے بغیر انجام نہیں پاتی ہے، تو پھر رسولؐ کی اطاعت بھی اِس طرح سے ہونی چاہیئے اور اِس وقت ہمیں یا کسی بھی ہوشمند کو کوئی اُلجھن نہیں ہے لیکن میں زمانۂ نبوت کی بات کرتا ہوں کہ زمانۂ نبوت میں بھی اگرچہ رسولؐ سب کے سامنے احکام کو صادر فرماتے تھے لیکن ہر حکم کی حکمت اور اُس کی تاویل کو سمجھانا علیؑ کا کام تھا، یہ نورِ امامت کی روشنی ہے اور رسولؐ نے تقریباً ۲۳ برس تک رسالت اور نبوت کے فریضے کو انجام دیا اور سب لوگ رسولؐ کے سامنے نہیں تھے ۔بعد میں جو مسلمان دنیا میں آئے اور جتنے لوگوں نے دینِ اسلام کو قبول کیا یا خاندانی طور پر اسلام میں پیدا ہوئے وہ تو بہت زیادہ ہیں، اب اِن سب لوگوں کے سامنے رسولؐ نہیں ہیں اور اِس کے لئے امامؑ کا دنیا میں موجود ہونا ضروری تھا۔اِس پر شاید یہ سوال بھی پیدا ہو کہ پھر امامؑ نے کیوں اِس طرح سے اعلان نہیں کیا اور اُن سارے لوگوں کی ذمہ داری کیوں قبول نہیں کی جو اِس کو نہیں سمجھتے ہیں ۔اِس کے لئے جواب یہ ہے کہ جس طرح کہ رسولؐ کی ذمہ داری ہدایت سے متعلق، رہنمائی سے متعلق صرف اُن لوگوں کے لئے مناسب تھی جو رسولؐ کو قبول کریں یعنی جو دائرۂ اسلام میں آچکے ہوں، اُن کی رہنمائی آپ پر واجب تھی اور جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں، اُن کی ذمہ داری آپؐ پر عائد نہیں ہوتی تھی، آپ قرآن کو دیکھیں تو پتہ چلے گا۔اِسی طرح جب آنحضرتؐ نے امامت کا اعلان فرمایا اور اپنی جانشینی کا اعلان کیا مختلف مواقع پر تو اِس اعلان کے مطابق جن مومنین نے امامؑ کے لئے اقرار کیا، اُن لوگوں کی رہنمائی امامؑ پر واجب ہوتی ہے اور امامؑ کے لئے کوئی کلمہ نہیں ہے کہ جس طرح پیغمبر نے کلمے کو پیش کیا اور امامؑ کا کوئی الگ کلمہ نہیں ہوتا ہے، امامؑ کے لئے صرف

اقرار ہوتا ہے، اقرا کرنا ہوتا ہے، اِسی اقرار کے ساتھ جب کوئی اقرار کرتا ہے یا جولوگ اقرار کرتے ہیں اُن کی ہدایت کی ذمہ داری امامؑ پر عائد ہوجاتی ہے اور باقیوں کی نہیں۔

اِسی طرح آیۂ اطاعت کی وضاحت ہورہی تھی کہ: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' (۵۹:۴) دیکھیں کہ خداوندِ عالم نے اپنی ذات کے ہوتے ہوئے اور رسولؐ کے ہوتے ہوئے امر کا مالک امام کو بنایا اور امر اُس کو تفویض کیا۔ کیونکہ خدا کا امر بھی اور رسولؐ کا امر بھی آتا ہے امامؑ کے پاس، اور امامؑ کے توسط سے خدا کا امر انجام پاتا ہے اُس پر عمل ہوتا ہے اور رسولؐ کے احکام بھی امام کے توسط سے انجام پاتے ہیں۔ لہٰذا اِس میں بہت بڑی حکمت ہے کہ جہاں تین درجوں کا ذکر ہے، درجۂ خداوندی، درجۂ نبوت اور درجۂ امامت تو اِس میں امامؑ ہی کو صاحبِ امر قرار دیا جاتا ہے، یہ بہت بڑی بات ہے، بہت بڑی بات ہے۔ گو کہ اطاعت کے لئے جو حکم دیا جاتا ہے اُس کا آغاز خدا سے ہوتا ہے پھر رسولؐ سے اور آخر میں امام کا ذکر آتا ہے اور آخر میں امام کا ذکر آنا بھی بہت ہی عجیب ہے کہ یہاں سے اطاعت اُوپر کو جاتی ہے اور اطاعت کا جو حکم ہے وہ اُوپر سے نیچے کو آتا ہے اور تفصیلی اطاعت، تفصیلی اطاعت امامؑ کے لئے ہے۔ دیکھیں کہ جب خدا فرماتا ہے کہ خدا کی اطاعت کرو، اگر اِس اطاعت میں سب احکام ہیں اور احکام کی تفصیل بھی ہے، تو پھر رسولؐ کی اطاعت کی کیا ضرورت، خدا کے احکام میں تفصیل نہیں ہے جتنی تفصیل رسولؐ کے احکام میں ہے اور اگر رسولؐ کے احکام میں تفصیل مکمل ہوجاتی تو پھر صاحبِ امر کی اطاعت کرنے کی کیا ضرورت، ظاہر ہے کہ رسولؐ ایک ایسے زمانے میں تھے کہ اُس وقت زمانے نے ترقّی نہیں کی تھی اور لوگوں نے ترقّی نہیں کی تھی اور ایسے حالات اور واقعات سامنے نہیں آئے تھے۔ لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ رسولؐ کے زمانے میں سارے احکام صادر ہوجائیں اور ساری باتیں بتادی جائیں اور ساری ضروری ہدایت لوگوں کے سامنے ہو۔ ابھی زمانہ آنے والا تھا اور اپنے ساتھ بہت سارے انقلابات کو لے کر آنے والا تھا۔ لہٰذا آخری اطاعت امامؑ کے لئے چھوڑی گئی کیونکہ امامؑ ہر زمانے میں موجود ہے، لیکن یہ ایک ہی اطاعت ہے مگر درجات ہیں، تصورات ہیں، تو یہ ہے کہ امامت اسلام میں ایک بنیادی تصور ہے۔ کیونکہ اِس لفظ کے مترادفات ہیں یعنی ہم معنی الفاظ ہیں۔

اِس امامت کا دوسرا ہم معنی لفظ خلافت ہے جو قرآن کا سب سے پہلا قصہ ہے اور سب سے پہلا تصور ہے، اور جس طرح آدمؑ سے انسانیت کا آغاز ہوتا ہے اِسی طرح آدمؑ کے تذکرے میں خلافت کا موضوع آتا ہے، اور اُس میں امامت کے معنی ہیں کیونکہ امامت اور خلافت دراصل ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ خلافت ہر گروہ کے نزدیک الگ معنی رکھتا ہے۔ لفظِ خلافت صحیح قرآن کے نزدیک جو اِس کے معنی ہیں وہ وہی معنی ہیں جو امامت کے ہیں ''اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً'' (۳۰:۲)، ارض کا کیا مطلب؟ زمین، زمین سے مراد کیا؟ زمین سے مراد لوگ، اِس سے خالی زمین

مراد نہیں ہے، دشت و بیابان مراد نہیں ہیں اور زمین سے وہ لوگ مراد ہیں جو رہتی دنیا تک پائے جائیں اوّل تا آخر جتنے لوگ اِس سیارۂ زمین پر بسنے والے ہیں اور ہوں گے اُن میں یہ خلافت ہونے والی تھی، اُن میں ایک خلافت اور جانشینی کی بات تھی: ''اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً '' (۲:۳۰) اِس سے ایک سلسلہ مراد ہے جو سلسلۂ نبوت اور سلسلۂ امامت مراد ہے۔ میں نے نبوت کو بھی ایک سلسلے کے طور پر پیش کیا اور بے شک نبوت بھی ایک سلسلہ ہے اور نبوت اور امامت باہم مل کر ایک سلسلہ ہے، جس کو نورِ خدا کہا جاتا ہے۔ خدا کے نور دو نہیں ہیں، جس نور کی دائمیت کا ذکر ملتا ہے قرآن میں وہ نور نبوت اور امامت کی شکل میں ہے، جو انسانیت کے شروع سے آخر تک یہ نور دنیا میں ہے، اِس نور سے ایک سلسلہ مراد ہے اور وہی سلسلہ، سلسلۂ خلافت ہے اور سلسلۂ امامت ہے۔ اِسی کے متعلق خدا نے اعلان فرمایا تھا کہ: 'اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً '' (۲:۳۰) اور فرشتوں نے اِس پر جس طرح سے اعتراض کیا اُس اعتراض کی (logic) کو بھی دیکھئے :''قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ '' (۲:۳۰) دیکھیں کہ اِس میں فرشتوں کی زبان سے کیا کہا جا رہا ہے۔ فرشتوں کی زبان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اے خدا! کیا ایسی مخلوق کو خلیفہ بنائیں گے کہ یہ اوّل تا آخر فساد مچائے گا، اِس میں دنیا میں ہونے والے تمام فسادات اِسی خلیفے سے منسوب ہیں۔ چونکہ یہ خدا کی طرف سے ذمہ دار ہیں، چونکہ یہ خدا کے جانشین ہیں اور اِسی کی سلطنت و خلافت اور امامت کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے، تو فرشتوں نے یہ سارے فسادات کا جو قیامت تک ہو رہے ہیں اِن کا ذکر کیا تو اِس سے بھی پتہ چلا کہ یہ ایک سلسلہ ہے۔ خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ فسادات آدمؑ کی خلافت میں یا امامت میں نہیں ہوں گے، اِس کا خدا نے اِس طرح سے جواب نہیں دیا۔ خدا نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں! ہاں! ٹھیک ہے، فسادات بھی ہوں گے، خون ریزی بھی ہوتی رہے گی لیکن میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے ہو۔ اِس میں خدا نے دنیا میں جو جنگیں ہوتی ہیں، جو فسادات ہوتے ہیں، جو خون ریزیاں ہوتی رہتی ہیں اُن کی نفی نہیں کی، کہا کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ٹھیک ہے لیکن اِس کی حکمت کو میں جانتا ہوں۔ اِس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خلیفۂ خدا کی وجہ سے ہو رہا ہے، خلیفۂ خدا کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے، لوگ ہی کر رہے ہیں لیکن فرشتوں کی اِس گفتگو سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ یہ ایک سلسلہ ہے اور وہ خلافت چلتی جا رہی ہے۔ خلافت چلی جا رہی ہے اور دنیا میں وہ خلافت جس کا خدا نے کبھی اعلان فرمایا تھا، آدمؑ کی شخصیت کے لئے مخصوص نہیں تھی، خدا کا یہ مقصد نہیں تھا کہ بس زمانۂ آدم ہی میں خلافت ہوگی، خدا اِس طرح سے کوئی پروگرام نہیں بناتا ہے، خدا کا مقصد یہ نہیں ہوتا ہے، تو یہ چند باتیں تھیں اور اِس سلسلے میں آپ عزیزوں کے سامنے کوئی سوال ہو تو بے شک ہم اُس پر گفتگو کریں گے اور اُس کے جواب کے لئے کوشش بھی کریں گے۔

یہ میں نے ایک خاکہ، فکر انگیز خاکہ پیش کیا اور اِس سے آپ انقلابی طور پر سوچ سکتے ہیں، اور قرآن میں آپ دیکھ سکتے ہیں، مطالعہ کر سکتے ہیں، پوچھ سکتے ہیں اور قرآن کی حکمت تمام تر اسماعیلی مذہب کے مفاد میں ہے اور اِس میں امام

کی تعریف ہے اور امام کی امامت کے ثبوت میں ہے جو کچھ بھی قرآن میں ہے۔ ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے ہیں یہ بات الگ ہے لیکن قرآن از خود امامؑ کے ساتھ ہے یعنی اِس میں امامت کا اثبات ہے اور امامت کا ثبوت ہے، یہ چند باتیں تھیں، اب ہم وقت کے پیشِ نظر اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ آپ عزیزوں میں سے کسی کا کوئی سوال ہو تو اُس کو (discuss) کریں گے۔

سوال: (سر! آپ نے جو فرمایا کہ امامت کا یہ سلسلہ زمانۂ آدم سے چلا آرہا ہے اور یہ بات قرآن اور ہمارے لٹریچر سے مسلمہ حقیقت ہے، تو سر! ایسا کیوں ہے کہ کُلی طور پر جب ہم ایک تقسیم کرتے ہیں تو ہم زمانۂ نبوت اور زمانۂ امامت کہتے ہیں اور زمانۂ نبوت ہم آنحضرتؐ تک مراد لیتے ہیں اور اِس کے بعد ہم زمانۂ امامت کہتے ہیں حالانکہ نبوت کے اِس دور میں بھی امام تھے، اور اِسی سے متعلقہ ایک سوال کہ عام طور پر زمانۂ نبوت سے تنزیل مراد لی جاتی ہے اور زمانۂ امامت سے تاویل وابستہ ہے۔ اگر اُس زمانے میں بھی امام تھے یا کئی پیغمبر بذاتِ خود امام تھے تو اِس ضمن میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ اُن کے زمانے میں بھی جزوی طور پر تاویل کی تعلیم تھی یا زمانۂ نبوت کُلی طور پر صرف تنزیل نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر اُس سے مراد لی جاتی ہے)؟

جواب: اِنہوں نے جیسے سوال کیا وہ سُن لیا آپ نے کہ دورِ نبوت اور دورِ امامت سے متعلق اِنہوں نے سوال اُٹھایا اور اِس میں فرمایا کہ عام طور سے یہ مانا جاتا ہے، کہ ایک دورِ نبوت ہے جو آنحضرتؐ تک پایا جاتا ہے اور آپؐ کی ذاتِ اقدس پر نبوت و رسالت ختم ہو جاتی ہے لیکن امامت شروع سے تھی اور اب بھی ہے۔ پھر اُنہوں نے کہا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ دورِ نبوت کا تعلق تنزیل سے ہو اور دورِ امامت کا تعلق تاویل سے ہو۔ اِس کے لئے جواب یہ ہے کہ ہاں! خدا کے ایک عظیم پروگرام کے مطابق ایک دورِ نبوت ہے اور پھر اُس کے بعد دورِ امامت ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ (on the whole) ایک تنزیل کا دور ہے اور اِسی طرح ایک تاویل کا دور ہے۔ لیکن اِس کے باوجود جزوی طور پر جب پیغمبرؐ کے ساتھ امامؑ بھی موجود تھے اور امام کا کام تاویل بتانا ہے، تو ہر پیغمبر کے دور میں تنزیل کے بعد تاویل ہوتی رہی، یہ دو بڑے ادوار کی تقسیم میں ذیلی بات ہوئی یعنی جزوی طور پر یا یوں کہنا چاہیئے کہ تنزیل کے دور میں جزوی طور پر تاویل بھی ہوا کرتی تھی کیونکہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اُن لوگوں کو جو ایک مختصر زندگی پا کر مرنے والے تھے اُن کو ایک بہت بڑے دور کے لئے منتظر رکھا جائے، یہ بات صحیح نہیں تھی۔ اِس لئے انصاف اِسی میں تھا کہ اُس تنزیل کے بڑے دور میں بھی ذیلی طور پر ایک تاویل کا دور ہو اور ایسا ہوتا رہا اور اُصول بھی یہی ہے، کہ کتاب نازل ہوتی ہے، تو سب سے پہلے اُس کی تنزیل سے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہیئے اور پھر اُس کے بعد اُس بڑے پیغمبر کا کوئی وصی، کوئی جانشین، امام یا پیغمبر کے نام سے کوئی ہونا چاہیئے تاکہ تنزیل کے بعد لوگوں کو تاویل سے آگاہ کرے اگرچہ بہت تھوڑے لوگ کیوں نہ ہوں، یہ ہوتا رہا، تو جس طرح آج ہم

کہتے ہیں کہ تنزیل کا دور نہیں ہے، تاویل کا دور یہ (on the whole) بات ہے، بحیثیتِ مجموعی بات ہے، لیکن تنزیل بھی ہے کہ بہت سے لوگ تنزیل کو مانتے ہیں اور وہ تنزیل سے آگے نہیں ہیں۔ اگرچہ خود از خود، دور تاویل کا ہے لیکن بہت سے لوگ تنزیل کو مانتے ہیں اور اُن کو تنزیل پر قائم رہنا چاہیئے، جب تاویل نہیں ملتی ہے تو پھر کم سے کم تنزیل پر بھی تو قائم رہنا چاہیئے، ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ تنزیل سے بھی ہاتھ اُٹھائیں۔ جس طرح اسلام میں شریعت ہے، طریقت ہے، حقیقت ہے اور معرفت ہے جو لوگ شریعت سے آگے نہیں بڑھتے ہیں، تو اُن کو اُسی پر قائم رہنا چاہیئے، اُن کی بہتری، اُن کی صلاح اور اُن کی بہبودی وفلاح اِسی میں ہے کہ وہ شریعت پر عمل پیرا ہو جائیں۔

ایک بات مجھے یاد آئی، شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت ہم نے اپنے ڈائیگرامز میں اِس کی بہت اچھی طرح سے وضاحت کی ہے، شریعت کے بعد طریقت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پھر کُلی طور پر شریعت سے دستبردار ہو جائیں، یہ بات نہیں ہے، کچھ باتیں ایسی ہیں جن میں گنجائش ہے کہ اُن پر عمل طریقت کے طور سے ہو اور جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں تصوف کو مانتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں، کہ صوفی ہونے کے باوجود کلی طور پر شریعت پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اچھا! کُلی پر شریعت پر عمل پیرا ہونا ہے تو پھر طریقت کے لئے کہاں جگہ ہے؟ اِس کائنات کا اُصول یہ ہے کہ جب تک جگہ خالی نہیں ہوتی ہے تو دوسری چیز نہیں آسکتی ہے، جب جگہ پُر ہے اور کوئی جگہ خالی نہیں ہے پھر دوسری چیز کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مثلاً اگر شریعت بھرپور شریعت ہے اور اُس میں سے کسی بھی چیز میں ترمیم کی، تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو پھر طریقت کہاں سے آئے گی۔ مثلاً قبلہ اپنی جگہ پر ہے، نماز اپنی جگہ پر ہے، روزہ اپنی جگہ پر ہے اور ہونا چاہیئے لیکن اُس میں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ طریقت کی کوئی چیز ہو، مثلاً قبلۂ ظاہر کو مانتے ہوئے جب قبلۂ باطن کو نہیں مانا جائے گا تو پھر طریقت نہیں ہوگی، کچھ چیزیں تو ہونی چاہئیں اِس سے میں کیا کہنا چاہتا تھا یہ کہ تنزیل کے اندر تاویل کی گنجائش ہے، تنزیل کے زمانے میں اور تاویل کے دور میں تنزیل ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کے لئے اِس کے وجود کا ہونا ضروری ہے اور اِس طرح سے اِن کے سوال کے لئے جواب دینے کی کوشش کی گئی۔

سوال: [قرآنِ حکیم میں خدا فرماتا ہے کہ تم میری سنّت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے اور سنّت کو اگر ہم دیکھیں تو اِس سے مراد خدا کا نظام ہدایت ہے، تو اِس سے مراد نبوت اور امامت ہے۔ جب ہم امامت کے دور کی بات کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ امامت کے دور میں صرف امامت کام کرتی ہے نبوت کا تصور نہیں ملتا ہے لیکن یہ ممکن ہوگا کہ نبوت کا جو نور ہے وہ امامت میں کام کرتا ہو اور اِسی کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ خدا کی سنّت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے اور اِسی طرح اُس کی ہدایت کا نظام ہے؟]

جواب: اِنہوں نے قرآن کے حوالے سے اور میری گفتگو کے حوالے سے ایک عمدہ سوال یہ اُٹھایا کہ اگر خدا کی

عادت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے، تو یہ کیوں ایسا ہے کہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ امامؑ موجود ہیں اور رسول نہیں ہیں تو یہ تبدیلی کیوں ہوئی؟ اِس کے لئے جواب یوں دینا ہے کہ خدا کی عادت میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے، اِس سے مراد یہ ہے کہ دین کے بنیادی امور میں، جو ضروری امور ہیں، اُن میں تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے اور جس طرح دورِ نبوت میں پیغمبر بھی تھے اور امام بھی تھے مگر ہدایت کا مرکز ایک ہی تھا، ایسا نہیں تھا کہ دو ہدایتیں ہوتی تھیں، ایک ہی ہدایت ہوتی تھی اور اُس میں امامؑ خاموش رہتے تھے اور پیغمبر ہدایت کرتے تھے اور جو تاویل کی ضرورت ہو وہ امامؑ اُس کو بجالاتے تھے۔ اب جو دورِ امامت ہے اور پیغمبرؐ کی شخصیت موجود نہیں ہے تو اِس کے باوجود پیغمبر کا جو مرتبہ ہے، پیغمبر کا جو کام تنزیل سے تھا، آسمان سے کسی کتاب کو حاصل کرنے سے متعلق تھا، وہ ہے اور پیغمبر کا جو (concept) ہے وہ بھی ہے اور پیغمبر کی لائی ہوئی کتاب ہے وہ بھی ہے اور پیغمبر کا جو نور ہے وہ بھی اُسی مقام پر ہے جس طرح پہلے تھا۔ صرف یہ ہے کہ پیغمبر کی شخصیت نہیں ہے، تو خدا کی عادت کا تعلق ہدایت سے ہے، سلسلۂ ہدایت کے قائم ہونے سے ہے اور نور کے قائم ہونے سے ہے اور نظامِ دین کے قائم ہونے سے ہے، مگر شخصیت سے نہیں ہے اور اِس میں کوئی فرق نہیں ہے چونکہ نظامِ ہدایت قائم ہے، نظامِ دین قائم ہے اور نورِ نبوت اور نورِ امامت جو پہلے بھی ایک ہی ہوتا تھا، نور دو نہیں ہوتے تھے، جس خدا کی عادت کا ہم ذکر کرتے ہیں اُس کے مطابق پہلے بھی ایک ہی نور ہوتا تھا اور اب بھی وہی ایک نور ہے البتہ شخصیت نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ اِس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اب قیامت برپا ہو چکی ہے۔ جیسے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں اور ساعۃ یعنی قیامت اِس طرح ہیں، اپنی دو مبارک انگلیوں سے ارشاد فرمایا کہ میں اور مرتبۂ قیامت اِس طرح سے ہیں [بُعِثْتُ اَنَا وَ السَّاعَۃُ کَھَاتَیْنِ]، تو آنحضرتؐ کے ساتھ ساتھ قیامت کا ہونا لازمی تھا اور اِس لئے نظامِ ہدایت کو کچھ نقصان پہنچائے بغیر قیامت برپا ہو رہی ہے یا ہونے والی ہے یا ہو چکی ہے لیکن خدا کی عادت کا تعلق اور اِس کا اشارہ نظامِ ہدایت کے برقرار ہونے سے ہے اور قرآن کی جن آیتوں میں سنّتِ الٰہی کا ذکر ملتا ہے اُسی مقام پر ہدایت ہی کا ذکر ہے اور کسی ہادیٔ برحق کو مقرر کرنے سے متعلق ہے، تو یہی ہے۔

سوال: [سر! جن پیغمبروں کے بارے میں یہ آپ نے فرمایا کہ وہ امام بھی تھے، سر! (I think) مخصوص طریقے سے اُس کا ذکر حضرتِ ابراہیمؑ کے قصے میں آتا ہے کہ اُن کو امام بنایا گیا تھا۔ شاید شیعہ تفاسیر میں ایسا ہے کہ پہلے وہ پیغمبر بنائے گئے اور پھر وہ امام بنائے گئے اور امامت کا درجہ آخر میں تکمیل کے طور پر اُن میں آیا تھا۔ سر! نور کے لحاظ سے جب امامؑ اور پیغمبرؐ ایک ہیں تو اُن پیغمبروں کے بارے میں جو امام بھی تھے یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ وہ پہلے پیغمبر بنے پھر امام بنے۔ سر! اِس میں معنوی لحاظ سے کس قسم کی تاویل کی گنجائش ہے یا کوئی حکمت؟]

جواب: اِن کا سوال اہم ہے اِنہوں نے اِس گفتگو میں جو بات ہوئی تھی کہ بعض پیغمبر امام بھی ہوئے ہیں اور

پیغمبر بھی تھے، اِس بنیاد پر اِنہوں نے سوال اُٹھایا اور حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمارے شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ ابراہیمؑ کو پہلے پیغمبر بنایا گیا اور اُس کے بعد امام۔ نبوت اور امامت بعض روایات کے مطابق امامت کے کچھ درجات نبوت سے پہلے بھی ہیں اور کچھ درجات نبوت کے بعد بھی ہیں۔ مثلاً امامِ مقیم اسماعیلی اصطلاح میں ایک ایسا لفظ ہے، ایک ایسی اصطلاح ہے کہ یہ بہت عظیم معنی رکھتی ہے اور کہتے ہیں کہ امامِ مقیم خداوندِ عالم کے عظیم پروگرام کے مطابق بہت نہیں ہوئے ہیں، صرف چھ ہوئے ہیں۔ ایک حضرت آدمؑ کے ساتھ ہوئے ہیں، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ اور جب بھی امامِ مقیم ہوتا ہے، تو اُس کا کام یہ ہوتا ہے کہ ایک ناطق کو رُوحانی تربیت دے کر ایک عظیم پیغمبر کو سامنے لاتا ہے، اِس لئے وہ امام بہت ہی عظیم ہوا کرتا ہے۔ اُس کا نام امامِ مقیم ہے، امامِ مقیم کے معنی ہیں ایک ایسے امام ہیں جو ایک ناطق کو برپا کرتا ہے، مقیم معنی قائم کر دینے والا، برپا کر دینے والا، اُٹھ کھڑا کر دینے والا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ امامت کے کچھ درجات ہیں کچھ نبوت سے آگے ہیں کچھ نبوت کے بعد ہیں، لیکن جو انبیاءؑ امام ہوئے ہیں وہ مختلف درجات میں ہوئے ہیں۔ مثلاً سلیمانؑ، حضرت سلیمانؑ تو امامِ مستودع تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے دو فرزند میں سے حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ دونوں میں فرق تھا، حضرت اسماعیلؑ امامِ مستقر تھے اور حضرت اسحٰقؑ امامِ مستودع تھے۔ اِن ضروری باتوں سے متعلق ایک اُصولی بات میں یہ عرض کروں کہ انبیاءؑ اور ائمہؑ، باطن کے باطن میں سب ایک ہیں اور ایک ہی نور ہے، لیکن ظاہر میں وہ مختلف درجات پر فائز ہیں۔ جیسے قرآن کہتا ہے کہ: ''تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ'' (۲:۲۵۳)، یہ پیغمبران جن کا یہاں ذکر ہوا وہ بعض پر بعض کو فضیلت حاصل تھی۔ یہ ظاہر کی بات ہوئی اور باطن کے باطن میں جایا جائے تو اُس میں وہ سب نفسِ واحدہ کی طرح ہیں۔ جہاں ہم مانتے ہیں کہ مونو ریالزم ہے تو اُس مونو ریالزم میں تمام ارواح ایک ہیں تو پھر پیغمبروں کے یکسان ہونے میں سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن ظاہر میں فرق و تفاوت پایا جاتا ہے۔ یہ اُس خدائی عظیم پروگرام کی وجہ سے ہے کہ خدا نے ایک بہت عظیم پروگرام کو مرتب کیا ہے اور یہ طے ہوا ہے کہ کس زمانے میں کون سا کام کرنا چاہیئے اور کس طرح ہونا چاہیئے، تو اُس پروگرام کی وجہ سے بعض شخصیتیں عظیم ہوا کرتی ہیں تو ظاہر میں تفاوت ہے اور باطن میں وحدت ہے اِس لئے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں اللہ کا یہ فرمانا کہ اِدھر سے وحی جاری ہے، اللہ اُس کے ساتھ کلام کرتا ہے پھر مستقبل کے ریفرینس سے ارشاد ہوتا ہے کہ: ''اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' (۲:۱۲۴)، میں تم کو امام بنانے والا ہوں۔ حالانکہ اُس وقت وحی ہوتی تھی، کلام ہوتا تھا پھر خدا نے فرمایا کہ میں تم کو امام بنانے والا ہوں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ امامت کے ایک عظیم مرتبے پر اُن کو فائز کرنے کی بات ہو رہی ہے۔

ٹرانسکرائب: امین رحمانی ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُر حکمت بیان

عنوان: قرآن فہمی کی آسانیاں

کیسٹ نمبر: Q-38-A　　تاریخ: ۱؍ستمبر؍۱۹۸۳ کراچی

علم کے حاصل کرنے میں شاید اِس سے مدد ملے۔ وہ یہ ہے کہ لوگ علم کے نام سے ڈرتے ہیں، معلوم نہیں کیوں ڈرتے ہیں۔ وہ اِس لئے ڈرتے ہیں کہ علم کو بہت مشکل بلکہ ناممکن سمجھتے ہیں اور وہ اِس لئے ڈرتے ہیں کہ علم کو ایک بے پایان سمندر قرار دیتے ہیں۔ ہاں! ایک اعتبار سے اُن کا کہنا صحیح ہے کہ علم کے سمندر کا کوئی کنارہ نہیں لیکن دوسرے اعتبار سے اِس کے لئے چارۂ کار ہے، تو میرا مشورہ یہ ہے کہ علم کے حصول سے یہ کہتے ہوئے کہ علم مشکل ہے، وسیع ہے، نہیں ڈرنا چاہیئے، اِس لئے کہ علم کی کلیدیں ہیں، اِس لئے کہ علم خزانوں میں جمع ہے، ایسا پڑا ہوا نہیں ہے اور اِس لئے کہ علم اُوپر سے اُوپر مختصر سے مختصر ترین ہو جاتا ہے۔ لہٰذا علم کے حصول سے کبھی گریز نہیں کرنا چاہیئے اور اُس کو کبھی مشکل نہیں سمجھنا چاہیئے، ہوسکتا ہے کہ خدا توفیق عنایت فرمائے اور جب خداوندِ عالم کے حضور سے تائید حاصل ہو جائے گی، تو اُس وقت علم کا معاملہ بہت ہی آسان بھی ہو جائے گا اور انتہائی دلچسپ بھی۔ پھر علم غذا کی طرح ہو جائے گا کہ انسان غذا کے معاملے میں کبھی یہ نہیں سوچتا ہے کہ غذا کی فراہمی یا اُس کا حصول یا اُس کا کھانا مشکل ہے۔ چونکہ انسان (naturally) غذا سے وابستہ ہے اور اُس میں خدا نے لذّت رکھی ہے، جس کی وجہ سے انسان کو نہ صرف رزق کی تلاش اور حصول سے دلچسپی ہوتی ہے بلکہ اُس کے سلسلے میں ہر کام بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ لہٰذا علم کے حصول میں بھی جب خداوندِ عالم دستگیری فرمائے گا تو مزہ آئے گا۔

فطرت کا یہ نظام ہے کہ چیزیں دو طرح سے ملتی ہیں، ایک یہ کہ ہر بڑی چیز پھیلی ہوئی حالت میں ملتی ہے اور دوسری پوزیشن یہ کہ وہ سمٹی ہوئی حالت میں ملتی ہے، جیسے درخت ہے، درخت پھیلی ہوئی حالت میں ہے، اُس کی کتنی جڑیں ہیں اور تنا کتنا بڑا ہے، موٹی شاخیں، چھوٹی شاخیں پھر پتّے اور پھل وغیرہ، لیکن یہی سب کچھ اُس درخت کے بیج میں سمٹا ہوا ہے۔ اِسی طرح علم پھیلی ہوئی حالت میں بھی ہے اور سمٹی ہوئی حالت میں بھی ہے۔ اگر بندۂ مومن سے خداوندِ عالم خوشنود ہو جاتا ہے، تو اللہ اُس کو سب سے عمدہ چیزوں سے نوازتا ہے اور سب سے عمدہ چیز علم ہے اور وہ علم بڑی آسانی سے عطا ہو جاتا ہے اور علم مومنین کو عطا کر دینے کے لئے ہے، اِس لئے انسان کی وسعت اور طاقت کے مطابق اعلیٰ علم قابلِ حصول ہے ناممکن نہیں ہے، تو میں نے عرض کیا کہ علم خزانوں کی حیثیت میں ملتا ہے، یہ علم کلماتِ تامّات میں ہے، اسمائے بزرگ

میں ہے۔ چنانچہ ایک وقت بندۂ مومن پر ایسا بھی گزرتا ہے کہ اُس میں مومن کے چاروں طرف علم ہی علم نظر آتا ہے۔ جب وہ سوچتا ہے تو اُس میں علم ہے، جب وہ کام کرتا ہے، تو اُس میں علم ہے، جب وہ دیکھتا ہے تو اُس میں علم ہی کو دیکھتا ہے، جب وہ سنتا ہے تو علم ہی کو سنتا ہے، وہ بس علم کے سمندر ہی میں رہتا ہے۔ اِس سلسلے میں دو باتیں بڑی اہم ہیں، ایک یہ کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ''۔ مومن کے فہم وفراست سے بچ کر رہو کیونکہ وہ خدا کے نور کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اِس حدیث کا ظاہر کچھ یوں لگتا ہے جیسے ہمیں تلقین کی جاتی ہو کہ مومن کی فراست سے اِس لئے ڈرو کہ وہ تمہارے دل میں جھانکتا ہے، تمہارے ضمیر کو دیکھتا ہے، اِسی لئے اُس کے خلاف کچھ سوچو نہیں مگر اصل بات یہ نہیں ہے۔ خدا کسی کو ترقّی دے کر دوسرے مومنین پر مسلّط کرے اور اُن کے خلاف اُبھارے اور اُن کے ضمیر کے بھیدوں کو دکھلائے، یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ اِس حدیث کا مطلب کچھ اور ہے اور ہونا چاہیئے، وہ یہ کہ خدا کے نور کی روشنی میں دیکھنے کا مطلب علم ہے، علم کو دیکھنا چاہیئے اور مفید چیز کو پانا چاہیئے نہ کہ انسانوں کے ضمیروں کو پڑھنا چاہیئے۔ اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ہو، حدیث یا صفحۂ کائنات یا دیگر خدا کے بھید، وہ بندۂ مومنین کے لئے ہیں کہ مومن اُن کو دیکھیں، پائیں۔ اِس جیسی ایک لمبی حدیث ہے، اُس حدیث کا خلاصہ آپ کو معلوم ہے، میں تھوڑا سا اشارہ کرتا ہوں، وہ حدیث، حدیث نِوافل ہے۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ خدا نے فرمایا ہے کہ: ''مَا یَزَالُ عَبْدِی یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ''۔ میرا بندۂ مومن زیادہ عبادت کرنے سے نہیں رُکتا ہے، آرام نہیں لیتا ہے۔ نوافل اُس کو کہتے ہیں جو فرض کے علاوہ عبادت ہے وہ نوافل ہے، تو وہ نوافل یعنی زیادہ عبادت، مزید عبادت، (extra) عبادت کرتا جاتا ہے اور اُس زائد عبادت کے وسیلے سے تقرب چاہتا ہے، خدا سے نزدیکی چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اُسکی آنکھ بن جاتا ہوں وہ مجھ سے دیکھتا ہے، میں اُس کے کان بن جاتا ہوں وہ مجھ سے سنتا ہے، میں اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں وہ مجھ سے پکڑتا ہے، اور میں اُس کی زبان بن جاتا ہوں وہ مجھ سے بولتا ہے، میں اُس کا پاؤں بن جاتا ہوں وہ مجھ سے چلتا ہے، یہ حدیث ہے۔ اب ہمیں یہ حدیث کس طرح سمجھنا چاہیئے، مثلاً خدا کے کسی مومن کی آنکھ بننے کا کیا مطلب اور کان بننے سے کیا مراد ہے اور دیکھیں گے، کیا دیکھیں گے؟ یہ سب علم کے لئے ہے اور اگر بندۂ مومن علمِ حقیقت کو دیکھتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھتے ہیں، رُوحانیت کو پاتا ہے جو دوسرے نہیں پاتے ہیں، رُوحوں کی آواز کو سنتا ہے جو دوسرے نہیں سنتے ہیں وغیرہ، تو یہی ہوا خدا کے نور کی روشنی میں دیکھنا، سننا، پکڑنا، بولنا اور چلنا۔ مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن کی رُوحانی ترقّی سے متعلق جتنی تعریف ملے گی اُس کا ثبوت اور مقصد علم ہوگا، کیونکہ خدا کے نزدیک سب سے بڑی لازوال دولت علم ہی ہے۔ یہاں تک کہ خدا نے اپنے لئے عقل اور علم کا ایک تخت بنایا اور علم کو تمام اشیاء پر برتری عنایت کی ہے۔ اِس کے لئے جب کوئی مومن سچے دل سے مولا کی طرف توجہ دے، اپنے مالک وآقا سے دعا مانگے علم کے لئے مخلص رہے، صحیح معنوں میں کوشش کرے، تو علم جو حقیقی علم ہے وہ

آہی جائے گا، اِس لئے کہ علم مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے [اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ]، مومن کی کھوئی ہوئی دولت ہے اور کھوئی ہوئی چیز اپنے مالک کو ملنی چاہیئے۔

اب میں اِسی مثال کے ساتھ ساتھ قرآنی علم کی آسانی کے بارے میں عرض کروں گا کہ قرآنی علم کس طرح آسان ہے۔ دیکھئے کہ بظاہر یوں لگتا ہے کہ قرآن ۶۶۶۶ آیتوں پر پھیلا ہوا ہے، ٹھیک ہے! اُس کی اتنی آیتیں ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے ایک تو یہ کہ کسی بھی مشکل کام کے کرنے کے ساتھ ساتھ وہ کام آگے سے آگے آسان سے آسان تر ہوتا چلا جاتا ہے، ایک یہ بات۔ دوسری یہ بات ہے کہ قرآن کی کئی آیتیں دہرائی گئی ہیں۔ تیسری یہ چیز ہے کہ قرآن میں انبیاءؑ کے قصے ہیں تو قصوں کو لینا بڑا آسان ہے۔ چوتھی یہ چیز ہے کہ انسان کا علم وشعور خواہ جس درجے پر بھی ہو اُس نے اپنی زندگی میں قرآن کی بہت سی چیزیں جان لی ہیں، یہ بھی ایک آسانی ہے۔ اِس کے علاوہ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ہمارا مذہب قرآن کے موافق ہے، اِس لئے دوسروں کو قرآن مشکل ہوسکتا ہے لیکن ہمارے لئے نہیں۔ کیوں؟ ہمارا مذہب ایسا ہے کہ اِس میں جس طرح ہم عمل کرتے ہیں وہ قرآن کے موافق ہے، قرآن کے (essence) کے موافق ہے، قرآن کی تاویل کے موافق ہے، اِس لئے کہ ہم اُس ہادیٔ برحق کی اطاعت کرتے ہیں جو معلمِ قرآن ہے۔ لہٰذا اُس ربانی معلم نے ہمارے لئے زندگی کا پروگرام کچھ اِس طرح سے بنایا ہے کہ اِس پروگرام پر عمل کرتے ہوئے ہم قرآن کی پیروی کرتے ہیں، اِس کے لئے کوئی مثال چاہیئے۔ مثال یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے (islam is the religion of nature) اور فطرت یا (nature) کا مطلب یہ ہے کہ ہم زمانے کے ساتھ ساتھ اپنی رسومات میں تھوڑی سی تبدیلیاں کرتے رہیں، یہ قرآن کی حکمت کے منشاء کے مطابق ہے۔ اِس سلسلے میں یہ کہنا چاہیئے کہ قرآن کی جو ہدایت ہے اُس کی تعریف یہ ہے کہ وہ تدریجی ہدایت ہے (gradual guidance)، اور اُس میں لچک ہے۔ اِس کا ثبوت زمانۂ نبوت سے اگر دینا ہے تو میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ قرآن کل تیئیس (۲۳) سالوں میں نازل ہوتا رہا اور تیئیس (۲۳) سال کی مدّت کچھ زیادہ نہیں ہے، اِس مختصر سی مدّت میں قرآن کے کئی احکام بدل گئے، جس کو آج مسلمان ناسخ اور منسوخ کا اُصول کہتے ہیں یعنی ناسخ اور منسوخ کا کیا مطلب ہے؟ ناسخ اُس حکم کو کہتے ہیں جو ابھی ابھی آیا، تازہ آیا اور اُس نے اگلے کسی حکم کو متاثر کیا یعنی اُس کو (stop) کر دیا یا اُس کو (cancel) کر دیا، تو اِس نئے حکم کو جس نے کسی اگلے حکم کو متاثر کیا یا (stop) کیا یا ممنوع قرار دیا اِس کو ناسخ کہتے ہیں اور جو اگلا حکم ہے یا اگلی آیت کو منسوخ کہتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس مختصر سی مدّت میں یعنی ۲۳ سال کے عرصے میں اِس کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ (amendments) کی جائیں، ترمیمات کی جائیں۔ اِس لئے کہ اسلام (nature) کے مطابق ہے، اِس کو آگے بڑھنا ہے، چلنا ہے، زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے، اِس سلسلے میں مزید معلومات کے لئے میں عرض کروں گا کہ اسلام صرف آنحضرتؐ کے زمانے سے نہیں ہے، یہ صرف حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے

نہیں ہے بلکہ یہ ابتدا سے ہے یعنی شروع سے ہے۔ کیونکہ اللہ کا دین ایک ہی ہے، جس طرح اللہ ایک ہے اُس کا دین ایک ہے، اللہ کے کبھی دو دین نہیں ہو سکتے، جس طرح خدا دو نہیں ہو سکتے ہیں اِس طرح دین دو نہیں ہو سکتے ہیں، جس طرح اللہ کی سنّت دو نہیں ہو سکتی ہیں ایک ہی ہے، اللہ کا قانون ایک ہے، اُس کا دین ایک ہے، تو خدا شروع ہی سے یہ دین اپنے پیغمبروں کو دیتا رہا، دین کا نام کچھ بھی صحیح لیکن دین کی حقیقت وہی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے اگر دین ایک ہے اور اِس کی شریعت ایک ہے، تو اِس میں یہ گنجائش کہاں سے آئی کہ اِس میں تمام زمانوں کے ساتھ سازگاری کی؟ یہ سوال ہے جو بہت اہم ہے۔ اِس کا جواب یوں ہے کہ چونکہ اللہ کے دین کی ہدایت تدریجی صورت میں ہے یعنی (gradually) ہے، لہٰذا ہر زمانے میں اِس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اِن تبدیلیوں کی بدولت ہر بڑے پیغمبر نے ایک ترمیم شدہ شریعت کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، ایسا نہیں کہ (totally) اگلے پیغمبر کی کتاب کو سرے ہی سے منسوخ قرار دیا، نہیں (amendments) ترمیمات ہوتی رہیں۔ اب یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ آیا یہ ترمیمات دین کی ہر چیز میں ممکن ہیں یا دین کی بعض چیزوں میں ممکن ہیں، یہ آپ کے نزدیک ایک سوال ہے۔ میں عرض کروں، اِس اعتبار سے دین کی ساری باتوں کے دو گروپ ہیں، دین کی باتوں کا ایک گروپ ایسا ہے کہ اُس میں تبدیلی کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے، ہو گیا! اِس کے برعکس دین کے احکامات یا کہ دین کی باتوں کا جو دوسرا گروپ ہے وہ اِس قابل ہے کہ اُس میں ترمیمات ہو سکتی ہیں، اب یہ بھی ہمارا فرض ہے کہ اُس گروپ کی بھی اور اِس گروپ کی بھی مثالیں پیش کی جائیں۔ دین کے جن احکامات میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں، اُس کی مثال یوں ہے کہ زمانۂ آدم میں قتل کرنا ممنوع تھا، تو اِس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی ہے، تو یہ اِس طرح ہی رہے گی، جھوٹ بولنا منع تھا یہ اِس طرح رہے گا یعنی جس حکم میں تبدیلی کرنے سے انسانیت کو نقصان پہنچتا ہو، اُس حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے اور کوئی گنجائش نہیں ہے، اِس قسم کی بہت ساری باتوں کو آپ سمجھ سکتے ہیں۔

اب دوسری باتیں جن میں تبدیلی کی گنجائش ہے، قربانی کا طریقہ۔ آدمؑ کے زمانے میں قربانی اِس طرح کی جاتی تھی کہ قربانی کا جانور ہو یا کوئی اور چیز وہ نیاز کی چیز ایک پہاڑی پر رکھ آتے تھے، وہاں پر آسمان سے ایک آگ نازل ہوتی تھی اور وہ آگ جس کسی کی قربانی کو (accept) کرنا ہو، قبول کرنا ہو اُس کی قربانی میں وہ آسمانی (celestial fire) لگ جاتی تھی اور وہ قربانی قبول سمجھی جاتی تھی اور جس کی قربانی نا قبول رہتی تھی اُس کی قربانی ویسی کی ویسی رہ جاتی تھی۔ چنانچہ آدمؑ کے دو بیٹوں کے درمیان تنازعہ ہوا اور وہ تنازعہ کچھ لوگوں کے نزدیک شادی کے سلسلے میں تنازعہ تھا لیکن حقیقت میں وہ شادی کی بات نہیں تھی۔ اصل واقعہ یوں تھا کہ مولانا ھابیلؑ کے لئے حضرت آدمؑ نے وصیت کی تھی کہ امامت اُسی کو دے دی جائے اور اُس کو اسمِ اعظم بول وغیرہ دے دیا گیا تھا اور قابیل جو اُس کا بھائی تھا، اُس کو اِس کا پتہ چلا تھا، تو پھر

اِس کی وجہ سے اُس میں حسد پیدا ہوگیا اور کہا کہ میرے باپ نے مجھ کو چھوڑ کر میرے بھائی کو اپنا وصی، جانشین قرار دے دیا تو اِسی پر جھگڑا ہوا تھا، جب یہ جھگڑا ہوا تو اُن کے باپ نے، آدمؑ نے کہا کہ دیکھو یہ میری طرف سے نہیں ہے، اِس میں کیا راز ہے یہ معلوم نہیں ہے خدا کی طرف سے ہے تو تم دونوں اپنی اپنی قربانی فلان مقدّس جگہ پر لے جا کر رکھو اور جس کی قربانی قبول ہوگی وہ حق پر ہوگا اور جس کی قربانی قبول نہیں ہوگی تو وہ سمجھے کہ اللہ اُس کو یہ عطیہ دینا نہیں چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ ہوا کہ مولانا ہابیلؑ کی قربانی قبول ہوگئی اور قابیل کی قربانی قبول نہیں ہوئی، اِس کے نتیجے میں قابیل کی ہستی میں آگ دشمنی کی بھڑک اُٹھی اور پھر اُس نے اپنے بھائی کو قتل کیا، تو دیکھا قربانی کا طریقہ اُس زمانے میں کچھ اور تھا۔ اِسی طرح نماز کا طریقہ، قبلہ، روزہ اور بہت سی ایسی چیزیں جو نیکی سے متعلق ہیں وہ مختلف تھیں، تو اُن چیزوں کے اُس زمانے میں ایسے ہونے میں کوئی حرج نہیں تھا، چونکہ اِن میں تبدیلی کی گنجائش تھی۔ چنانچہ قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ روزہ تم پر فرض کیا گیا جیسے اگلے لوگوں پر روزہ فرض کیا گیا تھا (۲:۱۸۳)۔ ہم جانتے ہیں کہ اگلے لوگوں پر رمضان کا روزہ فرض نہیں تھا، وہ روزہ تھا کسی اور طرح سے یعنی کچھ اور طرح سے لیکن رمضان کا روزہ نہیں تھا، تو ایسی بہت سی باتیں ہیں جن میں تبدیلی واقع ہوتی آئی ہے اور اُس میں تبدیلی واقع ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، عبادت، بندگی اور بعض ایسی صورتیں۔ چنانچہ یہ پروف آپ کو مل گیا کہ دین میں احکام کے دو گروپ ہیں، ایک گروپ میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں اور دوسرے گروپ میں تبدیلی کی گنجائش ہے۔

اِس سلسلے میں اسلام سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ آپ نے قرآن میں پڑھا ہے، دیکھا ہے اور سنا بھی ہے کہ زمانۂ نبوت میں یتیموں کی مدد کرنے کی بہت بڑی اہمیت تھی، قیدیوں کو چھڑانے کی بہت بڑی اہمیت تھی، بھوکوں کو کھانا کھلانے کی بہت بڑی اہمیت تھی اور غلاموں کو، کنیزوں کو آزاد کرنا یہ بہت بڑے ثواب کا کام تھا، جہاد کرنا دین کا ایک بڑا رُکن تھا، قرآن میں غلاموں کو چھڑانے سے متعلق جو حکم ہے وہ اپنی جگہ پر ہے۔ اب اُس حکم کے لئے آپ کیا کریں گے؟ قرآن اُدھر سے کہتا ہے کہ فلان کام کے سلسلے میں ایک غلام کو آزاد کرو، قرآن آپ سے کہتا ہے۔ آپ کیا کریں گے اور قرآن کہتا ہے کہ یتیموں کو کھانا کھلاؤ، اِس زمانے میں آپ کو صرف کھانا کھانے کے لئے یتیم نہیں ملیں گے، زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ پھر آپ سے قرآن کہتا ہے کہ اسیروں کو، قیدیوں کو چھڑاؤ، پیسہ دو، آپ کیسے چھڑائیں گے؟ اِس سے ظاہر ہے کہ قرآن کے ظاہری احکام اپنی جگہ پر ہیں، اُن میں بطورِ ظاہر کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے جب تک کہ آپ اِس کی تاویل میں نہ جائیں اور تاویل اِس کی آپ یوں کریں گے کہ آپ ایک اسکول قائم کریں گے، ہیلتھ سینٹر قائم کریں گے، کوئی اور ادارہ قائم کریں گے، جہالت و نادانی کے چنگل سے کسی کو آپ چھڑاتے ہیں، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کسی قیدی کو چھڑاتے ہیں، کسی غلام کو چھڑاتے ہیں، کسی اسکول کی آپ سرپرستی کریں گے یا اُس میں پیسے دیں گے یا اُس میں

پڑھائیں گے تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ آپ کسی یتیم کی پرورش کر رہے ہیں۔ اُس زمانے سے متعلق جتنے ثواب کے کام بیان ہو چکے ہیں وہ آپ کے اِس کام میں آئیں گے اور سب باتیں صحیح ہو جائیں گی۔ یہی نہیں آپ ایک اپاہج کو ہاتھ دے سکیں گے علم دے کر ہنر سے آراستہ کر کے، ایک لنگڑے کو پاؤں دے سکیں گے، ایک نابینا کو آنکھ دے سکیں گے، ایک گونگے کو زبان دے سکیں گے، ایک بہرے کو کان دے سکیں گے اور ایک غریب کو تونگر بنا سکیں گے اور ایک یتیم کا سرپرست بن کر اُس کو علم اور ہنر سے آراستہ کر سکیں گے، آپ ننگے کو اِس معنیٰ میں لباس دے سکیں گے اور بھوکے کو آپ کھانا کھلا سکیں گے، یہ علم اور یہ ہنر اِن ہی تمام معنوں میں ہے، سارے معنی اِس میں آجائیں گے اور ساری تاویلات اِس کے موافق ہیں؟ کیا اِس میں مبالغہ ہے؟ نہیں! مبالغہ نہیں۔ ایک دفعہ کے لئے آپ کسی مسکین کو کپڑا دیتے ہیں، تو اِس سے کیا ہوتا ہے، ہمیشہ کے لئے آپ اُس کو ہنر سے آراستہ کریں، تو ایک بھوکے کو ایک بار کھانا کھلاتے ہیں تو اُس سے کیا ہوگا، یہ اچھا ہے کہ آپ اُس کو علم سے، اور ہنر سے آراستہ کر کے رکھیں تا کہ ہمیشہ کے لئے وہ کھائے، پیئے اور آسائش ہو۔ اِسی طرح علمِ دین ہے، جس میں تو حضرت عیسیٰؑ کے سارے معجزات پورے ہو جاتے ہیں، جس طرح وہ کسی مردے کو زندہ کر دیتا تھا، کسی جنم اندھے کو بینائی بخشتا تھا اور ایسی بیماریوں سے نجات دلاتا تھا جن کا علاج لوگوں کے نزدیک ناممکن ہوتا تھا، تو یہ ساری باتیں علم میں، ہنر میں آجاتی ہیں اور اسماعیلی مذہب ایسا کامیاب مذہب ہے۔

میں بات کر رہا تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اِس میں تاویل ہے اور ٹھوس تاویل ہے، اِس ٹھوس تاویل کی مدد سے ہمارے لئے قرآن بہت آسان ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسماعیلی قرآن پر عمل نہیں کرتے ہیں، سب سے زیادہ عمل ہم ہی کرتے ہیں، اِس لئے کہ ہم نے دَورِ شریعت میں شریعت کے طور پر عمل کیا اور دورِ حقیقت میں حقیقت کے طور پر ہم نے قرآن پر عمل کیا۔ عمل بالقرآن کہا جاتا ہے یعنی قرآن پر عمل کرنا، ہم سے بڑھ کر کوئی نہیں اور قرآن کے ظاہر و باطن کے جاننے میں بھی اسماعیلیوں سے بڑھ کر کوئی نہیں، اِس لئے کہ اُنہوں نے معلمِ قرآن کے مقدّس دامن کو مضبوطی سے تھام لیا ہے، لہٰذا یہ کامیاب ہے اور سب سے بڑھ کر قرآن ہمارے لئے آسان اِس لئے ہے، کہ قرآن کی ایک رُوح ہے۔ آپ کو شاید یہ اُصول یاد ہے کہ خدا کی جتنی چیزیں ہیں وہ زندہ ہیں، مثلاً خدا کا تخت زندہ ہے، کرسی زندہ ہے، قلم زندہ ہے، تختی زندہ ہے، خدا کا نام زندہ ہے اور اِسی طرح خدا کی کتاب یہ بھی زندہ ہے۔ خدا کی کوئی چیز بیجان نہیں ہے اور کسی بے جان چیز کو خدا سے منسوب کرنا یہ شرک کے مترادف ہے۔ دنیا میں کوئی بھی بادشاہ۔۔۔

خداوندِ عالم کے حضور میں جو کچھ ہے، جو جو چیزیں اُس کی خاص ہیں، جن چیزوں کو خاص طور سے اپناتا ہے، وہ چیزیں زندہ ہیں۔ لہٰذا جب کہتا ہے میری کتاب، اِس سے ایک نور مراد ہے، اِس سے ایک رُوح مراد ہے، اِس سے امامؑ کی شخصیت مراد ہے اور یہ قرآن جو ظاہری قرآن ہے، اُسی کے ضمن میں آجاتا ہے، اُسی کا ایک تحریری نقش ہے، ایک صورتِ

ظاہر ہے، جس کی رُوح امامؑ کی ذات میں ہے، وہ بولتی ہوئی رُوح ہے، اور قرآن جب نازل ہوا تھا خاموش تحریر کی صورت میں نازل نہیں ہوا تھا بلکہ وہ ایک بولتی رُوح تھی اور وہ ایک زندہ قرآن تھا۔ وہ زندہ قرآن آنحضرتؐ میں باقی تھا اور وہ زندہ قرآن امامؑ میں منتقل ہوا تھا اور وہ زندہ قرآن یعنی اُس کی رُوح، اُس کا نور آج امامؑ میں داخل ہے اور جس کے حصول کے لئے ہم میں سے ہر ایک کوشش کرتا ہے۔ یہ بول، یہ اسمِ اعظم، یہ چار بجے کی عبادت اِس لئے ہے کہ ہم اُس قرآن کو، زندہ قرآن کو دیکھیں، یہ تو انفرادی ترقّی کی بات ہوئی۔ لیکن بحیثیتِ جماعت اِس رُوح سے ہم کو فائدہ ملتا ہے، اُسی قرآن کے مطابق امامؑ ہم کو ہدایت دیتا ہے اور لہٰذا آج ہم دنیا میں اِس قرآن کی رُوح کی ہدایت کے مطابق اور اِسی کے سبب سے آج ہم کامیاب ہیں، ہمارے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں ہے، ہمارے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں ہے اور یاد رہے کہ اسلام جو شروع سے تھا اور آج بھی ہے اُس کا (essence) اسماعیلی مذہب ہے، رُوحِ روان اسماعیلی مذہب ہے۔

خدا نے دین کی تشبیہ ایک رستے سے دی ہے، اِس کا کیا مقصد ہے؟ اِس کا مقصد یہ ہے کہ خدا ہم کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ رستہ جو جاتا ہے کسی ملک سے، تو رستہ ہر علاقے کے ساتھ سازگار ہوتا جاتا ہے اور سازگار کا مطلب یہ ہے کہ رستہ ہر ماحول سے گزرتا چلا جاتا ہے، جنگل ہے تو جنگل سے گزرتا ہے، میدان ہے تو میدان سے گزرتا ہے، دریا ہے تو دریا سے گزرتا ہے، تو شروع سے آخر تک رستے کا ماحول ایک جیسا نہیں ہوتا ہے، جغرافیائی لحاظ سے رستے کا ماحول بدلتا جاتا ہے۔ اِسی طرح اسلام ایک رستہ ہے جو زمانۂ آدم سے آغاز ہوا اور تمام زمانوں سے گزرتا ہوا یہ یہاں تک آیا ہے اور اِس کے بعد بھی یہ جاری رہے گا، تو یہ ہے کہ ہم نے علم کے بارے میں بات شروع کی تھی کہ علم کا حصول آسان ہے اور قرآن کی حکمت بہت آسان ہے اور یہ اسماعیلیوں کے لئے سازگار ہے، موافق ہے۔ لہٰذا ہماری طرزِ زندگی خود حکمتِ قرآن کے مطابق ہے، ہمارا مذہب خود حکمتِ قرآن کے مطابق ہے اور امامؑ جو معلمِ قرآن ہے جو قرآن کی رُوح ہے، تو اِس لئے ہمیں قرآن کی حکمتیں بڑی آسان ہیں۔

اِس کے علاوہ جن چیزوں کو نظریات اور تصورات کہا جاتا ہے یا عقائد کہا جاتا ہے، تو نظریات، تصورات، اُصولات قرآن کے مطابق ہیں اور شاید یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ بعض رسومات بھی، اِس لئے ہمیں اِس عملی صورت میں یا عملی زندگی جو قرآن کے موافق ہے اِس سے ہمیں قرآن کے سمجھنے میں بڑی حد تک مدد مل سکتی ہے۔ اِس کے علاوہ اسماعیلیوں کو جو تعلیم ملتی ہے جو امامؑ کے فرامین، پیروں کے گنان، بزرگانِ دین کی کتابیں، علماء کی وعظ و نصیحت، اِس میں بھی بہت کچھ قرآن سمجھنے کے سلسلے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے۔ لہٰذا ہمیں قرآن کے بھیدوں کے سمجھنے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے تو مزہ آئے گا، کیونکہ بعض مثالوں میں کچھ لوگ قرآن کے سلسلے میں سُستی کرتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں جیسا کہ قرآن ہمارا نہیں ہے، بھئی! قرآن ہمارا کیسے نہیں ہے! رسولؐ نے تو اپنے آخری وقت میں یہ ارشاد فرمایا کہ وہ ہمیں دو

بھاری چیزیں، گرانقدر چیزیں چھوڑ جارہے ہیں، اِن میں سے ایک تو اللہ کی کتاب ہے اور دوسری گرانقدر چیز امامؑ ہیں[اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابُ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ]، تو ہم کیسے ایک چیز کو لے کر پھر دوسری چیز کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ہاں! چھوڑنے کا سوال اُس وقت پیدا ہوتا کہ یہ دونوں چیزیں آپس میں متصادم ہوتیں، مخالف ہوتیں تو ہم سمجھتے کہ یا تو اِس کو لے لو یا اُس کو لے لو۔ جب دونوں چیزیں ایک دوسرے کے موافق ہیں، مطابق ہیں، ایک دوسرے کی حمایت کرتی ہیں، قرآن سرتاسرا امامؑ کی تعریف کرتا ہے اور امامؑ قرآن کی تعریف کرتا ہے، امامؑ اپنے نور سے قرآن پر روشنی ڈالتا ہے، اُس کو اُجاگر کرتا ہے اور جیسے ہی نورِ امامت قرآن کی ہر آیت کو اُجاگر کرتا ہے تو اُس آیت سے امامؑ کی تعریف نکھر جاتی ہے، تو اِس معنیٰ میں قرآن اور امام ایک دوسرے کی حمایت، ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں، (naturally) ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، ایک دوسرے کو (support) کرتے ہیں۔ اِس لئے ہمیں کیوں نہیں لینا چاہیئے قرآن کو اور قرآن تو حقیقت میں ہمارے لئے ہے اور اُس میں سب مومن کی تعریف ہے، امامؑ کی تعریف ہے۔

آج میں ایک پوائنٹ لکھ رہا تھا، میں زبانی بتاؤں گا، بہت عجیب حکمت ہے، ہم اپنی ذرّیت میں امام کو شاہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہم نے نہیں بنایا ہے، یہ (naturally) قرآن میں ہے اور بہت شان سے ہے قرآن میں، قرآن میں امامؑ کا نام مَلِک ہے۔ عربی میں بادشاہ کو مَلِک کہا۔ حضرت طالوتؑ کے قصے کو پڑھیں آپ کو مزہ آئے گا(۲:۲۴۷)، بنی اسرائیل کے قصے کو پڑھیں مزہ آئے گا، خدا فرماتا ہے بنی اسرائیل سے کہ خدا نے تمہارے درمیان پیغمبر پیدا کئے اور پھر تم کو بادشاہ بنایا، یہ بات ہے(۵:۲۰)۔ کوئی شخص جس کی عقل محدود ہو اِس سے دنیوی بادشاہ مراد لے گا، یہ بات نہیں ہے۔ مَلِک امام مُلُوک ائمہ، اماموں کو کہا جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں خداوندِ عالم بنی اسرائیل پر یہ احسان رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے اُمتِ موسیٰ کے مومنو! دیکھو تمہاری ایک حیثیت تمہارے زمانے کے امامؑ کے اندر ہے اور جہاں امامؑ بادشاہ ہے اُس میں تمہاری رُوح کا ایک سرا ہے، اِس اعتبار سے تم وہاں امامؑ کے ساتھ مل کر بادشاہ ہو۔ جہاں امامؑ بادشاہ ہے وہاں مومن بادشاہ ہے چونکہ امام مومن کا رُوحانی باپ ہے، چونکہ امام مومن کی سب سے بڑی رُوح ہے، وہ رُوح ہے جس کو ہم اب تک (aquire) نہیں کرسکیں ہیں جو، اب ہم سے باہر ہے لیکن اُس میں ہماری ہستی یا انا کا ایک سرا ہے، جب ہم یہاں سے وہاں (close) ہو جائیں گے، تو اپنے آپ کو بادشاہ اور امام پائیں گے، تو دیکھا آپ نے کہ بنی اسرائیل کے بہانے سے خدا نے مومنین سے یہ کہا، حالانکہ بنی اسرائیل کا قصہ تقریباً ختم ہو چکا تھا تو بنی اسرائیل کا قصہ کیوں آیا؟ اِس لئے کہ خدا کی عادت ہے کہ وہ اپنی حکمتوں کو، بھیدوں کو اِدھر اُدھر چھپاتا ہے لوگوں سے لیکن وہ بھید مومنین سے نہیں چھپتے ہیں، تو مومن کی یہ عظمت ہے، مومن کی یہ بزرگی ہے، مومن کو یہ کرامت دی گئی ہے کہ اِس کی رُوح کا ایک سرا امامؑ کے ساتھ ہے۔ ہم اپنے طور سے کہتے ہیں اصل میں واصل ہو جانا، اِس اصل میں واصل ہو جانا ہم (future) پر چھوڑتے ہیں لیکن یہ بات نہیں

ہے۔ ہم اگر چشمِ بصیرت سے دیکھ سکیں، تو اب بھی اصل میں واصل ہیں، ہم اپنی رُوح کے اُس سرے میں اصل سے واصل ہیں اور اِسی وجہ سے خدا احسان رکھتے ہوئے فرماتا ہے بنی اسرائیل سے، کہ دیکھو بنی اسرائیل کے مومنو! تم کو بادشاہ بنایا گیا، امامؑ کی ذات میں، امامؑ کے نور میں جا کر دیکھو، اگر کسی مومن میں امام کا نور آئے گا، تو وہ نور آنے کے ساتھ ساتھ اِس کو بتائے گا کہ یہ کیسا بادشاہ ہے۔ وہ نور یوں ہی نہیں آئے گا، اِس کو بادشاہ بنانے کے لئے آئے گا، اِس کو اپنے ساتھ ایک کرنے کے لئے آئے گا اور ایک کر کے بتائے گا کہ ایک ہونے میں کیا ہے، ایک ہونے میں امامؑ جو کچھ ہے مومن بھی وہی ہے، الگ الگ ہیں تو مومن اپنی جگہ پر ہے اور امامؑ اپنے مرتبے میں ہیں۔ اگر ایک ہو گئے، تو مومن امام کو نیچے کھینچ نہیں سکتا ہے، امامؑ مومن کو اُوپر اُٹھاتا ہے، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک قطرہ سمندر پر غالب آئے اور قطرے میں یہ ہمت ہو کہ سمندر کو سُکیڑ کے، لپیٹ کے قطرہ بنائے۔ سمندر کی یہ شان ہے کہ قطرے کو سمندر بنائے گا اور سمندر کا قطرے کو سمندر بنانا یوں ہے کہ قطرے کو مٹائے گا، اپنی ذات سے ملا لے گا، تو یہ ہوا سمندر کا قطرے کو سمندر بنا لینا۔ یہ ہے چند باتیں ہوئیں علم کے سلسلے میں۔ شکریہ کہ آپ نے توجہ دی۔ مہربانی۔

ٹرانسکرائب: امین رحمانی ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: قرآن فہمی کی آسانیاں

کیسٹ نمبر: Q-38-B   تاریخ: ۲۲ ستمبر ۱۹۸۳ء کراچی

اِنہوں نے میرے کسی آرٹیکل یا کسی پورشن کے حوالے سے پوچھا کہ اسلام آفاقی یا کائناتی یا (universal) مذہب کس طرح سے ہے؟ اِس کے لئے میں گزارش کروں گا کہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِس دین میں تمام قسم کے زمانی اور مکانی احوال کے ساتھ موافقت اور سازگاری کی گنجائش ہے۔ آفاق سے دو چیزیں مراد ہیں، ایک تو (place) ہے اور دوسرا (space) ہے، ایک تو (place) ہے، ایک ٹائم ہے، زمان و مکان۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں ہر زمانے کے لئے اور ہر جگہ کے لئے ہدایت [ہے] کسی ترقّی کو متاثر کئے بغیر، اور بغیر کسی رُکاوٹ کے اور بغیر کسی تقلید کے یہ چلنے والا اور قائم رہنے والا مذہب ہے۔ مثال کے طور پر اِس زمانے میں، اِس دنیا کے اندر مختلف اقوام رہتی ہیں اور مختلف حکومتیں ہیں، رشیا ہے، چائنا ہے، امریکہ ہے، فرانس، برطانیہ، جاپان وغیرہ، آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہر ملک کے رواج، رسم، ماحول اور شرائط الگ ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود اسلام میں یہ گنجائش ہے کہ ہر ملک میں، ہر قوم میں، اور ہر زمانے میں یہ زندہ رہ سکتا ہے اور یہ خوبی جو اسلام کے نام سے ہے، اسماعیلی مذہب میں ہے۔ جیسے آپ اپنی جماعتوں کو دیکھ سکتے ہیں کہ ہر ملک میں ہیں اور اُنہوں نے ہر ملک میں اور ہر کلچر کے اندر، ہر حکومت میں اپنے مذہب کو زندہ رکھا ہے، اور اِس سے کہ وہ مغرب میں ہیں یا رشیا میں ہیں یا چائنا میں ہیں، کچھ فرق نہیں پڑتا، یہ خوبی اسماعیلی مذہب میں زیادہ سے زیادہ ہے، کسی اور مذہب کو آپ لیں گے تو یہ بات موافق نہیں آئے گی۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ جو اصل اسلام کا (essence) ہے، اسلام کی جو رُوحِ رواں ہے وہ اسماعیلی مذہب میں ہے۔ لہٰذا اِس تعریف کا اطلاق اِسی مذہب پر ہوتا ہے، جیسے کسی فرمان میں فرمایا گیا ہے اور پانی سے تشبیہہ دی گئی ہے [”آپ اپنا قدیم مذہب بھول نہ جانا۔ تالاب کے کنارے بدلتے ہیں لیکن پانی نہیں بدلتا۔ دریا کا پانی بہتا ہی رہتا ہے۔ امامت کا سلسلہ بند نہیں ہوتا، جاری ہی رہتا ہے“ امام آقا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ، بمبئی، ۹/۲/۱۹۳۶ء] پانی، کوہِ ہمالیہ کی چوٹیوں سے پانی بہنا شروع ہوجاتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کوہِ ہمالیہ میں کتنی سردی ہے، ٹھیک ہے، تو وہاں پانی کو تو اپنا (temperature) سرد رکھنا چاہیئے، جیسی زمین ہوگی، جیسی مٹی ہوگی اُس کے ساتھ پانی کا رنگ اور مزاج سازگار ہوتا چلا آئے گا۔ جب کوئی ایسی جگہ آئے کہ جہاں سے پانی کو گرنا چاہیئے تو وہاں ایک آبشار بن جائے گا،

اور جہاں پتھر ہیں تو اُن کے ساتھ پانی کا ٹکراؤ ہوگا تو وہاں ایک کھلبلی سی ہوگی، جہاں تنگ جگہ ہو تو پانی کو تنگ ہو جانا چاہیئے، جہاں رستہ میدان ہے اور پھیلاؤ ہے تو پانی کو پھیلنا چاہیئے اور جہاں پانی کا رنگ اگر (red) ہے تو (red) کے اُوپر پانی بہتا چلا جائے گا اور مٹّی کا رنگ (brown) ہے یا سفید ہے تو پانی کا رنگ بھی وہی ہوتا چلا جائے گا اور جیسے جیسے پانی آگے بہتا چلا جائے گا، تو اُس میں موسم بھی بدلتا جائے گا، لہٰذا موسم کے مزاج میں اور پانی کے مزاج میں کچھ تبدیلی نہیں آنی چاہیئے۔

اِسی طرح یہ مذہب کا پانی زمانۂ آدم سے بہنا شروع ہوگیا ہے اور وہاں سے شروع کر کے اِس کی موافقت رہی ہے، اِس کی سازگاری رہی ہے اور یہ ہر زمانے کے ساتھ سازگار ہوتا رہا ہے، ہر ملک میں یہ چلتا رہا ہے، تو ایک بات میں یہاں کروں گا، دنیا میں کسی چیز کو زندہ رکھنا ہے، کسی مشین کو یا کسی بھی چیز کو تو آپ اُس کو ٹھوس نہ بنائیں، اُس کے اندر بہت سارے کل پُرزے رکھیں، اُس میں لچک رکھیں، اُس کو ایسا بنائیں کہ ایک پُرزہ گھس جائے تو اُس کی جگہ پر دوسرا پُرزہ ہے، اگر آپ کی مشین یا آپ کی کوئی چیز ایک ایسے (solid) پتّھر کی طرح ہے تو جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ویسے وہ گھستا جائے گا پھر آپ اُس کو (amend) نہیں کر سکتے ہیں، اُس کو زندہ نہیں رکھ سکتے ہیں۔ اِس سے میری مراد یہ ہے کہ جس مذہب کے اندر تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ زمانۂ رسول میں جو کچھ تھا، اُس کے سوا مذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، تو اِس میں اُن کے دین کے ختم ہونے کا اندیشہ ہے، تو آفاقی دین یہ ہے جو دنیا اور زمانے کے ساتھ سازگار ہے اور (natural religion) کا مطلب یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ اے گروہِ جنّ و انس اگر تم سے ہو سکتا ہے تو اِس کائنات کے ظاہر کو چھوڑ کے عالمِ بالا چلو اور یہ فرمانا کہ تم سے ایسا نہیں ہو سکے گا، تم نہ نکل سکو گے مگر سلطان سے (۵۵:۳۳) اور یہاں پر سلطان سے ایک تو علمی طاقت مراد ہے اور دوسرا عبادت کی طاقت مراد ہے اور ساتھ ہی ساتھ اگر ہم خدا کے پروگرام کو کسی زمانے پر پھیلا ہوا مانتے ہیں، تو اِس میں دورِ آخر کی طرف اشارہ ہے کہ ایک خاص زمانے میں عالمِ بالا جایا جا سکتا ہے اور اُس خاص زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں لفظ سلطان کو لیا ہے اور اِس میں امامؑ کا نام بھی ہے۔ دنیا کے ہوشمند لوگ اپنی کسی اولاد کا نام کسی مناسبت سے رکھا کرتے ہیں، واقعات و حالات کے مطابق اگر کوئی بڑا واقعہ پیش آیا ہے اُس کی نسبت ہے، مہینوں کی نسبت سے، واقعات کی نسبت سے، دنوں کی نسبت سے، اور دیگر عالمی حالات کی نسبت سے کسی مولود کا نام رکھا جاتا ہے اور ہم ایک ایسی ہستی کو امام مانتے ہیں کہ وہ ہستی عقلِ کُل ہے۔ لہٰذا بہت ہی ممکن ہے بلکہ یقینی بات ہے کہ سلطان کا نام رکھنے میں بھی کوئی بھید ہے، ایک نہیں بلکہ کئی ہیں اور اُن میں سے ایک تو یہ ہے کہ یہ زمانہ آخر کا ہے، قیامت کا ہے لہٰذا یہ لفظ سلطان علامت ہے اور اِس بات کی دلیل ہے کہ اب یہ زمانہ وہ ہے جس میں کہ کوئی انس و جنّ امامؑ کے وسیلے سے عالمِ بالا کا تصور کر سکتا ہے۔ یہاں جانے کے لئے کہا گیا ہے، تو جانا جو ہے وہ تو جسمانی کسی چیز سے متعلق ہے، یہاں عالمِ بالا جانا یہ تو ایک تصور ہے، ایک علم ہے، ایک خیال ہے، ایک (concept) ہے۔ اِس

خیال کے ساتھ ،اِس تصور کے ساتھ جاننا سمجھنا ،گویا عالمِ بالا میں جانا ہے ،تو عالمِ بالا میں پرواز کر کے ،اُڑ کر ،چل کر یا کسی اور مادی انداز میں نہیں جایا جاتا ہے ،یہ تو رُوحانی بات ہے ،علمی بات ،ایک تصور ہے ۔

قریب میں یہاں سے خانۂ حکمت کی طرف سے ایک آرٹیکل تیار ہوا ہے ،اُس میں لامکان سے متعلق کچھ سوالات تھے ،اُن ہی سوالات کی بنیاد پر تصورِ لامکان کے بارے میں کافی روشنی ڈالی گئی ہے ۔اُس میں دیکھا جائے کہ لامکان کیا چیز ہے اور اُس میں کس طرح جایا جاتا ہے ۔(آپ کے پاس آرٹیکل ہے تو نمبر ۵ کو پڑھیں ذرا نمبر پانچ کو پڑھیں) وضاحت کرنے کی ضرورت ہے حسّی معجزات کیا ہوتے ہیں ؟ معجزات کئی قسم کے ہوتے ہیں ،معجزات عقلی بھی ہوتے ہیں یعنی ایسے معجزات جن کو ہم عقل کے ذریعے سے سمجھ سکتے ہیں یا کہ جن کا تعلق عقل سے ہوتا ہے ،وہ عقلی معجزات ہیں ۔حسّی معجزات کا مطلب ہے کہ حواسِ ظاہر سے اُن کو محسوس کیا جاتا ہے تو یہ حسّی معجزات ہیں ،پھر ہنگامی معجزات ہیں کہ وہ مستقل نہیں ہیں ،کبھی کوئی معجزہ تھا ظہور پذیر ہو گیا اور پھر وہ چلا گیا ،اِس قسم کے معجزات کو ہنگامی کہا جاتا ہے ۔پھر اِس کے علاوہ دائمی معجزات ہیں جو ہمیشہ ہیں ،جیسے قرآن ہے ،امام ہے ،تو یہ اسلام کے اور پیغمبر کے دائمی معجزات میں سے ہیں اور یہاں کہا گیا ہے کہ علم و حکمت کی جو دلیلیں ہیں ،وہ حسّی معجزات سے بڑھ کر ہیں ،تو یہ ہے اِس کی تشریح ۔جی ہاں ! آپ آٹھ نمبر کو پڑھیں ۔

آیت کی تھوڑی سی تشریح کریں گے ،وہ آیت یہ ہے ۔''وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ''(۸:۲۴) قرآن میں جہاں کہیں بھی ''وَاعْلَمُوْٓا '' کا حکم ملتا ہے وہ جاننے کے لئے ہے اور اِس میں علم کی ترغیب ہے یا علم کے لئے حکم ہے ۔خداوندِ عالم ''وَاعْلَمُوْٓا '' کے اِس حکم میں سب مسلمانوں کو اور جملہ مومنین کو حصولِ علم کا حکم دیتا ہے اور حصولِ علم کے لئے امر فرماتا ہے ،اور یہاں خاص طور پر اِس امر کے جاننے کے لئے فرمایا گیا ہے کہ کس طرح اللہ آدمی اور اُس کے قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے ،تو ایک طرف قلب یعنی دل رہتا ہے اور دوسری طرف آدمی رہ جاتا ہے ،تو یہ بہت حیران کُن بات ہے اور بہت بڑا سوال ہے ،بہت بڑا سوال ہے ۔اِس کے لئے خدا نے ''وَاعْلَمُوْٓا '' فرمایا جان لو ! کیونکر ہو سکتا ہے کہ خدا کیوں اور کس لئے آدمی اور اُس کے قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے ،دیوار کی طرح جو دو چیزوں کو یا دو جگہوں کو الگ کر دیتی ہے ۔اِس صورت میں یہ دل نہیں ہو سکتا ہے جو گوشت کا لوتھڑا ہے ،کہا گیا کہ یہ دل امام ہے قلب ،ہماری خودی یا کہ انا یا کہ (I) ،دو قسم کی ہے یا دو مقام پر ہے ،ایک یہ (I) ،یہ خودی ،یہ انا جو اِس جسمانی ہستی کے ساتھ وابستہ ہے ۔دوسری وہ خودی وہ انا جو عالمِ بالا میں ہے اور عالمِ بالا کا تصور کچھ مکانی طور پر نہیں ہے ،یہ بالا اور اعلیٰ شرف کے اعتبار سے ہے اور اعلیٰ و بالا امامؑ ہے اور خداوندِ عالم نے برائے امتحان ،بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی ہے ،تعلیمات و نظریات اور ابتدائی قسم کی چیزوں سے کہ جس کے نتیجے میں ہم دو حصوں میں بٹ گئے ہیں ،ہماری ادنیٰ سی ہستی یہ ہے جو کچھ ہے ،ہمارا یہ جسم ،ہمارا یہ شعور اور ہمارا یہ ذہن اور دوسری ہماری خودی یا انا عالمِ بالا میں

ہے اور عالمِ بالا کی میں نے تشریح کی۔ جیسے قرآن کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے: ''اِنَّ کِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ ''(۸۳:۱۸) یقیناً نیکو کاروں کا اعمال نامہ علیّین میں ہے، تو قلب یعنی مومن کا قلب اور اُس کا اعمال نامہ تو ایک ہی بات ہے۔ مطلب یہ کہ اگر ہمارا اعمال نامہ زندہ ہے، عقل کے ساتھ، جاندار شئ ہے، تو کل کو ہم اپنے اعمال نامے میں زندہ ہو جائیں گے، خود کو زندہ پائیں گے، وہ امامؑ ہے اور اِس وقت محدود علم نے اور موجودہ تصور نے اور خاص کر امتحان نے خدائی امتحان نے آدمی کو اور اُس کے قلب کو الگ الگ رکھا ہے اور درمیان میں خدا کی خدائی یا کہ اُس کا قانون حائل ہو گیا ہے۔ مگر مومن علمی طور پر اِس دیوار کو پھلانگ سکتا ہے، اپنی انا کو پہچان سکتا ہے، صرف یہی مثال نہیں ہے اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً انسان کی رُوحِ اعظم امامؑ ہیں، سب سے بڑی رُوح اور انسان کو ایک نہ ایک وقت میں اُس رُوحِ اعظم میں خود کو پانا ہے، خود کو اُسی رُوح میں زندہ دیکھنا ہے، یہی نہیں اور بھی مثالیں ہیں، مثلاً انسانِ کامل جس کے (opposite) میں انسانِ ناقص کا کیا مطلب ہے؟ اِس کا یہ مطلب ہے کہ ابھی جو دوسرے انسان ہیں وہ کامل نہیں ہوئے ہیں اُن کو امامؑ کی طرح ہو جانا ہے، یہ (logic) ہے۔ اگر ایک قسم کی اشیاء میں کوئی ایک چیز کامل ہے اور باقی چیزیں ناقص ہیں تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن باقی چیزوں کو بھی جو ناقص ہیں، کامل ہو جانا ہے، اِس تصور کی کئی نظیریں، کئی مثالیں ملیں گی اور ملتی رہیں گی۔ جیسا ابھی میں کہہ رہا تھا کہ امامؑ ہماری چوتھی رُوح ہے، امامؑ ہماری چوتھی رُوح ہے جسے حاصل کرنا ہے دنیا میں یا مر کر آخرت میں اور بہشت جس چیز نام ہے وہ اِسی رنگ میں اور اِسی صورت میں ہو گی، تو یہ جاننے کے لئے ہے۔ علم کی تعریف کی بات تھی کہ علم ایک ایسی قوت ہے اور علم اِس قدر ضروری بھی ہے کہ اِس کی مدد سے بڑے بڑے بھیدوں کا بھی انکشاف کیا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ دس نمبر کی حکمت تھی، آپ گیارہ کو پڑھیں۔

تھوڑی سی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے، اِس لئے کہ یہ جو حکمت ہے. بہت ہی اہمیت کی حامل ہے اور. بہت اہم ہے ہم سب کے لئے جو امامت کا تصور رکھتے ہیں، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ہم یہ مثالیں بیان کرتے ہیں، اِس لئے کہ لوگ اِس کو سمجھ پائیں۔ پھر اللہ کا یہ فرمانا کہ اِس کو تو کوئی نہیں سمجھتا ہے مگر علماء ہی سمجھتے ہیں (۲۹:۴۳) وہ بیان لوگوں کے لئے فرماتے ہیں اور لوگ نہیں سمجھتے ہیں اور اُس کے آخر میں خود ہی فرماتے ہیں کہ اِس کو تو صرف علماء ہی جانتے ہیں اور یہ علماء اَئمہ طاہرینؑ ہی ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن میں جتنی مثالیں ہیں وہ ایک ہی شان کی ہیں، ایک ہی قسم کی ہیں، وہ یہ کہ لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہیں اور وہ یہ کہ اُن کو کوئی نہیں سمجھتا ہے مگر اَئمہؑ ہی سمجھتے ہیں، تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ اَئمہؑ ہی اِن چیزوں کو سمجھانے کے لئے مقرر ہیں۔ اِس سے خداوندِ عالم لوگوں سے رُجوع کروانا چاہتا ہے تا کہ امامؑ لوگوں کو قرآن کی حکمتیں بتایا کریں۔ اِنہوں نے پوچھا کہ یہ حکم یا یہ ارشاد براہِ راست امامؑ سے کیوں نہیں ہوتا ہے کہ لوگوں کو خداوندِ عالم سامنے رکھتا ہے، اور فرماتا ہے کہ یہ مثالیں لوگوں کے لئے بیان کی جاتی ہیں لیکن اِن مثالوں کو لوگ نہیں سمجھتے ہیں مگر علماء

ہی سمجھتے ہیں (۲۹:۴۳) اور علماء سے اَئمہؑ مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اِس میں کچھ مزید وضاحت چاہتے ہیں۔ قرآن کا یہ اُصول اور اُسلوب اِس کی حکمت اور اِس کا طرزِ بیان ہی ایسا ہے تا کہ اِس میں ایک طرف اماموں کے جاننے کا ذکر ہو اور دوسری طرف سے یہ اظہار ہو کہ لوگ نہیں سمجھتے ہیں اور وہ ہر وقت اماموںؑ کے محتاج ہیں۔ اِس لئے اور بالواسطہ وہی بات ہے، (indirect) وہی بات ہے جو آپ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اماموں سے۔۔۔۔

اِس کا مختصر یہ ہے کہ: ''وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا'' اور یہ مثالیں ہیں جنہیں ہم بیان کرتے ہیں ''لِلنَّاسِ'' لوگوں کو۔ ''وَمَا يَعْقِلُهَآ'' اور اِس کو لوگ نہیں جانتے ہیں ''اِلَّا الْعَالِمُوْنَ'' (۲۹:۴۳) مگر علماء ہی جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مثالوں کا دوسرا عنصر امامؑ کی تعلیم ہے، تو خدا کا منشاء یہ ہے کہ بہت اُونچی حقیقتیں ہیں، بہت مشکل باتیں ہیں تو اُن کے سمجھنے کے لئے کوئی چیز نہیں ہے صرف مثالیں ہیں اور مثالیں بھی کافی نہیں ہیں اُس کے ساتھ ساتھ اُن کے ساتھ ساتھ امامؑ کی وضاحت بھی چاہیئے، تو تب خدا کا مقصد پورا ہوتا ہے کہ لوگ اِس سے سمجھ پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر خدا کو کس طرح سمجھایا جائے؟ خدا کو سمجھنا بہت مشکل ہے اور اِس مشکل کے لئے اللہ نے اپنے نور کی تشبیہہ ایک چراغ سے دی۔ ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ ۚ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكَاةٍ فِيْهَا'' (۲۴:۳۵) لیکن علم میں جتنی باتیں ہیں اُن سب سے مثال البتہ اِس لئے آگے ہے کہ وہ حکمت کو (cover) کر سکتی ہے لیکن از خود حکمت کو (cover) نہیں کر سکتی ہے۔ اُس کے تاویل کرنے کے لئے مؤوّل کی ضرورت ہے یعنی تاویل کرنے کی ضرورت ہے، تاویل کرنے والے کی ضرورت ہے، تو تب کہیں اِس کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی آسمانی کتاب از خود لوگوں کو نہیں سمجھا سکتی ہے اور خاص کر وہ حصہ جو متشابہات پر مشتمل ہے یعنی جس حصے کی تاویل کرنے کی ضرورت ہے، تو چونکہ محکمات اور متشابہات کے دو تصور مسلّمہ ہیں، محکمات وہ آیتیں جن کا مطلب سمجھ میں آتا ہے اور تاویل نہ بھی کریں تو چل جاتا ہے، متشابہات وہ آیتیں جن کی تاویل کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، تو ظاہر بات ہے کہ جو متشابہات ہیں وہ تاویل کی زیادہ محتاج ہیں، نسبتاً محکمات کے۔ لہٰذا اللہ کا یہ فرمانا کہ مثالوں کے بیان کرنے کا مقصد لوگوں سے متعلق ہے مگر اُس میں سمجھانے والا امامؑ ہے اور سمجھانے والے اَئمہؑ ہیں۔ جس قدر میں نے اِس سوال کو (catch) کیا ہے، اُس کے مطابق یہ ہے۔

آیت کی اہمیت اِس لئے ہے کہ قرآن میں ایک قسم کے سوالات نمایاں ہیں اور باقی بھی الفاظ ایک طرح سے سوالات ہیں، مثال کے طور پر صراطِ مستقیم یہ بھی سوال ہے۔ ہم دین میں کہیں کوئی رستہ نہیں دیکھتے ہیں، جس طرح دنیا کا رستہ ہے، لیکن دین کی سب چیزوں کو ایک رستے سے تشبیہہ دیں تو تب دین کا نام رستہ یا صراطِ مستقیم ہو سکتا ہے، اسی طرح آپ ذرا باریکی میں جائیں گے تو ہر مقام پر اور ہر لفظ کا ایک پہلو آپ کو سوال کے طور پر ملے گا یعنی مثال کے طور پر ملے گا، تو مثالیں قرآن میں بھری ہوئی ہیں، اِس لئے پیر ناصرِ خسروؒ فرماتے ہیں کہ:

سراسر پُرزتَمثالست تنزیل　　تو زو تفسیر خواند ستی نه تاویل

کہتے ہیں کہ قرآن سراسر مثال ہے یعنی مثالوں سے پُر ہے، تُو نے اُس میں سے تنزیل پڑھی ہے مگر تاویل نہیں پڑھی ہے۔ یہ تو قرآن میں خداوندِ عالم (plural) میں خطاب فرماتے ہیں، کبھی کبھی خدا ''میں'' فرما کر لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے، مگر اکثر و بیشتر ''ہم'' کہتا ہے۔ اِس کے لئے کچھ لوگوں کا خیال اِس میں یہ ہے کہ یہ تو تعظیم کی بات ہے اور برتری کی بات ہے، بزرگی کی بات ہے، کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے لیکن اِس میں اہلِ تاویل کا کہنا ہے کہ چونکہ قرآن حدود کی زبان سے واقع ہوا ہے، مثلاً سب سے پہلے قرآن کا آغاز قلمِ الٰہی سے ہوا، پھر نفسِ کُلی جو لوحِ محفوظ ہے، پھر جبرائیل نے کہا، پھر رسولؐ نے فرمایا اور تاویل کا جو تعلق ہے وہ اساسؑ سے ہے، اِس لئے قرآن کے کہنے والے خدا کی طرف سے حدود ہیں جو خدا کی زبان کا کردار ادا کرتے ہیں، کیونکہ خدا اِس سے برتر ہے کہ اُس کی کوئی زبان ہو مگر وہ حدود کی زبان سے کلام فرماتا ہے۔ عقلِ کُل کی زبان سے، نفسِ کُل کی زبان سے، جبرائیل کی زبان سے، میکائیل کی زبان سے، اسرافیل کی زبان سے، رسولؐ کی زبان سے، امامؑ کی زبان سے اور ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضورِ اکرمؐ اور ربّ العزت کے درمیان پانچ وسائط تھے، وسائط معنی (mediums) یا کہ وسائل پھر رسولؐ نے اپنی حدیث میں نام لیا کہ وہ وسائط کیا تھے۔ ابھی ابھی ایک آرٹیکل میں اِس کا ذکر ہوا اور وہ حدیث بھی (quote) ہوگئی ہے، شاید وہ آپ کے سامنے نہیں آیا ہے۔ [بَیْنِیْ وَ بَیْنَ رَبِّیْ خَمْسُ وَسَائِطَ: جِبْرِیْلُ وَ مِیْکَائِیْلُ وَ اِسْرَافِیْلُ وَاللَّوْحُ وَ الْقَلَمُ] اِس طرح سے ہے۔ پھر دوسری حدیث میں فرمایا کہ میں تو جبرائیل سے لیتا ہوں، جبرائیل وحی میکائیل سے لیتا ہے، میکائیل اسرافیل سے لیتا ہے، اسرافیل لوح سے لیتا ہے، لوح قلم سے لیتی ہے [اِنِّیْ اٰخُذُ الْوَحِیَ عَنْ جِبْرَائِیْلَ وَ جِبْرَائِیْلَ یَأْخُذُہٗ عَنْ مِیْکَائِیْلَ وَ مِیْکَائِیْلَ یَأْخُذُہٗ عَنْ اِسْرَافِیْلَ وَ اِسْرَافِیْلَ یَأْخُذُہٗ عَنْ اللَّوْحِ وَ اللَّوْحَ یَأْخُذُہٗ عَنِ الْقَلَمِ]۔ اِس سے ظاہر ہے کہ قرآن کلامِ خدا ہے لیکن ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ کلامِ خدا کس طرح ہے۔ یہ کسی قدر اہلِ ظاہر کے لئے مشکل بات ہے کہ وہ اِس کو سمجھ پائیں لیکن جو اہلِ حقیقت ہیں اُن کے لئے مشکل نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک خدا کا تصور ایسا ہے کہ اُس کی صفات حدود میں ہیں یعنی خدا جو فرماتا ہے کہ وہ نور ہے، اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بذاتِ خود نور ہے، کیونکہ بذاتِ خود نور قرار پائے تو اِس میں خدا کی شان کے خلاف بات ہوگی، کیونکہ جو صفات ایسی ہیں کہ اُن کے سامنے اُن کے اضداد کھڑے ہیں، تو وہ صفات خدا کی نہیں، مثلاً نور بمقابل ظلمت، عادل بمقابل ظالم، اگر کہیں کہ سخی بمقابل بخیل وغیرہ، تو اِن میں سے بیشتر اسماء یا کہ بیشتر صفات ضد رکھتی ہیں، اُن کے سامنے ایک ضد ہے۔ مثلاً ہادی بمقابل مضّل، ہدایت کر دینے والا اور گمراہ کر دینے والا تو یہ حدود کی صفات ہیں۔ مثلاً ہادی امامؑ ہے اور اُس کا دشمن مضّل ہے اور نور امامؑ ہے اور ظلمت اُس کا دشمن ہے کہ وہ ظلمت کو، تاریکی کو پھیلاتا ہے اور امامؑ روشنی کو پھیلاتا ہے لیکن جو درجہ ایسا ہے کہ آپ اُس کو خدائے پاک مانتے ہیں، کوئی بھی درجہ تو پاک

کہنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا ہم پاک اِس (sense) میں کہیں کہ عیب سے پاک، گناہ سے پاک، غلطی سے پاک، کمی سے پاک، کوتاہی سے پاک، نہیں! اگر یہ کہیں گے تو پھر خدا کی کوئی تعریف نہیں ہوگی، پاک (attributes) سے پاک، صفات سے پاک، اُن صفات سے پاک جو مخلوق میں پائی جاتی ہیں، تو تصورِ سبحان کا مطلب یہ ہے۔ ہم نے وہ بات نہیں کی کہ وہ جس درجے کی آپ بات کرتے ہیں وہ درجہ کیا ہے؟ اُس پر تو ہم نے (discuss) نہیں کیا۔ ہم صرف یہ مانتے ہیں کہ ایک درجہ ایسا ہے کہ وہ بہت ہی عالی ہے اور بہت ہی عالی ہے، وہ صفات سے پاک ہے۔ لہٰذا اِس سلسلے میں یہ پتہ چلا کہ قرآن جو واقع ہوا ہے، قرآن کا جو نزول ہوا ہے وہ عقلِ کُل سے شروع کر کے لوحِ محفوظ اور عظیم فرشتوں سے اور رسولؐ سے قرآن کا ظہور ہوا ہے، جیسے مولائے روم کہتے ہیں جو اسلام میں بہت ہی مشہور ہیں:

گرچه قرآن از لبِ پیغمبر است　　هر که گوید حق نه گفت آن کافر است

ہر چند کہ قرآن پیغمبر کی زبان سے ہے تاہم اگر کوئی کہے کہ یہ اللہ نے نہیں کہا تو وہ کافر ہے۔ اِس کی کئی نظیریں قرآن سے آپ کو مل سکتی ہیں یعنی کہ اللہ کسی پیغمبر کی زبان سے بات کرتے تھے، کسی پیغمبر کے ہاتھ سے کچھ کام کرتے تھے اور خدا کبھی عقلِ کُل اور نفسِ کُل کو اپنے دو ہاتھ قرار دیتا ہے اور کبھی پیغمبر کے ہاتھ کو اللہ اپنا ہاتھ قرار دیتا ہے، کبھی اللہ امامؑ کے چہرے کو، امامؑ کے دیدار کو اپنا دیدار قرار دیتا ہے۔ اگر خداوند کے ہاتھ، پاؤں، چہرہ اور ایسی سب چیزیں ہوتیں اُس درجے میں، تو پھر اِن پیغمبروں کے اعضاء و جوارح کو اپنانے کی کیا وجہ تھی، تو یہ ہے کہ اِس لئے قرآن میں ہم نے کہا، ہم نے نازل کیا تو خداوند اِن حدود کو اپناتا ہے۔

ایک اور چیز ہے وہ یہ کہ یہ (concept)، (revolutionary) ہے، وہ یہ کہ مونور یالزم جو حقیقتِ حقائق ہے، اِس کا بھی اِس میں ذکر ہے۔ بہر حال مونور یالزم کی بات زیادہ مشکل ہے یا وہ تو بہت آخر کی چیز ہے، ہمیں یہ آسان تصور سمجھنا چاہیئے کہ خداوندِ عالم حدود کو اپناتا ہے اور اُن کے توسط سے اپنے فعل کو آگے بڑھاتا ہے، اپنا کام آگے بڑھاتا ہے۔ یہ ہے کہ پیغمبر کے ہاتھ کو خدا نے اپنا ہاتھ قرار دیا، ایک ہی مثال سے سارے قضیہ کا فیصلہ ہوسکتا ہے کہ اگر یہ جائز ہے اور مناسب ہے کہ خدا پیغمبر کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دے تو یہ بھی جائز ہے کہ خدا پیغمبر کے چہرے کو یا امامؑ کے چہرے کو اپنا چہرہ قرار دے اور یہ بھی جائز ہے کہ پیغمبر کی زبان کو یا امامؑ کی زبان کو یا کسی فرشتے کی زبان کو خدا اپنی زبان قرار دیتے ہوئے کہے کہ میں نے کہا یا ہم نے کہا، پیغمبر کے یا فرشتے کے کہے ہوئے کو خدا اپناتے ہوئے یہ کہے کہ یہ تو ہم نے کہا۔ قرآن میں اِس کی نظیریں ہیں کہ کچھ لوگوں کو خدا نے کسی پیغمبر کی زبان سے لعنت کی، کچھ لوگوں کو خدا نے کسی پیغمبر کی زبان سے کلام کیا اور کچھ لوگوں کی بیعت کو ہمارے پیغمبرِ اکرمؐ کے دستِ مبارک سے قبول کیا۔ "وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" (۸:۱۷) یہ چیزیں ہیں کہ خدا سے کام منسوب ہو جاتا ہے اور یہ ہو گیا اور اِس کے بعد تیرہ (۱۳) نمبر آپ پڑھیں۔ اِس صفحہ کو ختم کریں۔

تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے، عام تصور یہ ہے عرش کے متعلق اور حملۃ العرش کے متعلق، عرش کے اُٹھانے والے فرشتے۔ لوگوں کے ذہن میں کچھ اِس طرح سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا تخت ہے اور اُس کے کتنے پائے ہیں اور کم سے کم چار پائے ہیں اور اُن چار پایوں کے ساتھ کچھ فرشتے چمٹے ہوئے ہیں اور کندھے پر اُس تخت کو اُٹھائے ہوئے ہیں، کچھ ایسا تصور ہے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ اللہ کا تخت کیا ہے، اللہ کا تخت نور ہے، نور کیا ہے اِس کی تشریح تو پھر الگ ہونی چاہیئے۔ اب اِس کے بعد ہمارے لئے یہ بات آسان ہوگئی کہ ہم حملۃ العرش کو پہچانیں، عرش کے اُٹھانے والے فرشتوں کو پہچانیں، اب جو شخصیت حاملِ نور ہے وہی شخصیت حاملِ عرش ہے۔ پھر تو چار، پانچ، چھ کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے، ایک ہی شخصیت ہے جو وہی حاملِ نور ہے پھر یہ گنتی کیوں؟ گنتی کے معنی یہ ہیں کہ گنتی میں خدا کچھ راز بتانا چاہتا ہے، گنتی بیک وقت نہیں ہے یہ سلسلے کی چیز ہے، ایک امامؑ نے اپنے زمانے میں نور کو اُٹھایا، دوسرے امامؑ نے اُٹھایا، تیسرے امامؑ نے اُٹھایا، چوتھے امامؑ نے اُٹھایا، پانچویں امامؑ نے اُٹھایا، چھٹے نے اُٹھایا، ساتویں نے اُٹھایا پھر آٹھویں پر قیامت ہوگئی، خدا اِس کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اِس طرح سے۔ ایسا نہیں کہ عرش کے بھاری ہونے کی وجہ سے، بجائے ایک کے آٹھ لگے ہوئے ہیں یا سات لگے ہوئے ہیں یا چھ لگے ہوئے ہیں پھر تو قدرتِ خدا کے کیا معنی! خدا کو ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ کائنات کو اپنی قدرت سے اُٹھائے رکھے، قائم رکھے، اُن کو قوت دے، وہ قوتوں کا سرچشمہ ہے، وہ کوئی کس طرح اُٹھا سکتا ہے یہ تو مادّیت کی بات ہوگئی، جسمانی چیز بن گئی، اِس طرح سے نہیں ہے۔ یہ نور کی بات ہے، تو حاملِ نور ایک ہی امام ہے اور جب ساتواں امام ہوگا، آٹھواں امام ہوگا تو اُس میں کوئی بڑا انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔ لیکن یاد رکھیے کہ یہ صرف ایک دور کی بات نہیں ہے، شروع سے ہمارا تصور ایسا ہے یہ ہمارا تصور نہیں قرآن کا تصور ہے، یہ اللہ کا دیا ہوا تصور ہے، اسلام کا تصور ہے کہ شروع سے لے کر اب تک ہر ساتویں امامؑ پر قیامت برپا ہوتی ہے اور آٹھواں اُس میں کون ہوتا ہے، میں فی الحال نہیں بتا سکتا ہوں لیکن آٹھواں بھی ہوتا ہے، تو ہر ساتویں امامؑ پر زمانۂ آدم سے لے کر اندر ہی اندر سے قیامت برپا ہوتی چلی آئی ہے اور قرآن کے ظاہر سے کچھ یوں لگتا ہے جیسے آگے ایک ایسا وقت آنے والا ہے جو کبھی نہیں آیا ہے، یہ بات نہیں ہے۔ جس واقعہ کی پیش گوئی ہو رہی ہے، وہ واقعہ باطنی طور پر سامنے آتا رہا ہے، ہر سات امامؑ کے ساتھ ایک واقعہ پیش آتا رہا ہے، تو وہاں پر آٹھ بھی ہوتا رہا ہے۔

چلیں میں آٹھویں کا بھی تھوڑا سا اشارہ کرتا ہوں، سات امام ہو گئے ٹھیک! اب نئے دور کا آغاز ہونا چاہیئے اور اُس کے ساتھ نئے سلسلے کا (link) ہونا چاہیئے اور جو نیا امامؑ ہوگا جو وارث ہوگا تو وہ آٹھواں شمار ہوگا اور ساتواں کا (result) آٹھواں سے پیش آئے گا، آٹھویں پر اُس کے واقعات گزرتے ہوں گے۔ چونکہ وہ ساتواں امام تو درجۂ کمال پر ہوگا اور جو اُس کے ساتھ نئے دور کا جو ہوگا، وہ ایک طرح سے آدم ہوگا۔ اگر آپ مانتے ہیں کہ (cycle) سات اماموں پر

مبنی ہے اور نئے (cycle) کا پہلا امامؑ ایک طرح سے آدم ہوگا۔ ہوگا یا نہیں ہوگا، ہوگا جو آدم ہوگا تو اُس پر قیامت گزرے گی اور آٹھویں کو خلیفۂ قائم کہا جاتا ہے۔ خلیفہ آدم کے (sense) میں ہے۔

صفحہ نمبر دو پر ایک لفظ کو ذرا دُرست کریں۔۔۔۔

ٹرانسکرائب: امین رحمانی ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: مقالہ: حکمتِ شکر [کتاب: سوغاتِ دانش، صفحہ:۱۶۰]

قرآن کے مختلف موضوعات کا طریقۂ مطالعہ

Click here for Audio

کیسٹ نمبر: Q-39   تاریخ: ۱۵/ جون/ ۱۹۸۴ء کراچی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

ہمارے عزیزان! آپ نے اِس چھوٹے سے مقالے کو سنا اور اِس کی شاندار طریقے سے وضاحت بھی کی گئی، تو میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ کو اِس میں سے کافی اچھی باتیں ملی ہوں گی، اور علم کے ذرّات یا کہ علم کے جوہر پارے جن کی نسبت امامؑ سے ہے اور اسماعیلی مذہب سے ہے۔ اِس علم کی نسبت کسی شخص سے نہیں ہے کیونکہ یہ اسماعیلی مذہب ہے اور اسماعیلی مذہب کی شان ہے، اِس کے علاوہ آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ قرآنِ مقدّس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین ہیں اور وہ مضامین مختلف آیات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میرا مشورہ آپ سے یہ ہوگا کہ جب بھی آپ علومِ قرآن سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں، تو اُس صورت میں آپ (topic-wise) قرآن کو لیں۔ مثلاً آپ جب نور سے متعلق کچھ جاننا چاہیں گے تو اُس وقت نور کے موضوع کو لیں، اور نور سے متعلق جتنی آیات ہیں اُن سب کا یکجا طور پر مطالعہ کریں اور اِس سلسلے میں اسماعیلی کُتب سے مدد حاصل کریں اور سب سے بڑھ کر امامِ عالیمقامؑ کے روشن فرامین سے آپ مدد لیں، تو جب مولا کی یاری حاصل ہوگی اُس وقت آپ کو آیاتِ نور میں سے ایک کلیدی آیت ملے گی۔ کیونکہ خداوندِ عالم کا ایک جیسا قانون ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ ہر مضمون میں کچھ کلیدیں ہوا کرتی ہیں، کچھ دروازے ہوا کرتے ہیں، تو آپ کو یہ پتہ چلے گا کہ اِس قلعے میں یا اِس شہر میں یا اِس حکمت کے گھر میں کس جانب سے اور کس دروازے سے اور کس کلید کو لے کر جانا چاہیئے، تو آپ کو اُس موضوع سے متعلق کلیدی آیت کا علم ہو جائے گا۔ جب کلیدی آیت کا علم ہو جائے گا تو آپ بے شک اُس دروازے کو کھول سکیں گے اور اُس کے اندر داخل ہو سکیں گے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ آپ جس مضمون کو لینا چاہتے ہیں اُس مضمون کے (opposite) کو بھی لیں۔ مثلاً جب آپ نور سے متعلق حکمتوں کا مطالعہ کرنا چاہیں گے، تو پھر اِسی ضمن میں آپ ظلمت یعنی تاریکی سے متعلق آیات کو بھی لیں، کیوں؟ اِس لئے کہ قرآن کا اندازِ بیان یوں ہے کہ اگر وہ ایک طرف سے کسی چیز کو اثبات کے طور پر بیان کرتا ہے، تو دوسری طرف سے اُس کو نفی کے طور پر بیان کرتا ہے۔ یعنی جس طرح دنیا میں بجلی کی طاقت بنتی ہے اور کام مکمل ہو جاتا ہے (positive) اور (negative) سے، اِس طرح علم میں بھی یہ بات ہے، رُوحانیت میں بھی یہ

بات ہے کہ اُس میں ایک تو (positive) ہے اور دوسرا (negative) ہے، قرآن میں جو نور کا تذکرہ ہے وہ (positive) ہے اور جہاں ظلمت کا تذکرہ ہے وہ (negative) ہے، دونوں مل کر حکمت کو جنم دیتے ہیں۔ جس طرح دنیا میں جانور ہوں یا انسان تو ہر مقام پر دو جوڑے ملتے ہیں، جیسے ماں باپ سے بچے پیدا ہوتے ہیں اِسی طرح منطق میں بھی اور علمِ رُوحانی میں بھی دو دو چیزیں ہوا کرتی ہیں اور اُن دو چیزوں میں سے جو فرزند ہے وہ حکمت ہے، تو اِس لئے نور سے متعلق آیات کے ساتھ ساتھ آپ ظلمت سے متعلق آیات کو بھی لینا تا کہ یہ مضمون مکمل ہو جائے۔ اِسی طرح جب آپ علم کے موضوع کو لینا چاہتے ہیں، تو تمام اُن آیات کو لیں جن میں لفظِ علم آیا ہے کسی بھی صیغے میں، اُن تمام صیغوں کا مادّہ یا کہ (root) ایک ہے۔ مثلاً ''عِلْمَ'' ہے یا ''یَعْلَمُونَ'' ہے یا ''عَلِیمٌ'' ہے یا ''عَلَّامُ'' ہے یا ''عَالِم'' ہے، تو اِن تمام صیغوں میں علم کا ذکر ہے اور اِسی طرح اِن کی بھی کوئی کلید ہے، تو آپ معلوم کریں کہ اِن کی کلید کیا ہے یعنی چابی کہاں ہے، اُس کو لینا اور ساتھ ہی ساتھ دوسری جانب سے آپ (negative) کے طور پر اُن تمام لفظوں کو بھی لینا جو جہالت سے، نادانی سے، لاعلمی سے متعلق ہیں اِس طرح آپ کا یہ مضمون بھی مکمل ہو جائے گا۔

چنانچہ اِس چھوٹے سے خط میں جس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک طرف سے اُن حضرات کی حوصلہ افزائی کی جائے جن کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے، اور دوسری طرف سے ہماری اپنی خانۂ حکمت کی روایت کے مطابق اِس میں علم کا ایک حصہ رکھا ہے اور اُس موضوع کی مناسبت ہے۔ جس طرح خط کا آغاز کیا اِسی سے اِس موضوع کی مناسبت یہ ہے کہ اُوپر کہا جاتا ہے کہ ہم نے شکر کیا یا شکر کرنا چاہیئے اور خداوندِ عالم نے اِسی مناسبت سے شکر کے موضوع کو لیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ شکر کا موضوع کس قدر عالی ہے یعنی کتنا بلند ہے، اِس کی بلندی کا ثبوت یہ ہے کہ تقویٰ کو لیجئے، تقویٰ کے متعلق آپ نے دین سے متعلق اور قرآن سے متعلق جو تقویٰ ہے اُس کے فلسفے کو پڑھا ہوگا، اُس پر خانۂ حکمت کی کتابوں میں بھی کچھ لکھا گیا ہے کہ تقویٰ جملہ اسلامی عبادات کا (essence) ہے، روزہ ہے تو تقویٰ کے لئے، نماز ہے تو تقویٰ کے لئے، غرض یہ کہ اسلام میں جو بھی عبادت ہے، جو بھی معاملہ ہے اُس میں تقویٰ کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، لہٰذا یہ تمام عبادتوں کا خلاصہ ہے یا نچوڑ ہے یا (essence) ہے، تقویٰ۔ اب پھر اِس کے مقابلے میں شکر کے مقام کو دیکھیے کہ شکر اِس تقویٰ کے بعد آرہا ہے، کیوں؟ جملہ عبادات تقویٰ کے حصول کے لئے ہیں اور تقویٰ نعمتوں کے لئے ہے اور شکر نعمتوں کے بعد آتا ہے۔ دوسری طرف سے لفظِ شکر کی عظمت کو لیجئے کہ اِس لفظ کی معنوی عظمت کا یہ ثبوت ہے کہ یہ لفظِ شکر ایک ایسا لفظ ہے جو خدا کے لئے بھی استعمال ہوا ہے قرآن میں اور بندوں کے لئے بھی۔ جب کوئی لفظ ایسا آتا ہے کہ وہ دو طرفہ استعمال ہوتا ہے، ایک سُو [طرف] سے بندوں کے لئے اور دوسری جانب خدا کے لئے تو وہ لفظ انتہائی عظیم ہوتا ہے یعنی اُس کے معنی عظیم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے عزیزوں نے آپ کو وضاحت کے طور پر بتایا کہ خدا کے ناموں میں سے ایک نام شکور ہے، نیز شاکر ہے، جس کے معنی

قدر دانی کے ہیں، تو خداوندِ عالم مومنین کے نیک اعمال کی قدر دانی کرتا ہے یہ قدر دانی زبانی نہیں ہے یعنی کہنے کے لئے نہیں ہے۔ خداوندِ عالم مومنین کے اچھے اعمال کا عظیم اجر وصلہ دیتے ہوئے اپنے فعلِ قدرت سے اِن کی قدر دانی کرتا ہے، لہٰذا موضوعِ شکر کی ایک تعریف یا ایک معنوی بلندی یہ بھی ہے کہ لفظِ شکر خدا کے لئے بھی استعمال ہو رہا ہے، اور ایک بات یہ بتائی گئی کہ شکر قول اور فعل کے لحاظ سے دو مقام پر ہے۔ ایک زبانی ہے یہ بھی صحیح ہے، جب اِس میں ایک بندگی ہے تو اِس بندگی کو کوئی کیونکر نظر انداز کر سکتا ہے، تو دوسرا شکر فعلی ہے یا عملی ہے۔ علاوہ ازیں نعمتوں کی تقسیم کے اعتبار سے بھی شکر کے تین مقام ہیں، قول و فعل کے اعتبار سے اِس کے دو مقام ہیں، نعمتوں کے اعتبار سے اِس کے تین مقام ہیں، مثلاً جسمانی نعمتوں کی شکر گزاری، رُوحانی نعمتوں کی شکر گزاری اور عقلی یا کہ علمی نعمتوں کی شکر گزاری۔ لیکن اِس میں آپ سے یہ بھی عرض کی گئی کہ نعمتوں پر روشنی پڑنے کے لئے نورِ حکمت چاہیئے، جب تک نورِ حکمت نہیں ہوتا ہے تو نعمتوں کی شناخت نہیں ہوتی ہے، جب شناخت نہیں ہوتی ہے تو قدر دانی نہیں ہوتی ہے، جب قدر دانی نہیں ہوتی ہے تو شکر کے معنی پورے نہیں ہوتے ہیں۔ اِس کے لئے نورِ حکمت چاہیئے، اور قرآن میں شکر کی ایک مثال لقمانؑ سے دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کر دی تا کہ وہ شکر کرے (۳۴:۱۳) آپ سوچیں اِس کا کیا مطلب ہوتا ہے، اِس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ حکمت بجائے خود سب سے عظیم نعمت ہے اِس لئے لقمان کو شکر کرنا چاہیئے، دوسرا یہ کہ حکمت نعمتوں کی شناخت کے لئے نور ہے، سو اِس نور کا ہونا لازمی ہے تا کہ نعمتوں کی شناخت ہو، اُن پر روشنی پڑے، نعمت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے اور پھر اُس کے بعد جن کو نعمتیں عطا کی گئی ہیں وہ شکر کو بجا لائیں حکمت کی روشنی میں اور دوسری مثال آلِ داودؑ ہیں کیونکہ اُن سے فرمایا جاتا ہے کہ اے آلِ داودؑ! تم شکر کرو کیونکہ میرے بندوں میں سے شکر کرنے والے بہت کم ہیں (۳۴:۱۳) دیکھیں! پہلے خدا کے عام بندے ہیں، اُس میں سے خدا کے خاص بندے ہیں، اُن میں سے شکر گزار بہت تھوڑے ہیں۔ اِس آیت کا معنوی انداز اِس طرح سے ہے: ''وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ '' (۳۴:۱۳) اور میرے بندوں میں سے شکر گزار تھوڑے ہیں۔ پہلے خداوندِ عالم عام بندوں میں سے خاص بندوں کا انتخاب کرتا ہے اور اُس کے بعد فرماتا ہے کہ میرے جتنے خاص بندے ہیں وہ بھی سب کے سب شکر نہیں کر سکتے ہیں، نعمتیں اُن کے پاس ہوتی ہیں لیکن حکمت کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی نعمتوں کی قدر و قیمت نہیں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اُن میں سے بھی ایک منتخب گروہ ہے، وہی گروہ شکر گزار ہے اور آج ہم یہ حالت دیکھتے ہیں۔

دینِ اسلام خدا کا آخری دین ہے، اِس کے برحق ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں۔ لیکن اسماعیلی جماعت، اسماعیلی طریقہ قابلِ تعریف ہے، اِس لئے کہ اِس میں اسلام کی ساری نعمتیں جمع ہیں۔ لیکن اِس میں حکمت کی روشنی میں شکر کرنے والے بہت تھوڑے ہیں، نعمت تو ہے، ہر مومن کو حاصل ہے، کیا حدِّ قوت میں اور کیا حدِّ فعل میں، لیکن شکر گزار بندے بہت

تھوڑے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ علم وحکمت کی روشنی میں دیکھیں اور اُن نعمتوں کو خدا کے منشاء کے مطابق استعمال میں لائیں ایسے بندے بہت تھوڑے ہیں۔ اِس کے علاوہ قرآنِ مقدّس میں بنی اسرائیل سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم میری نعمتوں کے شکر کو بجالاؤ، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے مومنین کون تھے؟ کسی بھی پیغمبر کے زمانے کے مومنین کی جہاں تعریف ہوتی ہے تو اُن جیسے مومنین دوسرے پیغمبر کے زمانے میں اور ہر امامؑ کے زمانے میں پائے جاتے ہیں، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اِس زمانے میں جو مومنین ہیں اِن کی نمائندگی حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے مومنین اپنے وقت میں کرتے تھے ماضی کے اعتبار سے، اور مستقبل کے لحاظ سے اِس زمانے میں جو مومنین ہیں اِن کی نمائندگی اُن مومنین نے کی جو موسیٰؑ کے زمانے میں تھے، لہٰذا اُن سے جو کچھ کہا گیا ہے اُس کا اطلاق اِن مومنین پر ہوتا ہے، حکمت کی زبان میں، اِن سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ تم میری نعمتوں کے لئے شکر کرو۔ یہ بہت بڑا اہم کلیہ ہے جو میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، خواہ زمانۂ نوح کے مومنین کی تعریف ہے، خواہ زمانۂ ابراہیم کے مومنین کی تعریف ہے یا زمانۂ موسیٰ یا زمانۂ عیسیٰ یا آنحضرتؐ کے زمانے کے مومنین کی تعریف ہے، تو اُس کا اشارہ زمانے میں اُن مومنین کی طرف ہے جو پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا جو خود کو حقیقی معنوں میں مومن سمجھتا ہے اُس کو جاننا چاہیئے کہ قرآن اُس سے مخاطب ہے کیونکہ قرآن میں یہ گنجائش ہے کہ وہ ہر وقت بنی نوع انسان کی ہدایت کرے، ایسا نہیں کہ قرآن کا تعلق ماضی سے ہے اور یہ بات ایسی ہوتی تو بس قرآن نعوذ باللہ منہا موقوف ہو جاتا ہے، ایسا نہیں ہے۔ جس طرح زمانے کا امام ہوتا ہے تو وہ اہلِ زمانہ کے لئے ہوا کرتا ہے، اِس طرح قرآن بھی اللہ کی دائمی کتاب ہے، ایسا نہیں کہ ہر وقت ایک نیا قرآن نازل ہو جائے، وہی قرآن ہے جو کبھی نازل ہوا۔ اُس میں بات یوں ہوتی ہے کہ ہر زمانے میں لوگ اگلے لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں، کافر، کافر کی نمائندگی کرتا ہے اور مومن، مومن کی نمائندگی کرتا ہے، تو جو کبھی کسی کافر کے لئے کہا گیا تھا وہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے، اُس جیسے دوسرے کافر دنیا میں پیدا ہوتے ہیں تو خدا کے اُس کلام کا اُس زمانے کے کافر سے (concern) رہتا ہے۔ اِسی طرح جو کبھی کسی مومن کی تعریف کی گئی تھی وہ تعریف اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے کہ مومن کی جگہ پر ایک مومن دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ اِس معنی میں بنی اسرائیل سے شکر گزاری کا جو تقاضا کیا گیا ہے اُس کا تعلق زمانے میں مومنین سے ہے۔ لہٰذا قرآن میں جہاں کہیں بھی شکر کا موضوع ہے تو اُس میں اعلیٰ سطح کی باتیں ہیں یعنی پیغمبروں، اماموں اور حدودِ دین کے بعد مومنین سے اِس شکر گزاری کے موضوع کا تعلق ہے براہِ راست۔ اِس کے لئے یہ موضوع مومنین کے لئے بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اِس چھوٹے سے خط میں یہ عرض کی گئی تھی سوال کے طور پر یا سوال کو خود ہی (create) کر کے اُس کا جواب مہیا کیا گیا تھا، یہ کہ عبادات تو بہت ہیں لیکن جو شکر گزاری کی عبادت ہے اُس میں اتنی مسرّت و شادمانی کیسے پیدا ہوتی ہے؟ کہا گیا تھا کہ اُس کی وجہ یوں ہے کہ اگر کسی کے پاس علم وحکمت ہے تو اِس علم وحکمت کی روشنی کے نعمتوں پر

پڑنے سے وہ نعمتیں حقیقی طور پر عظیم الشان انداز سے سامنے آتی ہیں، (enlarge) ہوتی ہیں ایسا نہیں بلکہ اُن کی جو اصلیت ہے، اُن کی جو حقیقت ہے، اُن کی جو عظمت ہے، اُن کی جو مرتبت ہے اور اُن کی جو قدر و قیمت ہے وہ ظاہر ہو جاتی ہے علم و حکمت کی روشنی میں، تو تب اِن چیزوں کو مومن اپنے تصورات میں سمجھتے ہوئے، جانتے ہوئے اور جو اچھی اچھی اُمیدیں خدا سے وابستہ ہیں، اُن کو سمجھتے ہوئے وہ شادمان ہو جاتا ہے اور وہاں پر اُس کے دل میں خوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقی فلسفہ ہے یا کہ ایک حقیقی حکمت ہے اور یہ ہے شکر کے سلسلے میں چند اہم باتیں اور جن کو جاننا چاہیئے اور اِس سلسلے میں، میں نے آپ سے عرض کیا کہ جب بھی آپ قرآن کے کسی (topic) کو لینا چاہیں تو متعلقہ تمام آیات کو پیشِ نظر رکھیں اور اُس میں سے کلید کو پانے کے لئے کوشش کریں۔

ابھی میں نے کلید کو پانے کی بات تو کی لیکن اِس کے لئے کوئی اُصول نہیں بتایا۔ اُصول میں اِس طرح سے عرض کروں گا[کہ] سب سے پہلے آیاتِ نور سے متعلق بات نکلی تھی، تو دیکھئے کہ آیاتِ نور قرآن میں تقریباً انچاس (۴۹) تک ہیں (positively)، تو اُن میں جو کلیدی آیت ہے وہ: ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ'' (۳۵:۲۴) ہے، یہ اِن تمام آیات کی سردار ہے اور اِن سب کی کلید ہے۔ یہ آیت دوسری آیات کے مقابلے میں کلیدی حیثیت کیوں رکھتی ہے، اِس لئے کہ اِس میں خداوندِ عالم نے جس شان سے اپنے پاک نور کی تشبیہ ایک ایسے چراغ سے دی ہے کہ وہ چراغ ایک گھر میں ہے اور گھر کی دیوار کے اندر ایک طاق ہے اُس میں ہے۔ اِس تشبیہ کے بعد پھر اِسی لفظ کو خداوند اپنے حبیب کے لئے استعمال فرماتا ہے: ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكَاةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ'' (۳۵:۲۴)۔ دیکھیں کہ اِس آیت میں بھی ایک مرکز ہے اور وہ مرکز مصباح ہے۔ اب یہی لفظ یا کہ اِس کا مترادف یعنی دوسرا ہم معنی لفظ رسولؐ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کی زبان میں مصباح اور سراج کا ایک ہی مطلب ہے، تو ایک آیت کے اندر آنحضرتؐ کے لئے سراج کا لفظ آیا ہے، سراجِ منیر (۴۶:۳۳) جو معنی کے اعتبار سے بالکل وہی لفظ ہے جو اُس آیۂ نور میں، سورۂ نور میں جو بیان ہوا ہے جو اُس لفظ میں ہے، جو اُس لفظ کا مطلب ہے، جو اُس لفظ کے معنی ہیں وہی مطلب اور وہی معنی سراجِ منیر میں بھی ہیں۔ اِس کے بعد پھر مزید تشریح کے طور پر کچھ مصابیح کا ذکر آتا ہے اور وہ مصابیح تاویل کی روشنی میں دیکھنے سے حجتانِ شب و روز ہیں جو اماموں کے حدود ہیں، نور کی جو کلید ہے وہ: 'اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ'' (۳۵:۲۴) میں ہے۔

اِس کے بعد علم کے موضوع کی بات ہوئی تھی، علم کے موضوع کی بات بھی نور کے موضوع سے مختلف نہیں ہے۔ کیونکہ نور کی تشریح علم ہے یا کہ نور کا مطلب علم ہے۔ نور مادّی روشنی کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ سب سے پہلے عقلی روشنی ہے اور علمی روشنی ہے پھر روحانی روشنی ہے، اُس کے بعد اخلاقی روشنی ہے۔ لہٰذا جو کلید آیاتِ نور کی ہے وہی کلید آیاتِ علم کی بھی ہے،

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: ''وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ''(۲۹:۴۳) قرآن کی تشبیہات کو کوئی سمجھ سکتا ہے مگر علماء ہی سمجھتے ہیں، تو ہمارے اَئمہ برحق نے ارشاد فرمایا کہ یہ اِن علماء سے اَئمہؑ مراد ہیں، تو علم سے متعلق جو موضوع ہے، اُس کی کلید یہ ہے کہ ہم امامؑ ہی کو عالمِ قرآن مانیں اور اِسی سے ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں، علی ھٰذا القیاس۔ اس طرح قرآن کے جو عظیم الشّان موضوعات ہیں اُن میں سے ہر ایک کی کلید تصورِ امامت سے ملتی ہے اور پھر ساری مشکلات جو لوگوں کے لئے ہیں وہ آسان ہو جاتی ہیں۔ اِسی طرح شکر گزاری کے موضوع میں بھی ایک آیت ہم کو ملی کہ سب سے بڑے پیمانے پر شکر گزاری حضراتِ اَئمہ ہی کرتے ہیں اور اُن کی شکر گزاری یہ ہے کہ وہ عقلی اور علمی نعمتوں کی دولت سے اپنے پیروؤں کو مالا مال کر دیتے ہیں یہ اُن کی شکر گزاری ہے۔ اِس سے پتہ چلا کہ تمام تر نعمتیں امامؑ کے حضور میں جمع ہیں اور وہاں سے گزر کر نعمتیں ہم تک، مومنین تک پہنچتی ہیں، اِس سے یہ روشنی ملی کہ شکر گزاری کی کلید بھی تصورِ امامت ہی سے مل سکتی ہے، تو یہ چند باتیں تھیں جو شکر گزاری کے موضوع سے متعلق ہیں اور اِس کے ساتھ میں اپنی گفتگو کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور اگر اِس سلسلے میں کوئی سوال ہو تو اِن شاء اللہ، مولا کی یاری سے اور آپ کی دعا سے اُس سوال کے جواب کے لئے ہم کوشش کریں گے۔ یا علی مدد۔

سوال کو یاد کرنے تک ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ مقالے میں آپ کو پڑھ کر سنایا گیا اور اِس کی وضاحت بھی کی گئی۔ ایک آیت ہے قرآنِ مقدّس میں: ''ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ''(۲:۵۶) اِس کا ترجمہ ہے پھر ہم نے تم کو زندہ کر دیا تمہارے مرجانے کے بعد تا کہ تم شکر گزار رہو یا تم شکریہ کرو۔ دیکھیں کہ اِس واقعہ کے متعلق یوں روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو اپنے رُوحانی معجزات کا ذکر فرمایا تو بہت سے مومنین کو یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ خداوندِ عالم کا دیدارِ مقدّس حاصل کریں، اِس لئے اُنہوں نے کہا کہ'' لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ''(۲:۵۵)،''وَاِذْ قُلْتُمْ يَا مُوْسٰى ''، اور اے بنی اسرائیل جب تم نے کہا [موسیٰ سے]: ''لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ ''ہم تمہاری اِس بات کے لئے باور نہیں کریں گے: ''حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً'' یہاں تک کہ ہم خدا کو برملا دیکھیں۔''فَاَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ '' پھر تم کو بجلی نے پکڑا اور تم دیکھتے تھے''ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ''(۲:۵۶)، اُس وقت تم ہلاک ہو گئے، مر گئے اور پھر ہم نے تم کو تمہارے مرجانے کے بعد از سرِ نو زندہ کر دیا تا کہ تم شکر کرو، اِس بیان کے ظاہری پہلو کو دیکھا جائے تو یہ ایک ایسا واقعہ قرار پاتا ہے کہ وہ ظاہر میں پیش آیا تھا، لیکن اِس کا ایک تاویلی پس منظر ہے، تاویلی پس منظر میں جانے سے قبل ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا یہ بات ظاہر میں صحیح نہیں ہے، یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ سب بنی اسرائیل نے التجا کی حالانکہ خدا کی عادت یوں ہے کہ اگر دو نے کچھ کوئی بات کہی ہے تو اُن کو کسی لحاظ سے

پوری قوم کے نمائندے قرار دیتے ہوئے قوم کے طور پر لیتا ہے۔ آپ نے کل دیکھا جو کچھ کہا جاتا تھا وہ چند لوگ کہتے تھے اور قرآن میں اِس طرح سے پیش کیا گیا ہے جیسے کہ پوری قوم کہہ رہی ہے، یہ نمائندگی کی بات ہے۔ کل کے اُس ''مِن قصص القرآن'' کے ڈرامہ میں آپ نے دیکھا کہ بات جو کرتے تھے وہ صرف چند افراد ہی کرتے تھے اور قرآن نے اِس کو پیش کیا ہے جیسے سب لوگوں نے کہا ہو، یہ عادت ہے خدا کی اور اُصول ہے، تو خداوندِ عالم کی اجازت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے ستّر (۷۰) رجال کو چن لیا، عورتوں کو نہیں مردوں کو۔ اِس کی کیا وجہ تھی کہ کیا یہی مرد تھے جن کو دیدارِ خداوندی کی خواہش ہوئی اور کسی بھی مومنہ کو اِس کی خواہش نہیں ہوئی، یہ بات نہیں ہے۔ مرد اور عورت دو قسم کے ہوتے ہیں، جسمانی اور تاویلی، اِس میں جسمانی مردوں کی بات نہیں ہے، تاویلی مردوں کی بات ہے اور حجتوں کی بات ہے۔

ہم نے کسی مقالے میں اِس کا ذکر کیا ہے کہ حدودِ دین میں سے ستّر (۷۰) تھے جو بیک وقت نہیں، فرداً فرداً جن کو دیدار ہوا اور جن کو بڑا دیدار ہوتا ہے اُن کا انبعاث ہوتا ہے اور بڑا دیدار جو سب سے بڑا دیدار ہے وہ آخر میں ہوتا ہے، وہی سب سے بڑی نعمت ہے اور وہی سب سے بڑا دیدار ہے، وہی انبعاث ہے اور وہی سب کچھ ہے، تو کیا ہوتا ہے رُوحانیت میں، سب سے پہلے رُوحانیت کا جنم ہوتا ہے، اِس جنم کو ہم اسماعیلی زبان میں، اسماعیلی (language) میں بیت الخیال کی روشنی کہتے ہیں۔ جب کسی مومن کی دیدۂ دل کے سامنے روشنی نظر آتی ہے، تو یہ اُس کا رُوحانی جنم ہے، اگر کوئی مومن تاریکی ہی میں رہتا ہے، روشنی کو نہیں پاتا ہے تو اُس کا رُوحانی جنم نہیں ہے۔ جب کوئی مومن پہلی بار روشنی کو دیکھتا ہے تو یہ بات ایسی ہے جیسے اِس مادّی دنیا میں کوئی بچہ آتا ہے ماں کے پیٹ سے، تو اُس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اِس مادّی روشنی کو دیکھتا ہے تو مادّی روشنی کو دیکھنے کا نام جسمانی تولّد ہے، جسمانی پیدائش ہے۔ اِس طرح رُوحانی روشنی کو دیکھنے کا نام رُوحانی تولّد ہے، رُوحانی پیدائش ہے۔ ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے، وہ حیوان کی طرح ہوتا ہے، جس طرح اِس دنیا میں ایک بچہ پیدا ہوا ہے، تو وہ حیوان کی طرح ہے، اِسی طرح ایک بچہ اُس رُوحانی دنیا میں جنم پاتا ہے تو ابھی بھی وہ حیوان ہے، ابھی اُس کو عقل کہاں سے آگئی، عقل بہت آگے ہے، وہ حیوان کی طرح ہے لیکن پھر رفتہ رفتہ اُس کی نشوونمائی ہوتی جاتی ہے اور وہ ایک جوان سال ہوتا ہے پھر وہ اُسی روشنی میں کافی عمر کو پاتا ہے پھر ایک دن اُس کی رُوحانی موت واقع ہوتی ہے، جس طرح اِس مادّی دنیا میں ایک شخص عمر کو پاتا ہے اور کسی مرحلے میں جا کر جسمانی موت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اِس طرح وہ مومن جو بیت الخیال کی دنیا میں ہے وہ آگے چل کر کچھ عمر پانے کے بعد اُس کی خوش بختی ہوتی ہے کہ وہ رُوحانی یعنی نفسانی موت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ لیکن کتنی بڑی سعادت ہے وہ رُوحانی یا کہ نفسانی موت، اُس وقت سب فرشتے آتے ہیں، حضرتِ جبرائیل، حضرتِ میکائیل، حضرتِ اسرافیل، حضرتِ عزرائیل، یہ چاروں اپنے لشکروں کے ساتھ آتے ہیں پھر بہت اعزاز کے ساتھ، بہت شان کے ساتھ جس طرح مومن کی موت کا قرآن میں ذکر ہے پھر اُس کی موت کا

اہتمام و اِنصرام ہوجاتا ہے، اُس کی رُوح بہت عزّت کے ساتھ طرح طرح کے تجربات کے ساتھ پُر از معلومات، پُر از حکمت، پُر از علم اُس کی رُوح تقریباً سات دن تک قبض کرنے کی (practice) ہوتی ہے اور اُسی کے ساتھ اُس کی انفرادی قیامت برپا ہوتی ہے اور قیامت میں کیا نہیں ہے اور رُوحانیت کا سب سے بڑا گیٹ کھل جاتا ہے، سب سے بڑا گیٹ اور تاویل کا ایک بہت بڑا (junction) سامنے آتا ہے، یہ ہوا۔ اِس کے بعد کیا ہوتا ہے، اِس کے بعد مومن کا نور بہت (fast) کام کرتا ہے۔

قرآن میں نور کے متعلق ''یَسْعٰی ''(۶۶:۸) ہے، دوڑتا ہے، بڑی سرعت کے ساتھ رُوحانیت کی منزلیں طے ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا وہ عمر بہت لمبی ہوتی ہے یعنی قیامت، مگر منزلیں بہت جلد طے ہوجاتی ہیں، وہ مراحل قبر کہلاتے ہیں، وہ مراحل موت کے بعد کے حالات کہلاتے ہیں لیکن ہوتی ہے زندگی پھر موت کیسے! آگے اور آگے اور سب سے آگے ایک معیار ہے جس کو انبعاث کہا جاتا ہے، اُس کے میعار کے مطابق یہ موت ہے۔ بہرحال اُن مراحل سے گزر جانے کے بعد پھر انبعاث کا وقت آتا ہے اور انبعاث کا مقام بہت ہی اعلیٰ ہے، اُس میں سب سے بڑا دیدار ہوتا ہے، اُس میں سب سے بڑا دیدار ہوتا ہے اور وہ مقام کُن فیکون ہوتا ہے، تو بات کہاں سے شروع ہوئی تھی، بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ بنی اسرائیل کو بجلی نے پکڑا۔ کس بجلی نے پکڑا؟ خدا کے معاملے میں یہ جو بادلوں میں بجلی ہوتی ہے آسمانی بجلی وہ کہاں سے آگئی! خدا کے نوری بجلی نے پکڑا، تو کتنی بڑی سعادت ہوگی کہ اگر کسی مومن کو خدا کے نوری بجلی پکڑتی ہے اور خدا کے معیار کے مطابق کوئی مرتا ہے تو کتنی بڑی سعادت ہوگی۔ قرآن میں جو سورۂ رحمان ہے اُس میں تمام حقیقتوں کا (essence) ہے تمام حکمتیں جمع ہیں، اُس میں خدا فرماتا ہے کہ: ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ''(۵۵:۲۶۔۲۸) زمینِ رُوحانیت پر جو بھی ہیں سب ہلاک ہوجانے والے ہیں لیکن تیرے پروردگار کا چہرہ باقی رہے گا، چہرے سے وہ دیدار جس کا ابھی میں ذکر رہا ہوں وہ تو باقی رہنے والا ہے۔ پھر اِس کے بعد خدا احسان جتلاتا ہے، تو اگر یہ موت کوئی ایسی موت ہوتی جو اِس دنیا میں پائی جاتی ہے تو خدا نے یہ کیوں فرمایا کہ: ''فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ''اے گروہِ انس و جنّ! تم اپنے پروردگار کی اِن نعمتوں میں سے کس نعمت کو جھٹلاتے ہو۔ اشارہ ہے کہ اُس میں [یعنی] خدا کے چہرے میں مومنین کی انا پائی جائے گی اور وہ چہرۂ خدا مومنین کا وہ تصور ہے جس کے لئے کہا جاتا ہے مونو ریالزم، یک حقیقت۔ وہ خدا کا چہرہ ہے، وہ مومن کا چہرہ ہے، اُس میں یکجائی ہے اور وہ ایک ایسا سنگم ہے کہ اُس میں بندہ ہے اور مولا ہے، آقا ہے اور بندہ ہے، اُس میں مساواتِ رحمانی ہے اور آیت بالکل زبانِ حکمت سے کہہ رہی ہے کہ خدا کا چہرہ۔ دیکھیں کسی ترجمہ کرنے والے نے کہا کہ ذات، ارے بھائی! عربی زبان میں الفاظ کی کوئی کمی نہیں ہے، ایک معنی کے لئے کئی کئی الفاظ ہیں۔ چہرہ بھی عربی زبان میں ہے، ذات بھی عربی

زبان میں ہے، تو اِس کا کیا مطلب کہ خدا نے ذات کی جگہ پر چہرے کو استعمال کر کے لوگوں کو اُلجھن میں ڈالا، کیا یہ ہوسکتا ہے؟ چہرہ کے معنی چہرہ ہیں وہاں پر دیدارِ خداوندی ہے، سب سے بڑا دیدار ہے اور اُس سب سے بڑے دیدار میں مومنین کی انا ہے، سارے مومنین کی انا۔ پہلے کہا جاتا ہے کہ: ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ''۔ جلالت و کرامت والے تیرے پروردگار کا چہرہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا اور اِس چہرے میں تمہاری انا ہے، وہ تم پر اکرام و احسان فرمانا چاہتا ہے۔ ''فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ'' اگر یہاں پر انسان ختم ہوجاتا تو پھر نعمتوں کا تذکرہ نہیں ہونا چاہیئے، اِس کی کوئی منطق نہیں تھی کہ خدا نے اُس مقام پر سب کو نیست و نابود کر دیا اور پھر وہ اپنی نعمتوں کی تعریف کرتا ہے، یہ کیسی منطق ہوسکتی ہے۔ نہیں! نہیں! ایسا کبھی نہیں ہے، وہ خداوند ہے، تو یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے جن لوگوں کی موت کا ذکر ہے وہ صرف ستّر (۷۰) تھے، قوم کے سب افراد نہیں تھے وہ حدودِ دین تھے اور حدودِ دین جو ہوتے ہیں اُن پر رُوحانی، نفسانی موت واقع ہوتی ہے، اُن کا انبعاث ہوتا ہے اور وہ خدا کی نعمتوں کو پاتے ہیں اور اِس لئے خداوندِ عالم احسان جتلاتا ہے اور فرماتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ یہ کچھ باتیں تھیں اور میرے خیال میں آج کی محفل کے لئے آپ کے قیمتی وقت میں سے اتنا لینا چاہیئے اور اِن شاء اللہ آپ کا رابطہ ہے خانۂ حکمت کی کتابوں سے، کیسٹوں سے اور تحریروں سے، تو رفتہ رفتہ ہم آپ سب مل کر مولا کی پیاری جماعت کے لئے کچھ خدمت کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔ اِس کے لئے آپ دعا بھی کریں، جدوجہد بھی کریں۔ بہت، بہت شکریہ کہ آپ نے بھرپور توجہ دی اور اتنی تعداد میں آپ نے حاضری دی اِس کے لئے ہم شکرگزار ہیں۔ اِن شاء اللہ لفظوں میں بھی اور عمل میں بھی آپ کے شکرگزار ہوں گے۔ مہربانی، یا علی مدد۔

سوال: (سر! اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ کی آل سے صبر کا امتحان کیوں لیا، جب کہ اُس سے دوسرے بڑے بڑے امتحانات تھے، جو دوسرے بڑے بڑے پیغمبروں کے دور میں اُن سے مانگا گیا کیوں صرف صبر کی آزمائش وہاں پر؟ اور دوسری یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی بڑی رحمتوں کی نوازش کی، من وسلویٰ کی بات، سمندر کو دو حصوں میں بانٹ کر اُن کو رستہ دیا۔ کیا اُن کے دل میں صبر بھی پیدا نہیں کر سکتے تھے، کہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہ امتحان لیا؟ جب اتنے بڑے معجزے ہوسکتے تھے تو صبر بھی اللہ تعالیٰ اُن کو دے سکتے تھے)؟

جواب: ہمارے عزیز نے ایک اہم سوال کو سامنے لایا ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ کسی ایک پیغمبر پر بہت سارے امتحانات کا لانا یا بہت ساری آزمائشوں کا لینا یا کسی ایک پیغمبر پر بہت ساری نعمتوں کو برسانا، کیا یہ صحیح ہے۔ پھر اِنہوں نے بنی اسرائیل کے بارے میں جو واقعات مذکور ہیں قرآنِ مقدّس میں ایک تو اُن پر بہت سی تکالیف کے آنے کا ذکر ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُن پر بہت سے احسانات ہونے کا بھی تذکرہ موجود ہے، تو اِس سلسلے میں اِنہوں نے ایک سوال اُٹھایا۔

جواب: اِس کے لئے عاجزانہ عرض یہ ہے کہ اوّل جملہ انبیاء جو عظیم انبیاء جتنے ہیں اُن کے رُوحانی واقعات اندر اندر سے ایک جیسے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر سلیمانؑ کے بادشاہ ہونے کا ذکر ملتا ہے آسمانی کتاب میں، تو اِس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہی تنہا سلیمان ہی ایسے تھے اور باقی انبیاء و ائمہ اِس رُوحانی سلطنت سے عاری ہیں، یہ بات ہرگز ایسی نہیں ہے۔ بلکہ رُوحانی سلطنت ہر کامل انسان کو عطا ہوتی ہے اور اِسی طرح حضرت نوحؑ پر جو آزمائش آئی اور جس طرح سے آپ کے زمانے میں ایک طوفان برپا ہوا یہ بھی رُوحانی پہلو سے دیکھا جائے، تو کوئی منفرد واقعہ نہیں ہے بلکہ عام اور مشترک سی بات ہے، کہ آپ جب رُوحانی پہلو سے جھانکنے لگیں گے، تو اُس وقت پتہ چلے گا کہ ہر پیغمبر کے سامنے ایک رُوحانی طوفان برپا تھا اور اِسی بناء پر آنحضرتؐ نے اپنی پاک اولاد کی تشبیہ کشتیٔ نوح سے دی ہے کہ اگر ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی طوفان برپا نہ ہوا ہوتا تو کشتی کا ذکر یہاں بے جا ہوتا، ایسا نہیں ہے۔ رُوحانی طوفان ہر وقت ہے اور نہ یہ بات صحیح ہے کہ صرف موسیٰؑ کلیم اللہ تھے جو خدا سے کلام کر سکتے تھے اور باقی بڑے انبیاء نہیں کر سکتے تھے یہ بات بھی نہیں ہے اور نہ یہ صحیح ہے کہ ہم صرف حضرت عیسیٰ کو رُوح اللہ مانیں خدا کی رُوح، حالانکہ ہر پیغمبر میں بلکہ ہر امام میں بھی خدا کی رُوح ہوتی ہے۔ کیونکہ رُوح سے مراد نور ہے اور نور ہر پیغمبر میں اور ہر امام میں ہوتا ہے جو نور ہوتا ہے وہی رُوح ہوتی ہے، تو اِس سے ظاہر ہے کہ رُوحانی طور پر تمام احوال مشترک ہیں۔

اب رہا سوال صبر کا کہ صبر کے سلسلے میں بھی یہ لازمی بات ہے کہ راہِ رُوحانیت میں صبر سے فائدہ اُٹھانے کے لئے بلاؤں کا نزول ضروری ہے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی پیغمبر ظاہری قصے سے قطع نظر جب رُوحانی طور پر جب دیکھتے ہیں تو تمام پیغمبروں کو خدا کی آزمائشوں میں مبتلا پاتے ہیں اور اِسی میں عظیم حکمت پوشیدہ ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا سب حضرات کو، سب کامل انسانوں کو صبر کے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اور ساری رُوحانیت بلاؤں سے، آفتوں سے اور آزمائشوں سے پُر ہوا کرتی ہے، لہٰذا امن وسکون کی منزل کو پانے کے لئے صبر کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب رہا کہ اللہ تعالیٰ نے جو بنی اسرائیل پر من وسلویٰ نازل کیا تو یہ بھی کوئی خاص بات نہیں ہے، اگر ہم تاویل کو دیکھتے ہیں تو اِس میں یوں لگتا ہے کہ سلیمان پیغمبر کے ساتھ کوئی خاص بات ہے، نوحؑ کے ساتھ کوئی خاص بات ہے اور یوسفؑ کے ساتھ کوئی خاص بات ہے، ابراہیمؑ کے ساتھ کوئی خاص بات ہے۔ لیکن جب تاویل میں جاتے ہیں تو اُن کی رُوحانیت بالکل مشترک ہوتی ہے اور سارے واقعات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ چنانچہ من وسلویٰ کا تعلق کوئی ظاہری نعمت نہیں تھی، وہ جلالی غذائیں تھیں اور رُوحانیت کی (energies) تھیں، جن کے بارے میں ہم نے بارہا عرض کیا ہے اور آج بھی سامنے ایک چھوٹا سا مقالہ بن رہا ہے اُس میں بھی یہ ذکر آئے گا کہ قوتیں، رُوحانی قوتیں لطیف جسم کی صورت میں دو طرح سے آتی ہیں۔ قوتوں کا ایک سلسلہ سَر کی طرف سے نازل ہوتا ہے، دوسرا سلسلہ پاؤں سے داخل ہوتا ہے، تو انسان کی مثال درخت بھی ہے، حیوان بھی ہے، پہاڑ بھی ہے،

آسمان بھی ہے کیونکہ انسان سب کچھ ہے کیونکہ انسان اِس ساری کائنات کا نچوڑ ہے لہٰذا اِس میں تمام چیزوں کی خاصیتیں جمع ہیں ۔لہٰذا اِس سلسلے میں انسان ایک درخت کی طرح بھی ہے،جس طرح درخت کی غذا دو طرح سے حاصل ہوتی ہے ۔ ایک یہ کہ اُس کی جڑوں سے اُس کی(energies) داخل ہو جاتی ہیں،ایک یہ کہ جو لائٹ ہے جو(heat) ہے اور جو ہوا ہے (oxygen) ہے وغیرہ ، وہ اُوپر سے آتی ہیں ۔ بالکل اِسی طرح سے رُوحانیت کا ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ اُس میں انسان،مومن، درخت کی طرح بن جاتا ہے،تو اُس میں (energies) پاؤں سے اور سَر سے داخل ہو جاتی ہیں ۔کہنا یوں ہے کہ بنی اسرائیل کو جو نعمت حاصل ہوئی تھی وہ ہر زمانے میں حاصل ہوتی ہے لیکن (interpretation) کا اِس میں فرق ہے،لفظوں کا فرق ہے، معنی میں اور تاویل میں کوئی فرق نہیں ہے،تو یہی (energies) جو کسی رُوحانی کو ایک خاص وقت کے لئے،ہمیشہ کے لئے نہیں ،جس طرح بنی اسرائیل کے لئے ایک عرصۂ دراز تک یہ چیز نہیں ملا کرتی تھی ، اِس کا ایک خاص محدود وقت ہوتا ہے،اُس محدود وقت میں یہ چیز ملتی تھی پھر کسی بہانے سے اِس کو اُٹھا یا گیا۔ بہانہ لوگوں کی طرف سے ہے اور قانون اللہ کا ہے،اِس طرح کسی فرد کو بھی اگر اِس کا تجربہ ہوتا ہے تو وہ زندگی بھر نہیں ہوتا ہے،کہنا یہ ہے کہ یہ ساری نعمتیں دوسرے مومنین کو بھی حاصل ہوتی رہتی ہیں،تو اللہ کی سنت ایک جیسی ہے اندر اندر سے،تو یہ آپ کے اِس عمدہ سوال کا جواب ہے،شکریہ۔اب میرے خیال میں وقت کا بھی تقاضا ہے ۔

ٹرانسکرائب:امین رحمانی ٹائپنگ: اکبر علی پروف:نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: سورۂ فرقان

کیسٹ نمبر: Q-40　　　تاریخ: ۱۳/اکتوبر ۱۹۸۳ء کراچی

سورۂ فرقان کے بارے میں کچھ وضاحت کرتے ہیں۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

"تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا" (۲۵:۱) بہت برکت والا ہے خدا جس نے اُتارا قرآن اپنے بندے پر تاکہ اہلِ جہان کے لئے ڈرانے والا ہو۔ اِس مقدّس آیت میں سب سے پہلے برکت کے بارے میں دو چار باتیں عرض کرتے ہیں، اُس کے بعد فرقان کے بارے میں، تو برکت ایک اشاراتی معنی ہیں اور اِس میں بہت سی چیزوں کی طرف اشارہ ہے اور برکت کا مطلب ہے رزق ہو یا اور کوئی فائدے کی چیز، اُس کا سلسلہ جاری رہنا۔ دو مثالیں دی گئی ہیں برکت کے بارے میں یعنی برکت کا تصور ایک تو آسمان سے جس طرح پانی برستا ہے، بارش برستی ہے اور اُس کے نتیجے میں زمین سے کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں، لاتعداد اور بے شمار چیزیں، اِسی طرح برکت کی مثال سمجھائی گئی ہے اور برکت کی دوسری مثال اِس طرح سے بیان کی گئی ہے کہ خداوندِ عالم نے سیارۂ زمین کو سب سے پہلے پیدا کیا تو صرف زمین ہی کو پیدا کیا، اُس پر نہ تو پانی تھا اور نہ پہاڑ تھے، نہ نباتات اور درخت، جانور وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا، تو سب سے پہلے صرف زمین ہی کو پیدا کیا اور اُسی کے ساتھ ساتھ خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ اُس نے پہاڑوں کو پیدا کیا اور اُن میں طرح طرح کی برکتیں رکھیں۔ اب اِس بیان سے سمجھنے والا بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ خالی پہاڑ کے بعد جو کچھ پہاڑ میں پیدا ہوتا ہے، وہ اُس کی برکت ہے۔ مثلاً طرح طرح کی معدنیات، جنگل، گھاس، جڑی بوٹیاں، چشمے اور پانی کا جاری رہنا پھر جنگلی اور اہلی [گھریلو] جانور سب جو وہاں پر چرتے ہیں، یہ سب چیزیں پہاڑ کی برکتوں میں سے ہیں اور خوبی کی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک دفعہ کی چیز نہیں ہے، یہ ایک سلسلہ ہے، تو قرآن میں یہ دونوں مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ اِن دونوں مثالوں سے جو رُوحانی اور عقلی یا علمی برکت ہے، اُس کے بارے میں کوئی سمجھنے والا سمجھ سکتا ہے، تو یہاں پر خدا جو ارشاد فرماتا ہے کہ وہ بڑا برکت والا ہے، اِس سے صرف مادّی برکتیں مراد نہیں ہیں بلکہ اِس سے عقلی علمی اور رُوحانی برکتیں سب سے بڑھ کر ہیں، تو اِنہی معنوں میں خدا بڑا برکت والا ہے اور اِس میں خاص کر یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسان کے لئے جسم

سے بڑھ کر رُوح کی ضرورتیں چاہئیں اور رُوح سے بڑھ کر عقل کی ضرورتیں چاہئیں۔ سو خداوندِ عالم کا یہاں یہ اشارہ ہے کہ وہ عقلی علمی اور رُوحانی برکتوں والا ہے اور اِس کے لئے اُس نے جس طرح کہ خدا نے مادّی طور پر کوئی بھی چیز اپنی ذات سے وابستہ نہیں رکھی ہے، ہر برکت کے لئے اور ہر ضرورت کی تکمیل کے لئے اُس نے ایک (source)، ایک ذریعہ مہیّا کیا ہے، اِسی طرح عقلی اور رُوحانی برکتوں کے لئے بھی اُس نے پیغمبر اور امام کو مقرّر فرمایا ہے جو خدا کی طرف سے وسیلہ ہیں، تو برکت کی کچھ ایسی تشریح ہے۔

اُس کے بعد: ''نَزَّلَ الْفُرْقَانَ'' (۱:۲۵) کا مطلب ترجمہ کرنے والے نے فرقان کا ترجمہ قرآن کر دیا ہے۔ لیکن قرآن کا جو مرتبہ ہے، قرآن کی جو عظمت ہے، قرآن کی جو شان ہے وہ اپنی جگہ پر صحیح ہے کسی شک کے بغیر لیکن آپ قرآن میں لفظِ فرقان کی تحقیق کریں گے یا تلاش کریں گے، تو آپ کو فرقان کوئی اور چیز ملے گی۔ فرقان لفظی معنی میں حق اور باطل کے درمیان فرق و امتیاز کرنے والا معجزہ ہے، تو اگر ہر فرقے کے لئے اور ہر شخص کے لئے قرآن یہ کام کرتا، حق اور باطل کے درمیان، نور کے بغیر قرآن یہ کام کرتا تو آج اسلام کے اتنے سارے فرقے نہیں بنتے۔ کیونکہ قرآن جہاں فرقان ہے، قرآن جہاں لوگوں کو حق اور باطل کے درمیان فرق بتا سکتا ہے، اور غلط کو غلط قرار دیتا ہے اور صحیح کو صحیح بتاتا ہے، تو پھر اتنے سارے فرقے کیوں ہو گئے؟ یہ بات نہیں ہے۔ فرقان اپنے وقت میں رسولؐ کی ذات سے وابستہ تھا اور رسولؐ کے بعد فرقان کا جو معجزہ ہے وہ امامؑ کی ذات سے وابستہ ہے۔ فرقان کا تعلق جماعت سے بھی ہے یعنی وہ جماعتی طور پر بھی بحیثیتِ مجموعی بتا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے اور افراد کو بھی بتا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا یہ امامؑ کی ذات سے وابستہ ہے، امام ہو تو فرقان جو حق اور باطل کے درمیان فرق و امتیاز کرنے والا معجزہ ہے، وہ کسی فرد کو، کسی گروہ کو بتا سکتا ہے اور ویسے تو فرقان جیسا میں نے کہا کہ انفرادی طور پر بھی اِس کا تعلق ہے، تو ایک مومن جب رُوحانی طور پر آگے سے آگے بڑھتا ہے، ترقّی کرتا ہے، عبادت و بندگی میں خوب خوب ترقّی کرتا ہے تو امام کی مہربانی سے جو خدا کا نور ہے، اُس کی روشنی میں مومن کو اِس فرقان کے معجزے کی بدولت یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کون سا کام وہ غلط کر رہا ہے اور کون سا کام وہ صحیح کر رہا ہے۔ فرقان کے ایسے معنی ہیں اور یہاں پر جو فرقان کا ذکر ہے اور اُس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ خدا نے اپنے بندے پر فرقان کو نازل کیا (۱:۲۵) تو وہ رُوحانیت کا معجزہ تھا اور اُسی میں قرآن بھی تھا، اُسی میں رُوحانیت بھی تھی، تو رسولؐ کے لئے قرآن کا فرقان ہونا کوئی شک نہیں ہے، لیکن پیغمبر اور امام علیہما السّلام کے بغیر قرآن کا کسی کے لئے فرقان ہونا یہ بعید از قیاس ہے۔

اِس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد ہے: ''اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا'' (۲:۲۵) اللہ وہ ہے جو بلندی و

پستی کا بادشاہ ہے اور بلندی و پستی کی بادشاہی اُسی کے لئے ہے، اور اُس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ اُس کی بادشاہی میں کسی کی شرکت ہے اور اُسی نے پیدا کیا ہر چیز کو اور ہر چیز کے لئے اُس نے ایک اندازہ مقرر کیا، یہ مختصر ترجمہ ہے۔ اِس کی تشریح اِس طرح سے ہے کہ اللہ کی ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی، اور اُس نے کوئی اولاد نہیں لی کسی کو اولاد نہیں بنایا یعنی اُس کی کوئی اولاد نہیں اور اُس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں، اِس کا مطلب ہے کہ خدا کی کوئی اولاد نہیں۔ اب اولاد کے نہ ہونے کا مطلب صرف یہی نہیں کہ اُس کی کوئی بیوی نہیں اور تولید کے طور پر اُس کا کوئی فرزند نہیں، صرف یہ نہیں اِس میں دوئی کی نفی کی جاتی ہے، کہ اللہ ایک ہی ہے اور اُس کے اجزاء نہیں یعنی اِس میں یک حقیقت کا اشارہ ملتا ہے کہ اللہ جو درجہ ہے، اللہ جو مرتبہ ہے، اللہ جو سب سے اُونچی حقیقت ہے، وہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ وہ ساری حقیقتوں کی نمائندگی کرتی ہے یا ساری حقیقتوں کو پیش کرنے کے لئے وہ ایک ہی حقیقت کافی ہے۔ جیسے کبھی ہم نور کی مثال کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ہم فرض کریں کہ دو نور ہیں یا تین نور ہیں تو اِس دُوئی اور سہہ کے تصور سے نور کے متعلق نقص پایا جائے گا، اُس کی تنقیص ہوگی یعنی اُس کی کوئی تعریف نہیں ہوگی۔ کیونکہ نور ایک کی بجائے کیسے دو ہوں اور کس طرح تین ہوں۔

دیکھیں کہ مادّی قسم کی جو روشنی ہوتی ہے تو ایک کمرے کی چار دیواری میں آپ جو ٹیوب لگاتے ہیں یا جو بلب لگاتے ہیں، وہ اُن دیواروں سے گزر کر دوسرے کمرے کو نہیں پہنچ سکتا، اِس لئے ہر کمرے میں ایک سے زیادہ بلب چاہئے، ٹیوب چاہئے اور خدا نے جب فرمایا کہ: ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ'' (۳۵:۲۴) یہ بیان اِس طرح سے ہے کہ اِس بیان سے کوئی چیز باقی نہیں رہتی ہے۔ گو کہ الفاظ بہت ہی مختصر ہیں لیکن آسمانوں اور زمین کے کہنے کے بعد پھر کوئی چیز، کوئی جگہ، کوئی مقام باقی نہیں رہتا، جب وہ ایک اکیلا پوری کائنات کے لئے ایک کافی نور ہے، تو پھر دوسرا نور کہاں ہوسکتا ہے، پھر قرآن ہی نے یہ کیوں بتایا کہ اُس نے ایک نور کو بھیجا ہے جو رسولؐ کی طرف اشارہ کیا۔ پھر بعد میں یہ کیوں فرمایا کہ خدا کو مانو اور رسول کو مانو تا کہ وہ تمہارے لئے ایک نور مقرّر کرے، یہاں پر امام کا ذکر ہے (۵۷:۲۸)۔ خود ہی فرماتا ہے کہ وہ کافی نور ہے کائنات کے لئے پھر کہتا ہے کہ اُس نے ایک نور کو بھیجا اور تیسرے نور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام کو کہتا ہے۔ لیکن یہ مثالیں ہیں ہم اِس کو اِس طرح سے نہیں مانیں گے، ہم صرف ایک ہی نور کو مانیں گے، خواہ وہ ایک نور خدا ہو یا پیغمبر ہو یا امام ہو، ہم تین انوار کو نہیں مانیں گے اور اگر ہم دو نور کو مانیں تو پھر جو دوسرا نور ہے جو پہلے سے کمتر ہے چھوٹا ہے اور جس نے اِس کو بھیجا ہے، تو پھر یہ نور اُس بڑے نور کے بیٹے کی جگہ پر ہوگا۔ اِس معنیٰ میں تو خدا کے بیٹے ہونے کا تصور ہوگا، جب کہ قرآن اِس بات کی بار بار نفی کرتا ہے کہ اُس کا کوئی بیٹا نہیں ہے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تولید کے طور پر بیٹے کا ذکر نہیں ہے بلکہ اِس میں دوئی اور سہہ کا ذکر ہے، اِس طرح سے بھی دو نہیں ہے بس جیسا بھی ہے اور جس طرح ہے ایک ہی نور ہے، ایک ہی خدا ہے، تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ ایک ہی ذات ہے، ایک ہی مرتبہ

ہے جس کے مختلف نام ہو سکتے ہیں، کئی نام ہو سکتے ہیں لیکن ناموں کی کوئی بات نہیں، ذات کی بات ہے کہ ذات ایک ہی ہے ۔لہٰذا یہاں جو فرمایا گیا ہے کہ اُس کا کوئی بیٹا نہیں تو اِس سے دوئی مراد ہے کہ بس کوئی نہیں ہے ایک ہی ہے، اور مطلب یہ کہ خدا اور رسولؐ اور امام کا نور بلکہ اِن تین ناموں کی حقیقت ایک ہی ہے۔

کبھی کہا جاتا ہے اللہ، یہ تو تعلیم کی چیز ہے، تصور کی چیز ہے اور کبھی فرمایا جاتا ہے رسول، کبھی کہا جاتا ہے امام لیکن یہ مختلف مراتب نہیں ہو سکتے ہیں جو قوتوں کے ساتھ، صفات کے ساتھ اور اختیار کے ساتھ صرف ایک ہی ذات ہو سکتی ہے اور ایک ہی حقیقت ہے، بس ایک ہی حقیقت ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں بھی خدا کے بیٹا نہ ہونے کا ذکر آئے گا تو ہم اُس کی یوں تاویل کریں گے کہ بس ایک ہی ذات ہے، ایک ہی نور ہے اور کوئی منطق نہیں بنتی ہے کہ ہم دوئی کو مانیں اور قطعاً نہیں، خواہ وہ مقام ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ'' (۱۱۲:۱) ہے یا کوئی اور آیت ہے۔ اِس میں اہلِ ظاہر صرف تولید کو لیتے ہیں اور باقی دوسرے معنوں میں جو اولاد کا تصور ملتا ہے اُس کو نہیں سمجھتے ہیں، جیسا میں نے کہا کہ اگر ایک بڑا نور ہے اور اُس کا ایک نمائندہ نور ہے، تو اِس میں بھی بیٹے کا تصور ہو گیا، اِس میں کیا فرق ہے۔ اِس سے ہٹ کر اگر تولید اور بیٹے کے تصور کو لیتے ہیں تو ہمیں ذرا گہرائی میں جا کر سوچنا ہو گا کہ خدا بیٹے کی نفی کیوں کرتا ہے، اصل میں اِس کے پس منظر میں خدا اِس بات کی نفی کرتا ہے کہ جب وہ ہمہ رَس ہے، جب وہ کافی ہے، جب وہ ہر جائی ہے، جب وہ (omni present) ہے، جب وہ مرتا نہیں ہے، جب اُس پر کوئی ایسا وقت نہیں گزرا کہ جس میں وہ نہ ہو۔ لہٰذا پھر دوسرے کسی کی کیا ضرورت ہے، صرف لفظ بیٹے سے کسی اور معنی میں نفرت نہیں ہے، یہ صرف دوئی کے معنی میں ہے، دو کے ہونے کے معنی میں ہے۔ اصل بیان بیٹے کا نہیں ہے، اِس میں خدا کی ذات میں کمزوری آتی ہے، کہ خدا ہو اور اُس کا کوئی نمائندہ قرار پائے پھر خدا ایک کام کرے اور دوسرا کام نہیں کر سکے، یہ بات نہیں ہے۔

اِس لئے خدا بار بار دوئی کی (duality) کی نفی کرتا ہے اور بیٹے کی نفی کرتا ہے۔ لیکن اہلِ ظاہر اِس سے گہرائی میں نہیں اُتر سکتے ہیں اور نہ جا سکتے ہیں اور نہ اِس سمندر میں غوطہ زنی کر سکتے ہیں، وہ بس صرف بیٹے کے پہلو کو لیتے ہیں، اور اِس کی وجہ کو نہیں سمجھتے ہیں کہ خدا بیٹے کے ہونے سے کیوں نفی کرتا ہے، تو دیکھیں دنیا میں ایک عام آدمی کے بیٹے ہونے اور نہ ہونے میں کیا مسائل حل ہوتے ہیں اور کیا مسائل اُلجھ جاتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ایک انسان کے لئے بیٹے کا ہونا اِس لئے ضروری ہے کہ ایک وقت میں اُس پر ضعف آئے گا، کمزوری آئے گی، بڑھاپا آئے گا، اُس میں بیٹے کی ضرورت ہو گی اور ویسے جوانی میں بھی ایک کام باپ کر سکے گا پھر دوسرے کو نہیں کر سکے گا، لہٰذا بیٹے کا ہونا اِس صورت میں بھی ضروری ہے اور ایک خاص صورت کہ ایک مقرر وقت کے بعد باپ گزر جائے گا، مر جائے گا اور بیٹا اُس کی جگہ کو لے گا، تو اِس لئے بیٹے کا ہونا ضروری ہے اور جو نہ ہو تو یہ سارے مسائل اُلجھ جائیں گے۔ دیکھ لیا آپ نے! لیکن خدا کے سامنے کیا بیٹا اور کیا

شریک، کیا مددگار اور کیا دوسرا کوئی، سب ایک جیسے ہیں۔ آخر کار بیٹے کی مثال بنتی ہے کہ اگر خدا کا کوئی وزیر ہو تو، خدا کا کوئی مددگار ہو تو، خدا کا کوئی نمائندہ ہو تو پھر وہی بات بنے گی۔ جیسے دنیا میں باپ بیٹے کی مثال بنتی ہے، لہٰذا یہاں باپ بیٹے کی مثال میں ہم خدا کی ہر قسم کی دوئی کی نفی کریں گے یعنی کہیں گے کہ خدا کی ذات ایک ہی ہے، بس ایک ہی ہے اور یہ سب کچھ مثالیں ہیں یا آزمائشیں ہیں یا ظاہری صورت ہے لیکن حقیقتِ حال جو ہے وہ وحدت ہے۔ لہٰذا کہنے دیجئے کہ امام نے جو ہمیں تصور دیا ہے مونو ریالزم کا، یک حقیقت کا تو وہ یک حقیقت جو ہے وہ صحیح ہے۔ صوفیوں نے اِس یک حقیقت کو اِس طرح سے لیا کہ حقیقتُ الحقائق، تمام حقیقتوں کی ایک حقیقت کو تسلیم کیا یعنی تمام حقیقتوں کی ایک حقیقت ہے اور اُس میں سب حقیقتیں ایک ہیں، لہٰذا وہ حقیقت اپنی ذات میں کسی چیز کی محتاج نہیں اور وہ سب کچھ ہے۔ چنانچہ اِسی کے مطابق یہ تو صوفیوں کا تصور ہوا اور ہمیں جو امام نے تصور دیا ہے وہ یک حقیقت ہے یعنی ایک ایسی حقیقت ہے کہ اُس میں سب حقیقتیں ہیں، کبھی وہ حقیقتیں الگ بھی نہیں ہوئیں تو اُس میں سب کچھ موجود ہے۔

دیکھیں کہ اِسی کے ساتھ ہم ذرا مزید تشریح کریں کہ خدا کی ذات سے ازل میں یا کسی بھی وقت کوئی چیز کس طرح جدا ہو سکتی ہے۔ آپ سوچیں کہ اِس کی کوئی منطق نہیں بنتی ہے، اِس کی کوئی (logic) نہیں بنتی ہے۔ خدا کی ذات سے کس طرح کوئی حقیقت باہر آئی، کیا اور کس چیز کی تلاش کے لئے ایک رُوح کہیں یا ایک انسان کہیں یا کوئی حقیقت کہیں، کس طرح کوئی خدا کی ذات سے، خدا کے نور سے اور اُس اصل سرچشمے سے کوئی چیز کس طرح دنیا میں آئی، کیوں؟ اگر کوئی کہے کہ وہاں کوئی چیز نہیں تھی اور اُس چیز کی تلاش کے لئے کوئی حقیقت خدا سے الگ ہو کر دنیا میں آئی تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر کوئی کہے کہ خدا کی ذات کے ساتھ واصل ہوتے ہوئے کسی رُوح نے کوئی گناہ کیا اور جس کے جرم میں، جس کی پاداش میں وہ رُوح دنیا کی طرف دھکیل دی گئی، یہ بات بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ آپ کوئی وجہ نہیں بنا سکتے ہیں کہ خدا کی ذات سے کوئی حقیقت باہر آئے اور کیسے ہو سکتا ہے، کہ خدا کی ذات سے ایک چیز باہر آئے اور وہاں پر ایک وقت کے لئے خلا پیدا ہو جائے اور پھر ایک مدّت کے بعد وہ چیز واپس جا کر وہاں ملے اور اُس خلا کو پُر کرے۔ اگر ہم ایسا مانیں تو یہ بات ایسی ہوگی کہ خدا کی ذات یا کہ اُس کا نور کبھی گھٹ جاتا ہے اور کبھی پُر ہو جاتا ہے، کبھی اُس میں خلا پیدا ہو جاتا ہے، کبھی وہ خلا پُر ہو جاتا ہے، کبھی اُس میں کمی پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی وہ کمی پُر ہو جاتی ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے اور اِس کے لئے کہا گیا: ''ماآمده نیستیم این سایهٔ ما ست'' صوفیوں نے اچھا کہا، مولائے رُوم نے درست کہا کہ ہم حقیقت میں وہاں سے آئے کہاں ہیں، یہ تو ہمارا ایک سایہ ہے۔ اِس لئے خدا کی ذات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے اور نہ اُس سے کوئی چیز الگ ہو سکتی ہے، تو اُس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں اور ہر چیز کو اُس نے پیدا کیا۔ اُس نے دو عالم پیدا کئے، ایک عالم مادّیت ہے جو یہ جہان ہے، جس کو عالمِ خلق کہا جاتا ہے۔ ایک عالمِ رُوحانیت ہے جو وہ جہان ہے، جس کو عالمِ امر کہا جاتا ہے۔ عالمِ امر ہمیشہ منظّم ہے اور ہمیشہ

ایک ہے، اُس میں سب کچھ ہے مگر کسی نہ کسی طرح وہاں کی ہر چیز کا ایک سایہ بنتا ہے۔ سایہ سے مراد یہ جسم ہے، اِس جہان میں جو کچھ ہے وہ سایہ ہے، عالمِ امر کی چیزوں کے سائے ہیں، یہاں اگر کوئی لذّت ہے، تو وہ بھی اُس جہاں کی لذّت کا ایک سایہ ہے، یہاں اگر کوئی عقل ہے، تو وہ بھی اُس جہان کی عقل کا ایک سایہ ہے، یہاں اگر کوئی رُوح ہے تو وہ بھی اُس جہان کی دائمی اور اصل رُوح کا ایک سایہ ہے، (shadow) ہے۔ جس طرح ہم مادّی طور پر مثال دیتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ دیکھئے کہ اِس جہان میں آپ کے سامنے یہ ایک ٹی وی ہے، مثال کے طور پر یہ ایک سایہ ہے اپنے اسٹیشن کا جہاں پر منظّم طریقے سے ہر چیز ہے اور اِس کا ایک سرچشمہ ہے، اِس کا ایک (source) ہے اور (source) کے ساتھ اِس کا (link) ہے، یہ اپنے (source) کے ساتھ مربوط ہے۔ سورج کو دیکھئے کہ کائنات کے وسط میں واقع ہے، وہ ایک سرچشمہ ہے روشنی کا، اور طاقتوں کا، اور حرارت کا، اور دیگر (energies) کا۔ دیکھیں کہ اُس سے باہر تمام چیزیں بکھر جاتی ہیں لیکن اُس میں سب چیز جو سورج سے بنتی ہیں، کیا حرارت، کیا کرنیں، کیا (energies) وغیرہ وہاں پر ایک ہیں۔ اِسی طرح عالمِ امر جو ہے وہ ایک منظّم ہے وہ ایک موتی کی طرح ہے، اُس میں سب ایک ہیں لیکن وہاں سے جو کرنیں پھوٹتی ہیں اُسی کے ساتھ دنیا کی کثرت بنتی ہے، دنیا کی چیزیں بنتی ہیں، مخلوقات بنتی ہیں۔ لہٰذا ہم سائے کو کیوں نہ مانیں، تو قول ہے کہ لوگ اِس جہاں میں سوئے ہوئے ہیں، جب وہ مرجائیں گے تو جاگ اُٹھیں گے [الناسُ نیامٌ فإذا ماتُوا انتبَهوا]۔ قرآن میں مر کر دوبارہ زندہ ہوجانے کو بعث کہا گیا ہے، ب۔ع۔ث اور بعث جو ہے وہ مثال کے طور پر بیدار ہوجانے کی طرح ہے یعنی شعور کے اعتبار سے، زندگی کے اور احساس کے اعتبار سے، وہ زندگی اِس زندگی کے مقابلے میں بیداری ہے اور یہ زندگی اُس زندگی کے مقابلے میں خواب ہے، تو دو باتیں ہوگئیں۔ اصل چیز وہ ہے جو عالمِ امر میں ہے، یہ اُس کا سایہ ہے اور اصل زندگی وہ ہے اور یہ زندگی مقابلتاً موت کی طرح ہے، اور خواب کی طرح ہے، اصل شعور اُسی میں ہے اور اصل بیداری اُسی میں ہے، تو میں عالمِ امر کی بات کرتا تھا اور عالمِ خلق کی اور یہ ارشاد کہ خدا نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کیا، یعنی دنیا میں ہر چیز کے لئے ایک وقت دیا گیا، خواہ جمادات ہیں، نباتات ہیں، جانور ہیں، انسان ہیں کسی کو اِس عالمِ خلق میں دائمی طور پر رہنا نہیں ہے اور کم و بیش ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کیا گیا۔

پھر نمبر ۳ آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ''وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا'' (۳:۲۵) خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے کہ جو اہلِ باطل ہیں اُنہوں نے معبودِ برحق کے سوا خداؤں کو لیا حالانکہ وہ ایسے ہیں کہ کسی بھی چیز کو پیدا نہیں کرسکتے ہیں اور وہ خود پیدا کئے گئے ہیں، وہ اپنے لئے نہ نفع کے مالک ہیں اور نہ ضرر کا، اُن کو اپنی موت و حیات پر کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ مر کر دوبارہ زندہ ہوجانے کا اُن کو کوئی اختیار ہے۔ میں اگر ایک حقیقت یہاں بیان کروں تو آپ

کے لئے وہ انوکھی نہیں ہوگی، یہ کہ خدا کی تاویل امام ہے، رُوحانی طور پر امام ہی ہدایت دیتا ہے، بصیرت عطا فرماتا ہے، سماعت دیتا ہے، اور رُوح ورُوحانیت عطا کرتا ہے، رُوحانی رزق دیتا ہے اور رُوحانی تخلیق اُسی کی بدولت مکمل ہوجاتی ہے اور جولوگ امامؑ کی جگہ پر کسی اور کو امام بناتے ہیں، وہ رُوحانی تخلیق سے خالی ہے، عاری ہے، وہ رُوحانی طور پر نہ چشم بصیرت عطا کرسکتا ہے، نہ ہدایت دے سکتا ہے، نہ عقل اور رُوح کے لئے کوئی رزق اور خوراک، طاقت عطا کرسکتا ہے، کچھ بھی نہیں کرسکتا ہے اور نہ وہ اپنے لئے کچھ ضرر کرسکتے ہیں، نہ نفع کرسکتے ہیں، نہ وہ رُوحانی موت کے مالک ہیں، نہ وہ رُوحانی زندگی کے مالک ہیں۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں تخلیق کا ذکر آتا ہے، پیدا کرنے کا ذکر آتا ہے، نفع نقصان کا ذکر آتا ہے، رزق کا ذکر آتا ہے، تو اِس سے مراد رُوحانی چیزیں ہیں جو امامؑ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اِس میں ظاہری اور جسمانیت کی باتیں نہیں ہیں، رُوح اور رُوحانیت کی باتیں ہیں اور رُوح ورُوحانیت میں سب کچھ امامؑ ہی کرسکتا ہے۔

''وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ''(۴:۲۵) تو زمانۂ نبوت میں لوگوں نے آنحضرتؐ کی نبوت ورسالت کے لئے اقرار نہیں کیا بلکہ انکار کیا، یہ کہتے ہوئے کہ یہ جھوٹ ہے اور افترا ہے، بنایا گیا ہے اور اُس کے بنانے میں کچھ دوسرے لوگوں کی مدد ہے۔ پھر خدا ارشاد فرماتا ہے کہ: ''فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ''(۴:۲۵) اِس سلسلے میں اُنہوں نے ظلم اور جھوٹ کا کام کیا، ظلم کیا اور جھوٹ بولا۔ ''وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا'' (۵:۲۵) اور اُنہوں نے کہا کہ یہ تو پُرانی کہانیاں ہیں جو لکھ لیا گیا ہے اور وہی صبح وشام پڑھی جاتی ہیں۔ ''قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ''(۶:۲۵) اے رسول آپ کہئے کہ اِس قرآن کو کسی اور نے نہیں بلکہ اُس خدا نے نازل فرمایا جو آسمان کی چھپی باتوں کو اور زمین کی چھپی باتوں کو جانتا ہے۔ ''اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'' (۶:۲۵) وہ بخشنے والا ہے اور مہربان ہے۔

''وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ''(۷:۲۵) اور اُن کافروں نے یہ بھی کہا کہ اِس پیغمبر کو کیا ہوا ہے کہ خود کو پیغمبر کہلاتا ہے حالانکہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اگر یہ پیغمبر ہوتا تو اِس کے ساتھ کوئی فرشتہ مقرر ہوتا، اِس پر کوئی فرشتہ نازل ہوتا اور وہ فرشتہ ہمیشہ لگا رہتا اور اِس کے ساتھ وہ فرشتہ ڈرانے والا ہوتا۔ اِس میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ قرآن میں آپ کو رسولوں سے جن لوگوں نے انکار کیا، اُس انکار کے بارے میں ایک عام مشترکہ بات آپ کو ملے گی، یعنی جب آپ یہ تحقیق کرنے لگیں گے، کہ اللہ کے حضور سے جتنے بھی انبیاء دنیا میں آئے ہیں، اُن لوگوں کی رسالت ونبوت سے بہت سے

لوگوں نے انکار کیا، آخر اِس انکار کی وجہ کیا ہے؟ جب آپ اِس حقیقت کی جستجو کریں گے تو آپ کے سامنے یہ بات کھل کر آئے گی اور نمایاں طور پر کہ لوگوں کے سامنے پیغمبروں کی جسمانیت و بشریت بہت عجیب چیز تھی۔ یہاں بھی اُس کی ایک بات ہے، الفاظ کچھ الگ ہیں مگر مفہوم و مطلب وہی ہے یعنی یہ کہہ رہے ہیں کہ اِس پیغمبر کو کیا ہوا ہے یعنی یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کے نزدیک، اُن کی منطق کے نزدیک، اُن کی منطق کے مطابق رسول کو، پیغمبر کو نہ تو کوئی کھانا کھانا چاہئے اور نہ کہیں بازار میں چلنا پھرنا چاہئے۔ وہ اپنی کسوٹی کے مطابق دوسری بات کو بھی بیان کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ رسولؐ کے ساتھ ایک دکھاتا ہوا فرشتہ کیوں نہیں ہے تاکہ وہ فرشتہ اِس رسولؐ کا معجزہ بھی قرار پائے اور وہی فرشتہ لوگوں کو ڈراتا پھرے، دیکھیں کہ اِنہوں نے یہ بات کہاں سے نکالی اور کیسے سوچا۔ حالانکہ انسانوں کے لئے ایک انسان کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہئے، خدا کی حکمت و مصلحت یہ ہے۔ ہم دین کی روشنی میں جہاں تک جانتے ہیں، جہاں تک سمجھتے ہیں، اُس کے مطابق اگر ایک ایسے فرشتے کو نبی یا ہادی بنا کر بھیج دیا جاتا، جس کا بنیاد سے نفس ہی نہ ہو، نیند نہ ہو، بھوک نہ ہو، پیاس نہ ہو، تھکان نہ ہو، ہر وہ چیز نہ ہو جو ایک انسان میں ہوتی ہے، کیا وہ زیادہ سے زیادہ عملی ہادی ہوتا یا کوئی ایسا کامل انسان جس میں سب کچھ ہونے کے باوجود خدا کی خوشنودی کے پیشِ نظر تمام خواہشات کو پامال کر کے اور نفس کو روندھ کر، راہِ ہدایت پر چل کر لوگوں سے کہا جائے کہ دیکھو اِسی طرح کرو، صحیح (demonstration) یہ ہوتا یا وہ جو ایک فرشتہ ہو تو کوئی عقل کہتی اگر فرشتہ نبی ہوتا کہ اے فرشتہ تو جا، تیری نہ نیند ہے، نہ نفس ہے، نہ وہ مجبوریاں ہیں جو ہم میں ہیں، نہ وہ دشواریاں ہیں جو ہمارے سامنے ہیں، تُو خواہ مخواہ کیوں کہتا ہے کہ یہ کرو اور وہ کرو، تُو کر کے بتا تو ہمارے اندر جو خواہشات ہیں جو تضادات ہیں اُن کو اپنا کر دیکھو۔ کیا کوئی عقل یہ نہیں کہتی، عقل نہیں کہتی تو قانون نہیں کہتا اور صورتِ حال کا تقاضا یہ کہتا۔ لہٰذا خداوند جو احکم الحاکمین ہے، اُس نے انسانِ کامل کو جو مشترک ہے، وہ ایک پہلو سے فرشتہ ہے اور پھر دوسرے پہلو سے بشر ہے، اُن کی کسوٹی سے، اُن کے معیار سے بڑھ کر ایک شخصیت کو نبی اور رسول بنایا، وہ صرف ایک پہلو کی بات کرتے ہیں، فرشتگی کی بات کرتے ہیں، تو کیا کمال اِس میں نہیں ہے کہ ایک ایسی ہستی کو رسول بنایا جائے جو ایک اعتبار سے فرشتہ ہے اور دوسرے اعتبار سے بشر ہے، دونوں ہے، بجائے ایک چیز ہونے کے دو چیزوں کا ایک ساتھ ہونا کیا ہی اچھا ہے۔

سو آج بھی امامؑ سے لوگ، ہمیشہ سے کیوں انکار کرتے ہیں اور انکار کرنے کا آخر سبب کیا ہے؟ بس یہی بشریت ہے، جسم اِن کے سامنے آتا ہے اور کھانا پینا اور اِس کے لوازمات گو کہ ایک ہی چیز کا ذکر ہے لیکن اِس کی تشریح میں ساری چیزیں آتی ہیں، کھانا، پینا، سونا، بیمار ہو جانا، شادی بیاہ، اولاد، کوئی ایک کام کرنا اور دوسرا کام نہیں کر سکنا وغیرہ، وغیرہ۔ اگر کوئی دانشمند ہو تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ ہدایت میں بہت سے نمونے چاہئیں (demonstration) میں، مثال کے طور پر اگر

ہادیانِ برحق دنیا میں آتے اور وہ بیمار نہ ہوتے تو، اُن پر کوئی تکلیف نہ آتی تو، اور وہ کسی بات سے مجبور نہ ہوتے تو، پھر ہدایت کے بہت سے گوشے روشنی ڈالے بغیر رہ جاتے۔ لہٰذا صبر کا موقع، شکر کا موقع، عفو کا موقع اور تکلیف، بھوک، پیاس، مصیبت، موت، ہر چیز اور ہر تکلیف پیغمبروں پر آگئی تا کہ اُس کو جھیلتے ہوئے کیا کرنا چاہئے اور کس طرح کرنا چاہئے تو لوگوں کے سامنے ہدایت کا ایک مکمل نمونہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ حضراتِ انبیاء نے یہ کیا اور یہ بشریت کی بدولت کیا، جسم تھا تو سب کچھ کیا۔ انسان کا جسم ہے اِس لئے ہادی کا جسم ہونا لازمی ہے تا کہ وہ اپنے جسم سے وہ عمل بتائے، وہ نمونہ بتائے، وہ (demonstration) بتائے جو جسمانیوں کے لئے، جسم والوں کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا امامؑ کے پاس ایک ہی نور ہے مگر تین قسم کی روشنی دیتا ہے، عقلی روشنی، رُوحانی روشنی اور جسمانی یا اخلاقی روشنی۔ جسمانی یا اخلاقی روشنی سے مراد وہ نمونۂ عمل جو ہمارے جسم کے لئے ضروری ہے، تو اگر فرشتہ ہوتا تو اُس میں کامل ہدایت نہ ہوتی، کامل اور مکمل ہدایت نہ ہوتی اور زیادہ سے زیادہ انسان سب سے پہلے جسمانی ہدایت کے لئے محتاج ہے کہ جسم کو کس طرح استعمال کرنا چاہئے، جسم کو کس طرح رکھنا چاہئے، جسم کی وجہ سے ہمارے اندر جو خواہشات و میلانات پائے جاتے ہیں، اُن کے لئے کیا کرنا چاہئے، یہ تو امامؑ اپنے جسم سے بتاتے ہیں۔ اِس لئے اُن کفّار کے کہنے میں کچھ معنی نہیں ہیں جو جسم پر، جسمانیت پر اعتراض کرتے ہیں، اُس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور رسول کا بازاروں میں چلنا اور لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا اور ہر کام کرنا رحمت ہے۔

''اَوۡ یُلۡقٰۤی اِلَیۡہِ کَنۡزٌ اَوۡ تَکُوۡنُ لَہٗ جَنَّۃٌ یَّاۡکُلُ مِنۡہَا'' (۸:۲۵) یا اُس پر ایک خزانہ کیوں نہیں ڈالا گیا یا اُس کے لئے مخصوص ایک باغ کیوں نہیں ہے کہ وہ اُس باغ سے کھاتا۔ رسول پر ایک خزانہ ڈالا گیا وہ عقل کا خزانہ ہے، عقل کے موتیوں کا خزانہ ہے، علم کا خزانہ ہے اور رسول کا باغ ہے، وہ باغِ رُوحانیت ہے۔ وہ اُس میں سے کھاتے ہیں، نہ صرف تنہا کھاتے ہیں بلکہ لوگوں کو اُس خزانے کی طرف اور اُس باغ کی طرف ہدایت بھی دیتے ہیں کہ سب لوگ اُس خزانے کو پائیں اور اُس باغ تک رسائی کر سکیں، تو اب آیت کا ایک حصہ رہتا ہے اِس کو کر کے ہم کچھ سوالات کے لئے انتظار کریں گیا۔ ''وَقَالَ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا'' (۸:۲۵) اور ظالم لوگوں نے مومنوں سے کہا کہ تم لوگ بس ایک ایسے شخص کی پیروی کرتے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے اور جادو کرنے کے سبب سے اُس کی یہ کیفیت ہوئی ہے، تو یہاں سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہادیٔ برحق کے خلاف لوگ طرح طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں اور یہ لوگوں کی عادت رہی ہے اور ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے لیکن جو حق ہے، وہ حق ہے اور حق کو پہچاننا چاہئے اور لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کرنی چاہئے، یہ دیکھنا چاہئے کہ حق کیا ہے، حقیقت کیا ہے۔ باقی رہا سوال ہادیٔ برحق کی جسمانیت و بشریت کا، یہ تو خدا کی مصلحت کی چیز ہے۔ اگر مصلحت اِسی میں ہوتی کہ ہادیٔ برحق کی صرف نورانیت کو اُجاگر کیا جائے اور اُس کی جسمانیت کو سامنے نہ لایا جائے، تو یہ بھی خدا کے لئے ناممکن نہیں تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، انسانوں کے درمیان

ایک کامل انسان ہی ہدایت کا نمونہ پیش کرسکتا تھا اور یہ قانون ہے، قانونِ فطرت ہے کہ لوگوں کو اُن کی زبان میں اور اُن کے درمیان رہ کر آسمانی تعلیم دینے کے لئے اور ہدایت کا رستہ بتانے کے لئے پیغمبر اور امام کا۔۔۔اپنے اِس درس کو ختم کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کا اگر کوئی سوال ہو تو مہربانی کریں۔

سوال: امامؑ کے ہوتے ہوئے قرآن سے کیا ہدایت لیں یا زندہ قرآن یعنی قرآنِ ناطق کے ہوتے ہوئے ہم قرآنِ صامت کی طرف کیوں رُجوع کریں؟ میں خود آپ سے سوال کرتا ہوں، اِس کے لئے کوئی جواب۔

جواب: آپ عزیزوں نے سن لیا کہ سوال یہ ہوا تھا کہ قرآنِ ناطق کے ہوتے ہوئے قرآنِ صامت کی طرف کیوں رُجوع کرنا چاہئے؟ اِس پر اِنہوں نے کہا کہ قرآنِ ناطق اور قرآنِ صامت کے درمیان کوئی تضاد ہے نہیں، اگر اِن دونوں قرآنوں کے درمیان کوئی تضاد یا کوئی تصادم ہوتا، تو اُس صورت میں ہمیں انتخاب کا حق پہنچتا کسی ایک کو لیتے اور دوسرے کو نہیں لیتے۔ جب قرآنِ صامت اور قرآنِ ناطق ایک ہیں تو قرآنِ ناطق قرآنِ صامت کے لئے ہے، قرآنِ صامت قرآنِ ناطق کے لئے ہے۔ وہ کس طرح؟ کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ خدا نے فرمایا کہ اُس نے نور کو بھیجا ہے اور کتاب کو بھیجا ہے (۵:۱۵)۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ نور کی روشنی میں کتاب کو دیکھا جائے یعنی امامؑ کی روشنی میں قرآن کو سمجھا لیا جائے، تو اِس معنیٰ میں امام قرآن کے لئے ہے، یہ تو بات ہوگئی اور قرآن امام کے لئے کیسے ہے؟ قرآن امام کے لئے اِس لئے ہے کہ تنزیل پیغمبر کا معجزہ ہے اور تاویل امام کا معجزہ ہے، قرآن ہو اور امام اُس کی تاویل کرے تو امام کا معجزہ قرار پائے، اِس معنیٰ میں قرآن امام کے لئے ہے۔

دوسری مثال میں کوئی شخص جس قدر امام کو پہچانے اُس قدر قرآن پر روشنی پڑے اور جس قدر قرآن پر روشنی پڑے اُس قدر قرآن میں امام کی صفات اُجاگر ہو جائیں۔ اب اگر مان لیا جائے کہ دنیا میں علمُ القرآن کے جو خزانے، جیسے اسماعیلیوں کے پاس ہیں، وہ کسی کے پاس نہیں ہیں، خواہ یہ بات کتابوں سے ثبوت کی جائے، خواہ عملاً دیکھا جائے، خواہ رُوحانی طور پر دیکھا جائے، خواہ ظاہری طور پر دیکھا جائے، تو آج اسلام میں جتنے فرقے ہیں، اُن میں سے ایک اسماعیلی فرقہ ایسا ہے، باوجود اِس کے کہ لوگ اِس فرقے کی مذمّت کرتے ہیں، کہیں کافر بھی قرار دیتے ہیں، اِس کے باوجود علمِ قرآن کے جو خزانے اسماعیلیوں کے پاس ہیں وہ کسی دوسرے فرقے کے پاس نہیں ہیں۔ آخر اِس کی وجہ کیا؟ اِس کی وجہ امام ہیں کہ امام ہی قرآن کی روشنی ہیں اور امام کی معرفت کی روشنی میں قرآن کے خزانے مل جاتے ہیں۔ ہمارے بزرگانِ دین نے قرآن کے متعلق جو تاویلات کی ہیں یا اسرارِ قرآن کا جو ذخیرہ اسماعیلی کتب میں پایا جاتا ہے، وہ ذخیرہ کہیں بھی نہیں ہے۔ اِس کا سبب ظاہر ہے جیسا کہ میں نے کہا امام ہے اور امام کے رستے سے قرآن کے باطن میں اسماعیلی جاتے ہیں، لہٰذا ہم قرآن کو چھوڑ کے امام کو لیں، تنہا امام کو، نہ تنہا قرآن کو بلکہ دونوں کو۔ اِس لئے کہ رسولِ اکرمؐ

نے اپنے آخری وقت میں کیا وصیت کی تھی؟ ہر دانشمند باپ کی آخری وصیت بہت بڑی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کو یہ وصیت کی کہ حضورؐ اپنے پیچھے دو گران قدر چیزیں چھوڑ جا رہے ہیں، اُن میں سے ایک چیز قرآن ہے اور دوسری چیز اہلِ بیت میں سے امام ہیں اور یہ دونوں چیزیں قیامِ قیامت تک باہم وابستہ ہیں، دو بٹی ہوئی رسیوں کی طرح، یہاں تک کے دونوں رسیاں حوضِ کوثر پر اُتریں گی اور اگر کسی نے اِن دونوں کو باہم تمسّک کیا، تھامے رہا تو اُس کو گمراہ ہو جانے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ دیکھیں جیسے کوئی دانشمند طبیب یہ امکان دیکھتا ہے کہ کوئی بیماری آنے والی ہے اور اِس کے لئے کوئی نسخہ بتاتا ہے، دوا دیتا ہے، کہتا ہے کہ دیکھو یہ بیماری آنے والی ہے کل کو یا کچھ دن بعد تو اِس کے لئے تم اِس نسخے کو بنانا اور ایسی دوا کو استعمال کرنا تا کہ تم اُس مہلک بیماری سے بچے رہو گے۔ دیکھیں کہ کتنے سادے ہیں لوگ کہ جتنی تعریف کی جانی چاہئے تعریف کرتے ہیں، لیکن اِس تعریف میں وہ کمی کرتے ہیں کہ رسولؐ نے اپنے بعد کے لئے کچھ نہیں کیا، پھر گویا اِن کے نزدیک آنحضرتؐ صرف تیئیس برس کے لئے ذمّہ دار تھے اور جو دَورِ قیامت تک اُن کو دیا گیا تھا اُس کے لئے اُنہوں نے کچھ بندوبست نہیں کیا۔ ارے بابا! یہ تو بات ایک عام باپ پر بھی یہ ذمّہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے کچھ کہہ کے جائیں کہ اُن کو کیا کرنا چاہئے اور خاص کر ایسے باپ کو جس نے دعویٰ کیا ہو کہ وہ دانشمند باپ ہے، وہ اپنے بچوں کے اچھے باپ ہیں، وہ اُن کی پرورش کے لئے آئے ہیں، تو پرورش زندگی تک محدود نہیں ہے، تربیت اور ہدایت اُس کے بعد بھی اُس کے بچے ہیں اور بہت سے بچے ہیں جو زمانۂ نبوت میں مسلمان تھے وہ بہت تھوڑے تھے اور رسولؐ کے بعد جو دنیا میں مسلمان پیدا ہو گئے وہ بہت زیادہ ہیں، بے پناہ ہیں۔ کیا اِن ساروں کو نظر انداز کرنا تھا۔ خدا نے بھی کچھ نہیں کہا، رسولؐ نے بھی کچھ نہیں کیا، یہ کیا بات ہے اور پھر کن معنوں میں رحمتِ عالم ہو سکتے ہیں، یہ بات نہیں ہے۔ یہی صحیح ہے کہ رسولؐ نے اپنے بعد جانشین کا اہتمام کیا تھا اور وہ اِس سے ظاہر ہے جو فرمایا کہ میں اپنے بعد دو گران قدر چیزیں چھوڑ جاتا ہوں اور اِن دونوں سے تم وابستہ رہو گے تو کبھی بھی گمراہی کا امکان نہیں ہے۔

دیکھیں گمراہی ایک چھوٹا سا لفظ ہے، مگر دینی طور پر جتنی غلطیاں ہیں اور جتنا باطل کام ہے وہ سب اِسی لفظ میں آجاتا ہے۔ گمراہی کے کیا معنی ہیں؟ آپ سوچیں، گمراہی صراطِ مستقیم سے الگ ہو جانے کا نام ہے، کیا یہ صحیح نہیں ہے۔ گمراہی اسلام کو چھوڑ کر اسلام سے الگ ہو جانے کا نام ہے، گمراہی اسلامی ہدایت سے الگ ہو جانے کا نام ہے، تو بہت بڑا خطرہ تھا اور اِس کی پیش بندی یہی دو چیزیں تھیں، تو اِسی میں سب کچھ کہا گیا کہ تم اِن دو چیزوں سے وابستہ رہو اور کچھ حضرات کا یہ خیال ہے کہ کتابِ خدا اور سنّتِ نبوی، سنّتِ نبوی اور کتابِ خدا کس معنیٰ میں دو چیزیں ہو سکتی ہیں؟ سنّتِ نبوی کیا قرآن کی تشریح نہیں ہے۔ قرآن ایک اور قرآن کی تشریح دو چیزیں یہ کس طرح؟ قرآن اور معلمِ قرآن دو چیزیں ہیں یہ تو بہت عمدہ منطق ہے، یہ صحیح ہے اور ہر حالت میں قرآن کے معلّم کی ضرورت ہے۔ قرآن اور قرآن کی تشریح یعنی میرا مطلب ہے کہ اگر ہم

سنّت کو مانتے ہیں تو سنّت سے کیا مراد ہے؟ سنّت قرآن کی عملی تشریح، قرآن پر رسولؐ نے عمل کیا تو یہ قرآن کی عملی تشریح ہوگئی۔ کیا رسولؐ کی سنّت قرآن سے ہٹ کر کوئی دوسری چیز ہوسکتی ہے۔ نہیں، کیا رسولؐ کی سنّت خدا کی سنّت سے الگ کوئی چیز ہوسکتی ہے، نہیں۔ پھر کس طرح اِس حدیث کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ رسولؐ نے فرمایا خدا کی کتاب کو اور میری سنّت کو، حالانکہ سنّت سے اگر حدیثیں مراد ہیں تو وہ خود ہی کہتے ہیں کہ رسولؐ نے حدیثوں کے لکھنے سے منع کیا تھا اور حدیثیں تو رسولؐ کے بعد جمع کی گئیں اور سنّت رسول قرآن سے باہر کیا ہے، سنّت رسول تو قرآن کے اندر ہے اور اگر سنّت رسول ہے تو اُس کے جانشین میں وہ چیز متّحد ہے، معلم قرآن میں، اور اگر دو چیزوں کو لینا ہے تو حضرت ابوبکر کو کیوں لیا، اُن کے بموجب یہ نہ تو کتاب میں آسکتے ہیں، نہ سنّت میں آسکتے ہیں، اُن کے (explanation) کے مطابق، تو قرآن پر اور سنّت پر اکتفا کرنا چاہیئے تھا، جب شروع میں یہ بحث چھڑ گئی کہ رسولؐ دنیا سے رحلت کر گئے اب کیا کرنا چاہیے، اُس میں تو جانشینی اور خلافت کا تصور لیا، تو بہر حال یہ سمجھنے کے لئے اور اطمینان کے لئے ایک مزید تشریح تھی اور یہ صحیح ہے کہ آسمانی کتاب اور معلم کتاب دو چیزیں ہیں جو گران قدر چیزیں ہیں، دونوں کا آپس میں ہونا لازم و ملزوم ہے اور بہت ضروری ہے۔ لہٰذا آج الحمدللہ، اسماعیلی امام کو مانتے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ امام کی ذات میں قرآن ایک ہے، تاہم اگر ہم نے اپنے آپ کو سمجھانا ہے، اپنے بھائیوں کو سمجھانا ہے، دوسروں کو کچھ سمجھانا ہے، تو اِس کے لئے قرآن کا سمجھنا بہت عمدہ بات ہے کہ ہم تسلّی کریں کہ قرآن میں کیا ہے۔ قرآن میں اسماعیلیوں کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ سب اسماعیلیوں کا (favour) ہے اور امام کی تعریف ہے اور اِس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر حقیقت یہ ہے تو ہم کیوں نہ قرآن کو سمجھیں، تو اِسی کے ساتھ یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ابھی جماعت خانہ جانا چاہیئے۔

ٹرانسکرائب: امین رحمانی ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر